تذکرہ
سرفروشان
صوبہ سرحد

محمد شفیع صابر

یونیورسٹی بک ایجنسی
خیبر بازار - پشاور

تذکرۂ

سرفروشانِ سرحد

از

محمد شفیع صابرؔ

ایم۔ اے (انگلش)   ایم۔ اے (اُردو)

یونیورسٹی گولڈ میڈلسٹ، انجمن ترقی اُردو گولڈ میڈلسٹ

آنرز زبان پشتو، آنرز زبان پرشین

ناشر

یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور

نام کتاب :- ---------- سرفروشانِ سرحد

مؤلف : ---------- پروفیسر محمد شفیع صابر

کتابت : ---------- عبدالغفور گیلانی

مطبع : ---------- معظم پرنٹرز لاہور

بار اوّل : ---------- ۱۰۰۰

ناشر : ---------- یونیورسٹی بک ایجنسی۔ خیبر بازار، پشاور

مُندرجات

		صفحہ			صفحہ
۱	محمد خان ترین شہید	۱	۱۷	باٹڑے مُلّا صاحبؒ	۱۴۵
۲	بوستان خان ترین	۳۰	۱۸	فقیر صاحبؒ النگر	۱۵۳
۳	سردار غلام خان ترین	۳۱	۱۹	مُلّا پاوندہؒ	۱۶۱
۴	گدڑی شہزادہ	۳۷	۲۰	ملتان خان آفریدی	۱۶۷
۵	سیّد محمد حیان	۴۱	۲۱	سیّد علی عباس بخاری	۱۷۳
۶	ارباب فیض اللہ خان مہمند	۴۷	۲۲	غازی عبدالرحمٰن بے	۱۸۱
۷	سیّد احمد شہیدؒ	۵۱	۲۳	قاضی فضل قادر سیاہ پوش	۱۸۷
۸	شاہ اسمٰعیل شہیدؒ	۶۵	۲۴	شیخ دین محمدؒ	۱۹۳
۹	ارباب بہرام خان شہید	۷۱	۲۵	مولانا احمد گُل	۱۹۷
۱۰	غازی دلاسہ خان	۸۵	۲۶	مولانا عبدالرحیم پوپل زئی	۲۰۵
۱۱	سیّد اکبر شاہ	۹۳	۲۷	غازی عبدالقیوم شہید	۲۱۵
۱۲	شیر علی آفریدی	۱۰۹	۲۸	حاجی صاحب ترنگ زئیؒ	۲۲۱
۱۳	اخون صاحبؒ سوات	۱۱۵	۲۹	سنڈاکیے مُلّا صاحبؒ	۲۳۷
۱۴	نجم الدین ہڈہ مُلّا صاحبؒ	۱۲۵	۳۰	عمرا خان جندول	۲۴۳
۱۵	سرتور فقیرؒ	۱۳۷	۳۱	غازی عبدالرشید شہید	۲۵۱
۱۶	جان محمد شہید	۱۴۳	۳۲	سیلچیؒ	۲۵۷

		صفحہ
۳۳	مولانا عبدالرحیم محمد بشیر	۲۶۳
۳۴	حاجی جان محمد	۲۶۵
۳۵	میر دست خان آفریدی	۲۶۹
۳۶	مولانا محمد عرفان مانسہروی	۲۷۵
۳۷	چمنئی خان	۲۷۷
	شہدائے تحریک پاکستان	
۳۸	نواب خان شہید	۲۸۵
۳۹	محمد علی شہید	۲۸۵
۴۰	سیّد مبارک علی شاہ	۲۸۷
۴۱	محمد ظفر شہید	۲۸۸
۴۲	سیّد داؤد شاہ شہید	۲۸۹
۴۳	میجر یوسف خلیل شہید	۲۹۳
۴۴	مولانا سیف الرحمن	۲۹۷
۴۵	سیّد عبدالجبار شاہ	۳۰۷
۴۶	سیّد لال بادشاہ بخاری	۲۱۱
۴۷	حاجی محمد امین مجاہد	۳۱۵
۴۸	قاضی عبدالولی خاں	۳۱۷
۴۹	عجب خان آفریدی	۳۲۳
۵۰	حکیم عبدالرحیم بنوں	۳۳۳
۵۱	فقیر آف ایپی	۳۳۷
۵۲	موت کو کھیل سمجھنے والے	۳۴۳
۵۳	مولانا محمد اسحاق مانسہروی	۳۴۹
۵۴	پیر صاحب مانکی شریف	۳۵۵
۵۵	ملک عبدالغفار خان دیر	۳۵۹
۵۶	**پاک بھارت جنگ کے شہید**	۳۶۳
۵۷	میجر امان اللہ خان شہید	۳۷۰
۵۸	میجر خادم حسین شہید	۳۷۱
۵۹	میجر بشیر احمد خان شہید	۲۷۲
۶۰	کیپٹن عبدالجلیل شہید	۳۷۴
۶۱	کیپٹن ظہور الاسلام شہید	۳۷۵
۶۲	نیاز بادشاہ شہید	۳۷۶
۶۳	میجر فخر عالم شہید	۳۷۸
۶۴	میجر منیر خان ادرک زئی	۳۷۹
۶۵	بہرام خان جانی خیل	۳۸۰
۶۶	میجر شاہ بہرام خٹک	۳۸۰
۶۷	عظیم خان خٹک	۳۸۱
۶۸	رحیم بخش ناصر	۳۸۱
۶۹	فضل گل آفریدی	۳۸۲
۷۰	بیرسٹر محمد جان خان	۳۸۵
۷۱	شہزادہ فضل دین	۳۸۹
۷۲	غازی عبدالجلیل	۳۹۳
۷۳	محمد اکبر خان قریشی	۳۹۵

		صفحہ			صفحہ
۷۴	حضرت بادشاہ گل صاحب	۳۹۹	۷۷	خان عبدالغفار خاں	۴۱۱
۷۵	حکیم محمد اسلم سنجری	۴۰۳	۷۸	غازی آغا محمد	۴۱۹
۷۶	میاں بشیر احمد صدیقی	۴۰۷	۷۹	مولانا عزیز گل کاکاخیل	۴۲۱

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پیش لفظ

از پروفیسر ڈاکٹر محمد انور خاں صاحب، وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی

قوموں کو متحرک رکھنے کے لیے ان کے اسلاف کے کارنامے اور خاص کر وہ حقائق جن میں محبت، اخوّت، ایثار، عظمت اور دانائی کی بُو پائی جائے، اجاگر کرنا اشد ضروری ہوتا ہے۔

صوبہ سرحد نے اس ضمن میں ایسے سینکڑوں اصحاب پیدا کیے جنھوں نے دین اسلام، آزادیٔ وطن اور تحریکِ حصولِ پاکستان کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ محمد شفیع صابر صاحب اس موضوع پر پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور اب کے پھر اپنی کاوشوں کو کتابی شکل میں "سرفروشانِ سرحد" کے عنوان سے عوام کے سامنے لا رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ان کی یہ محنت موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر محمد انور خان

محمد خان ترین شہید

ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستانی سرفروشوں نے اپنے سے پانچ گنا بڑی بھارتی افواج کے جارحانہ عزائم کو ناکام بنا کر رکھ دیا تو دنیا بھر کے لوگوں نے عساکرِ پاکستان اور ان کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا۔

تاہم یہ تاریخی حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ترین اُس گھرانے کے جیالے فرزند تھے جس نے ہمیشہ میدانِ جنگ کو اپنے خون سے سینچا اور تاریخ کے اوراق پر درخشں نقوش چھوڑے۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کے بزرگوں میں سے تین عظیم نام محمد خان ترین، بوستان خان ترین اور غلام خان ترین کے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن دشمن کے آگے سر جھکانا قبول نہ کیا۔

ترین پٹھان یا پختون قوم کا ایک نامور قبیلہ ہے، ہزارہ کے علاوہ یہ قبیلہ بلوچستان اور وطنِ عزیز کے دوسرے مقامات میں بھی آباد ہے، بتایا جاتا ہے کہ دوسرے عسکری قبائل کی طرح یہ قبیلہ بھی سلطان محمود غزنوی، محمد غوری اور شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے ہمراہ جہاد کی نیت سے برصغیر میں وارد ہوا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

مغل شہنشاہوں نے ترین سرداروں کو اہم ذمہ داریاں تفویض کیں۔ چنانچہ

اسی دور میں شیر خان ترین اور حسین خان ترین نے اپنی شجاعت اور تدبّر کی بدولت خوب نام کمایا۔

جہاں تک ہری پور ہزارہ کے ترین قبیلہ کا تعلق ہے یہ لوگ سترھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے مورثِ اعلیٰ ہارون خان نے علاقہ چھچھ میں اپنے نام پر ہرون آباد کیا۔ کچھ مدت بعد اسی خانوادہ کے ایک فرد بوستان خان نے موضع دوی کی بنیاد رکھی۔ یہ اغلباً ۱۶۲۰ء کا واقعہ ہے۔ بعد ازاں ۱۶۵۸ء میں بوستان خان کے پوتے درویش خان نے درویش کا قصبہ بسایا اور اس کے بیٹے گدائی خان نے سرائے گدائی آباد کیا۔

"تاریخ صوبہ سرحد" کے مؤلف کی روایت ہے کہ پہلا ترین قائد جو قندھار سے آکر ہزارہ میں آباد ہوا، شیر خان تھا، جسے ۱۶۳۱ء میں شاہ جہان بادشاہ نے جاگیر عطا کی تھی اور ایک ہزار گھڑ سوار رکھنے کی اجازت دی تھی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں ترین قبیلے کا سربراہ ہمت خان تھا جس کے عہد میں ترین قبیلے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔

مغلوں بلکہ بعد میں درّانیوں اور سکھوں کے عہد تک ہزارہ ولایت کشمیر میں شامل تھا۔ اُن دنوں اسے ہزارہ قارلق کہا جاتا تھا۔ یہ نام ظاہر کرتا ہے کہ کسی زمانے میں اس پر قارلق ترک حکمران رہے تھے۔ اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہزارہ کا لفظ صرف زیریں ہزارہ کے لیے مستعمل تھا باقی علاقے مختلف ناموں مثلاً ولایت پکھلی، مُلک تناول، مُلک اگرور وغیرہ سے پکارے جاتے تھے۔

"تاریخ ہزارہ" کے مؤلف محمد ارشاد خان لکھتے ہیں:۔

"احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد ان علاقوں پر درّانیوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ ۵۲-۱۷۵۰ء کے درمیانی عرصہ میں احمد شاہ ابدالی نے ہزارہ، پکھلی سرکار اور کشمیر پر قبضہ کرلیا۔ درّانیوں کو ان علاقوں سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ شاہراہ کشمیر اس علاقے سے ہوکر گزرتی تھی۔ انھوں نے پکھلی سرکار (موجودہ مانسہرہ کا ضلع) کو کشمیر کے ساتھ ملحق کردیا اور پرگنہ ہزارہ قارلق کو اٹک کے ساتھ، یہاں براہِ راست حکومت کرنے کے بجائے درّانیوں نے مقامی با اثر خوانین ہی کے ذریعے حکومت کا کاروبار چلانا مناسب سمجھا — جن میں نجیب اللہ خان ترین، زبردست خان المعروف صوبہ خان تنولی اور سعادت خان آف گڑھی حبیب اللہ کے نام قابلِ ذکر ہیں"۔

چونکہ ان دنوں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی، اس لیے ہر قبیلہ آئے دن دوسرے قبیلے سے برسرِ پیکار رہتا تھا اور جس کا بس چلتا دوسرے کا علاقہ بزور دبا لیتا تھا۔ ۷۵-۱۶۷۴ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر سرحدی مہمات کے سلسلے میں حسن ابدال میں مقیم تھا گوجر سردار دولت بیگ اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور شہنشاہ کی توجہ ان زیادتیوں کی طرف دلائی۔ اتفاق سے اس وقت صالح محمد خان دلازاک بھی وہاں موجود تھا، اس نے جھٹ ثالثی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں جسے نادانی سے گوجروں نے بھی تسلیم کرلیا۔ ہزارہ قارلق میں ان دنوں کل چوراسی ۸۴ دیہات تھے، انھیں چار حصوں (پٹیوں) میں تقسیم کردیا گیا اور ترک، دلازاک، گوجر اور ترین ہر ایک کو اکیس اکیس ۲۱ دیہات مل گئے۔

پٹی ترین کا مرکزی مقام درویش تھا اور اس میں سرائے گدائی، درویش

چھوہر، تلوکر، ریحانہ، ملک یار، پانڈک، سکندرپور، عالم، میلم، پنیاں، ڈیڈر بھوٹرڑی، گھیلا، بڑی کاہل، پہاڑد، موٹا، بھیرہ، کوٹھا، پنڈپرانی وغیرہ شامل تھے۔ ہر پٹی پر سالانہ لگان مقرر کیا گیا جو اٹک کے قلعدار کو واجب الادا تھا۔

سردار نجیب اللہ خان ترین ایک مدبّر اور دلیر حکمران تھا۔ اردگرد کے لوگ اس سے دبنتے تھے۔ وہ سیر و شکار کا شوقین تھا چنانچہ اس نے انتظامی امور اپنے مختار مشرف مقدم (گوجر) کو سونپ رکھے تھے۔ نجیب اللہ خان نے ترین قوم کو منظم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۷۹۹ء میں اس کی وفات کے وقت اس کا بیٹا محمد خان بہت کم سن رہ گیا۔ خدشہ تھا کہ اس عالم میں اس خاندان کا تسلط قائم نہ رہ سکے گا لیکن سردار نجیب اللہ خان کی بیوہ محمدی بیگم (یا بی بیگم) بڑی معاملہ فہم اور مدبّر خاتون تھی، اس نے مشرف مقدم کے ذریعے علاقے پر اپنا دبدبہ قائم رکھا اور سکھوں کی آمد تک سارے علاقہ میں امن و امان اور نظم و نسق احسن طریق سے قائم رکھا۔

دُرّانی حکمران تیمور شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس سے ان لوگوں کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو کر رہ گئی۔

اُنہی دنوں کی بات ہے کہ اٹک کے کاردار نے حاجی دہاب نامی ایک کارندے (بعض روایات میں اسے قاضی صاحب چھچھ بھی لکھا گیا ہے) کو سالانہ لگان کی وصولی کے لیے ہزارہ بھیجا۔ اس نے سارے علاقے کے خوانین اور سرکردہ افراد کو سکندرپور بلایا (ان دنوں ہری پور ابھی آباد نہ ہوا تھا) اور ان سے مالیہ طلب کیا، سبھی لوگ اجلاس میں شریک ہوئے، ان میں سردار محمد خان ترین بھی تھا جو نیا نیا قبیلے کا سربراہ بنا تھا۔

دورانِ گفتگو حاجی وہاب اور محمد خان ترین میں کچھ باتوں پر اختلاف رائے ہو گیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے گاؤں درویش آیا اور اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر موضع گلدھیری (نزد ریحانہ) چلا گیا۔

حاجی وہاب کے ساتھ تین سو سوار اور پیادہ فوج بھی تھی، اسے سرکاری افسر ہونے کا زعم بھی تھا، وہ غصہ سے بھرا ہوا موضع درویش آیا۔ محمد خان کے گھر کو آگ لگا دی، کچھ اور مکان گرا دیے اور ان سے حاصل ہونے والی لکڑی جلانے کے لیے ساتھ لے گیا۔ محمد خان ترین یہ کب برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی اس کا گھر جلا دے۔ اس نے ارد گرد کے خوانین اور لوگوں کو جمع کیا اور صبح سویرے ہی حاجی وہاب کے خیموں کو گھیر لیا۔ حاجی وہاب ابھی بیدار بھی نہ ہوا تھا، شور سن کر اٹھا، ہتھیار لگائے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا، تاہم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ لڑتے لڑتے مارا گیا، باقی سپاہی اٹک کے قلعہ کی طرف بھاگ نکلے، محمد خان اور اس کے ساتھیوں نے دور تک ان کا تعاقب کیا اور حاجی وہاب کا سب سامان، خیمے، گھوڑے اسلحہ اور نقدی لوٹ لی۔

بدقسمتی سے ۱۸۱۸ء میں ایک اور منحوس سانحہ ہوا جس کی بناء پر سکھوں کو ہزارہ کے معاملات میں دخل دینے کا موقع مل گیا۔ ہوا یہ کہ مانگرائے کے ترک سردار ہاشم خان نے ایک دوسرے رئیس کمال الدین خان کو ذاتی عداوت کی بناء پر قتل کر دیا، چونکہ کمال خان مقتول کے ورثاء میں ہاشم خان سے انتقام لینے کی طاقت نہ تھی، اس لیے اس نے اس معاملے میں محمد خان ترین سے مدد چاہی۔ مقتول کمال خان یوں بھی محمد خان ترین کا دوست اور حلیف تھا۔ محمد خان نے ہاشم خان سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ ادھر ہاشم خان کو محمد خان ترین کے ارادے

کا علم ہوا تو گھر بار چھوڑ کر بھاگ نکلا، اس نے گرد و نواح کے ہر قبیلے سے امداد چاہی لیکن محمد خان ترین کے خلاف کوئی قبیلہ بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔ مجبوراً ہاشم خان روتا پیٹتا سرائے کالا (ٹیکسلا) کے سکھ فوجدار مکھن سنگھ کے پاس پہنچا، سکھ سردار تو پہلے ہی ہزارہ پر قبضہ کرنے کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے، فوراً ہاشم خان کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۱۹ء کو مکھن سنگھ راولپنڈی کے سکھ صوبیدار جیون سنگھ سے اجازت لے کر پانچ سو سواروں اور توپ خانہ کے ہمراہ ہزارہ کو چل دیا۔ خانپور سے ہوتا ہوا وہ آگے بڑھا اور محمد خان کے مسکن واقع گلڈھیری کو جلا کر راکھ کر دیا۔ بزعم خود اپنا مشن پورا کرنے کے بعد وہ خود تو واپس چلا گیا۔ البتہ موضع شاہ محمد کے مقام پر ایک گڑھی (قلعہ) تعمیر کر کے کچھ فوج وہاں تعیّن کر دی اور بخشی جھنگ راج کو لوگوں سے مالیہ کی وصولی کا کام تفویض کر دیا۔ لوگ کچھ عرصہ تو مالیہ ادا کرتے رہے لیکن بعد میں انھوں نے سکھ راج ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مالیہ دینے سے ہاتھ روک لیا۔

اس وقت تک مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چھچھ کا علاقہ بھی فتح کر لیا تھا اور قلعہ اٹک پر بھی اس کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کو خاطر میں کب لاتا تھا۔ چنانچہ اس نے مکھن سنگھ کو دوبارہ ایک لشکر دے کر ہزارہ بھیج دیا اور تاکید کی کہ مالیہ کی رقم ہر قیمت پر وصول کی جائے۔ مکھن سنگھ چھوٹتے ہی گلڈھیری کی طرف بڑھا اور محمد خان ترین سے مالیہ کی رقم طلب کی۔ سردار محمد خان رعب میں آنے والا کہاں تھا۔ اس نے مالیہ دینے سے انکار کر دیا اور سر دھڑ کی بازی لگا کر مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اردگرد کے مسلمان سردار بھی اس جہاد میں محمد خان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اردگرد

کے مجاہدین جوش وخروش سے آگے بڑھے اور موضع شاہ محمد پہنچ کر انھوں نے مکھن سنگھ کے لشکر کو گھیرے میں لے لیا۔ سکھ سورما بھی انتہائی بہادری سے لڑے لیکن مسلمان مجاہدوں کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ خود مکھن سنگھ بھی اپنے بہت سے سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا۔ میدان محمد خان ترین کے ہاتھ رہا چنانچہ اس کے حکم سے گڑھی گرا دی گئی۔ سکھ لشکر کے بچے کھچے سپاہی ایسے بھاگے کہ اٹک کے قلعہ ہی میں جا کر دم لیا۔

مکھن سنگھ کی اس شکست کا بدلہ لینے کی خاطر سکھ فوجدار سردار حکما سنگھ بھاری فوج لے کر قلعہ اٹک سے روانہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ اب کے وہ ضلع ہزارہ کے قبائل کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور ان سے تاوانِ جنگ اور مالیہ کی رقوم وصول کر کے رہے گا لیکن سردار محمد خان ترین کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ دریائے ہرو کے کنارے موہڑا اور سلطان پور کے دیہات کے پاس اس کا مقابلہ سردار محمد خان اور اس کے جانبازوں سے ہوا۔ مسلمان ایسی بہادری اور بے جگری سے لڑے کہ انھوں نے سکھوں کی انتہائی تربیت یافتہ فوج کا منہ موڑ دیا۔ کافی نقصان اٹھانے کے بعد سکھ لشکر بے نیل ومرام قلعہ اٹک کو لوٹ گیا۔

جب حکما سنگھ کی شکست کی یہ خبر لاہور کے سکھ دربار میں پہنچی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ سخت برافروختہ ہوا۔ اب کے اس نے پہلے سے بھی بہت بڑا لشکر اور توپ خانہ دے کر کرنل الٰہی بخش اور دیوان رام دیال کو ہزارہ بھیجا۔ اور اسے تاکید کی کہ ہر قیمت پر اہل ہزارہ سے مالیہ وصول کیا جائے۔

یہ واقعہ ۱۸۲۰ء کا ہے، اس بار سکھ لشکر اتنا قوی اور اس درجہ مسلح تھا کہ اسے دیکھتے ہی دلوں پر ہیبت چھا جاتی تھی، دیوان رام دیال نے ہزارہ

کے میدانی دیہات سے فوری طور پر مالیہ کی وصولی شروع کر دی، لوگ مجبوراً اسے مالیہ ادا کرنے لگے تاہم ترین سردار محمد خان کسی قیمت پر سکھوں کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا، سکھوں کے پاس بہت بڑا توپ خانہ تھا، اس لیے میدانی علاقے میں ان کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ اس امر کے پیش نظر محمد خان ترین اپنے جانبازوں کو لے کر گندگڑ پہاڑ میں سری کوٹ چلا گیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے حریت پسند مسلمان بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔ سکھ لشکر ان کے تعاقب میں سری کوٹ پہنچا اور مجاہدین کو للکارا۔ مجاہدین بھی سر پر کفن باندھ کر میدان میں کود پڑے۔ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ صبح سے شام تک سکھوں کا توپ خانہ آگ برساتا رہا لیکن فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہونے پایا۔ شام کو جب سکھ لشکر تھک ہار کر اپنے خیموں میں آرام کرنے لگا تو سردار محمد خان ترین اور اس کے مجاہد اپنی پہاڑی کمین گاہوں سے نکل کر سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ مجاہدین کا یہ حملہ اتنا اچانک اور زوردار تھا کہ سکھوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھگدڑ مچی کہ کسی کو سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ دیوان رام دیال نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن بالآخر لڑتے لڑتے مارا گیا۔ (اس کی سمادھ کچھ عرصہ پہلے تک کھلابٹ میں موجود تھی، اب تربیلا ڈیم کی تعمیر کے باعث یہ علاقہ زیر آب آگیا ہے)۔

سردار محمد خان ترین فتح کے پھریرے لہراتا واپس پہنچا۔ سارے میدانی علاقے ایک بار پھر سکھوں کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ اس معرکہ میں سید خانی، مشوانی اور اتمان زئی لوگوں نے بھی بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔

جب سکھ لشکر کی ناکامی اور پسپائی کی خبر مہاراجہ رنجیت سنگھ تک پہنچی تو دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ ہر قیمت پر ہزارہ کی تسخیر کا عزم کر چکا تھا

اس لیے ایک بار پھر اس نے بہت بڑا لشکر ترتیب دیا اور سردار امر سنگھ مجیٹھا کی قیادت میں اسے ہزارہ بھیجا۔

سردار امر سنگھ مجیٹھا نہ صرف ایک جہاندیدہ جنگجو تھا بلکہ سیاست کے داؤ پیچ کا ماہر بھی خیال کیا جاتا تھا چنانچہ وہ براہ راست مقابلہ کرنے کی بجائے سیاسی حربوں سے کام لینا چاہتا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں کوٹ نجیب اللہ پہنچ کر اس نے ہزارہ کے سرکردہ لوگوں کو بلا بھیجا۔ اس کی چرب زبانی کی وجہ سے کئی لوگ رام ہو گئے اور مالیہ ادا کر دیا۔ وہ سردار محمد خان ترین سے بھی صلح صفائی کرنا چاہتا تھا اور ملاقات کا خواہاں تھا۔ لیکن محمد خان ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ وہ گول مول جواب دیتا رہا تاکہ سکھ لشکر طیش میں آکر لڑائی نہ چھیڑ دے۔

چونکہ سکھوں کے خلاف لڑائیوں میں بالائی ہزارہ کے کئی قبیلوں نے بھی محمد خان ترین کا ساتھ دیا تھا اس لیے سردار امر سنگھ انھیں بھی سبق سکھانا چاہتا تھا، چنانچہ رام دیال کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے وہ ناڑہ کے علاقے پر چڑھ دوڑا۔ ان دنوں قبیلہ کڑریال کا رئیس حسن علی خان تھا جو بڑا دلیر اور مدبر انسان تھا۔ اس نے ڈھونڈ (عباسی) قبیلہ کے ساتھ مل کر لشکر جمع کیا اور سکھوں کے مقابل ڈٹ گیا۔ سکھوں کی طاقت بہت زیادہ تھی اس لیے سردار حسن علی خان اور اس کے جاں نثار ساتھی اس سے کھلم کھلا لڑائی مول لینے سے ہچکچاتے تھے، البتہ وہ اپنے پہاڑی مورچوں میں ڈٹے رہے۔ جب کبھی موقع پاتے سکھ لشکر پر ٹوٹ پڑتے اور اسے نقصان پہنچا کر پھر اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے۔ صوبہ سرحد کے لوگوں کا کہنا ہے۔ "پہاڑ ہمارے قلعے ہیں"۔ پہاڑی علاقوں میں سرحدی جانبازوں اور

سرفروشوں کا مقابلہ کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔

ادھر سکھوں کی یہ کیفیت تھی کہ کسی گاؤں پر ٹوٹ پڑتے، بڑے اطمینان سے اُسے لُوٹتے اور جو سامان ہاتھ لگتا اپنے خیموں میں پہنچا دیتے، انھیں اپنی تعداد اور اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا۔ ایک رات جب سکھ سپاہی اپنے اپنے خیموں میں نیند کے مزے لے رہے تھے مسلمان مجاہد سردار حسن علی خان کی قیادت میں اچانک ان پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ ایسا ناگہانی تھا کہ سکھ لشکر کو تیاری کا موقع ہی نہ مل سکا۔ سردار امر سنگھ چند دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ گاؤں کے ایک مکان میں سو رہا تھا کہ مجاہدین نے مکان کو گھیرے میں لے لیا اور کلہاڑیوں سے گھر کے دروازے توڑ دیے۔ یہ حال دیکھ کر سردار امر سنگھ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ہتھیار سنبھال کر باہر نکلا۔ تاہم اس کی کچھ پیش نہ گئی اور نہ صرف وہ خود مارا گیا بلکہ اس کا بھائی ہری سنگھ اور سکھ سپاہیوں کی بڑی تعداد کو بھی مسلمان مجاہدین نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ واقعہ سمندر کٹھ کے کنارے ہوا جو دریائے ہرو کا ایک معاون پہاڑی نالہ ہے۔

ادھر لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سکھ لشکر کی اس تازہ شکست اور ناکامی کا حال معلوم ہوا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے چاہا کہ خود ہزارہ کا رخ کرے لیکن وہ کنور شیر سنگھ اور رانی سدا کور کی "محلاتی سازشوں" میں بری طرح الجھا ہوا تھا، بالآخر اس نے کرنل الٰہی بخش کو بہت بڑا لشکر اور توپ خانہ دے کر اس مہم کو سر کرنے کے لیے بھیجا۔ کرنل الٰہی بخش بزعم خود بڑا ہشیار اور گھاگ تھا، اس نے ہزارہ پر حملے کے لیے خان پور یا حسن ابدال کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے حضرو سے ہو کر تربیلا پہنچنے کی سکیم بنائی۔ تربیلا پہنچ کر اس نے وہاں ایک قلعے کی تعمیر کا حکم دیا تاکہ کافی فوج وہاں رکھ

سکے جو بوقت ضرورت کام آئے۔ اس کا ارادہ تھا کہ چاروں طرف حفاظتی چوکیاں قائم کرنے کے بعد محمد خان ترین سے دُو دُو ہاتھ کرے لیکن اس موقع پر سردار محمد خان ترین نے بھی اچھی حکمتِ عملی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کرنیل الٰہی بخش کو یقین دلایا کہ وہ مسلمان سالار کے خلاف لڑائی کرنے کو تیار نہ تھا۔ دو مسلمانوں کے مابین صلح و صفائی ہی بہتر رہے گی۔ کرنیل الٰہی بخش نے بھی سردار محمد خان کی اس زبانی اطاعت ہی کو مناسب سمجھا اور مزید کسی فوجی کارروائی کی ضرورت نہ سمجھی۔ تاہم اس کے جاتے ہی ہزارہ کے حریت پسند قبائل پھر خود مختار ہو گئے اور اپنے اپنے علاقہ میں من مانی کرنے لگے۔

اب تو مہاراجہ رنجیت سنگھ اور بھی سٹپٹایا، اس نے سردار مکھن سنگھ سردار رام سنگھ، دیوان رام دیال اور کرنیل الٰہی بخش جیسے تجربہ کار اور مشاق جرنیلوں کو ہزاروں سپاہیوں اور توپ خانے کے ساتھ ہزارہ بھیج کر ان کا انجام دیکھ لیا تھا، اب وہ جنگ کی بجائے صلح کا راستہ اختیار کرنے پر اتر آیا تھا، چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کنور (شہزادہ) شیر سنگھ اور مہارانی سدا کور کو بہت سی فوج دے کر ہزارہ بھیجا اور انھیں نصیحت کی کہ جیسے بھی ہو محمد خان ترین سے دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اس موقع پر رانی سدا کور نے فی الواقع بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس نے ترین سردار محمد خان کو بہت سے تحفے تحائف بھیج کر ملاقات کے لیے بلایا۔ محمد خان کے آنے پر مہارانی نے اس کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اسے انعام و اکرام سے نوازا اور اپنا "منہ بولا بیٹا" (متبنّیٰ) بنا لیا۔ مہارانی پیار سے محمد خان کو "شیر بچہ" کہا کرتی تھی اور اس کے متبنّیٰ بنانے کی رسم بھی اس نے بڑی دھوم دھام سے ادا کی۔

اس واقعہ کے تھوڑا عرصہ بعد تک، تو اہل ہزارہ کچھ خاموش رہے لیکن کچھ عرصہ بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ صورتِ حال پہلے سے بھی خراب تر ہو گئی اور سارا علاقہ جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ بات یہ ہوئی کہ کافی عرصہ تک دیوان موتی رام کنجاہی سکھ دربار کی طرف سے کشمیر کا گورنر تھا، بعد میں سردار ہری سنگھ نلوہ کو اس کی جگہ کشمیر کی گورنری سونپ دی گئی، نلوہ کو کشمیر میں چارج سنبھالے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کسی فوجی مہم کے سلسلے میں اس کی خدمات کی ضرورت پیش آگئی، اس نے اُسے جلد لاہور پہنچنے کا لکھا۔ چونکہ ان دنوں برفباری کی وجہ سے جموّں کے راستے لاہور پہنچنا ناممکن تھا اس لیے ہری سنگھ کو مظفر آباد، پکھلی اور ہزارہ کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ سردار محمد خان ترین کو ہری سنگھ نلوہ کی آمد کا پتہ چلا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو لے کر سکھ جرنیل کا راستہ روکا۔ ہری سنگھ کو لاہور پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے وہ لڑائی سے بچنے کی کوشش کرتا رہا بلکہ اس پر بھی تیار ہوگیا کہ کچھ دے دلا کر ہزارہ کے سرفروشوں کو لڑائی چھیڑنے سے باز رکھے لیکن اہلِ ہزارہ اس پر رضامند نہ ہوئے۔ بالآخر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ ہری سنگھ نلوہ کے ساتھ اس وقت سات ہزار سپاہی تھے جو اسلحہ جنگ اور تربیت کے اعتبار سے اس دور کے بہترین لڑاکا تھے۔ عددی لحاظ سے بھی انھیں مسلم مجاہدین پر برتری حاصل تھی۔ اگرچہ مجاہدین بڑی بے جگری سے لڑے لیکن سکھوں پر غلبہ نہ پا سکے۔ سینکڑوں مسلمان شہید ہوئے اور سینکڑوں زخمی۔ یہ لڑائی علاقہ جدون میں مانگل کے مقام پر ہوئی۔ آخر کار قبیلہ جدون نے تاوانِ جنگ ادا کر سکھوں سے صلح کر لی۔ اس کامیابی کے بعد ہری سنگھ نلوہ کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس نے نواں شہر کے مقام پر اپنا قلعہ بنایا۔ چھاؤنی قائم کی اور ہزاروں سپاہیوں

کو وہاں متعین کر دیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ تو دل سے چاہتا تھا کہ ہزارہ کے بہادر حریت پسندوں کو اپنے زیر نگیں لائے۔ اسے ہری سنگھ نلوہ کی اس کامیابی پر بڑی خوشی ہوئی۔ چنانچہ اس نے ہری سنگھ نلوہ کو کشمیر کی صوبہ داری کے ساتھ ساتھ ہزارہ کی صوبہ داری بھی تفویض کر دی۔

لاہور سے تقرری کا پروانہ حاصل کر کے ۱۸۲۲ء کو سردار ہری سنگھ نلوہ ہزارہ پہنچا اور اس نے علاقہ ترین میں ہر کشن گڑھ کے نام سے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ رفتہ رفتہ قلعہ کے ارد گرد شہر آباد ہوتا گیا جو آگے چل کر ہری پور کہلایا۔ ہری سنگھ نلوہ نے یہ سارے جتن کیے لیکن سردار محمد خان ترین پھر بھی اس کے قابو نہ آسکا۔ ہری سنگھ نلوہ کے آتے ہی وہ اپنے ساز و سامان، لاؤ لشکر اور اہل و عیال کے ساتھ میدانی علاقے کو چھوڑ کر سری کوٹ چلا گیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے آزادی پسند مسلمان سردار بھی اپنے گھر بار چھوڑ کر محمد خان ترین سے جا ملے اور اس طرح سری کوٹ مسلمان مجاہدوں کا ایک مضبوط گڑھ بن گیا۔

۱۸۲۳ء میں سردار ہری سنگھ نلوہ نے ان مسلمان غازیوں کی سرکوبی کے لیے سری کوٹ کا رخ کیا۔ نارہ کے مقام پر ایک بار پھر حق و باطل کا زبردست معرکہ ہوا۔ مسلمان حریت پسند اسلامی جذبۂ جہاد سے سرشار سر پر کفن باندھ کر میدان میں اترے اور دشمن کا منہ پھیر دیا۔ سکھ جرنیل کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی۔ اور اس کے پانچ سو ساتھی کام آئے۔ کافی عرصہ تک سکھ اپنے زخموں کو سہلاتے رہے اور ہری سنگھ نلوہ کی سرگرمیاں بھی ہری پور کے قلعے کی چار دیواری تک محدود رہیں۔ اسے باہر نکل کر مسلمان سرداروں سے ٹکر لینے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ناڑہ کے معرکہ میں ہری سنگھ نلوہ کی شکست کا سُن کر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بذاتِ خود ہزارہ کا رُخ کیا، اس کے ساتھ ایک لشکرِ جرّار اور بھاری توپ خانہ بھی تھا۔

پہلے پہل سکھ مہاراجہ نے لڑائی کی بجائے سیاسی چالبازیوں ہی سے کام لینا بہتر سمجھا۔ اس نے سری کوٹ کے پاس پہنچ کر ایک دربار لگایا اور تمام مسلمان سرداروں کو اس میں شرکت کے لیے بلا بھیجا۔ اس وقت قریباً سبھی مسلمان زعماء سری کوٹ میں مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔ سردار محمد خان ترین سربلند خان تنولی اور شاہ محمد خان رئیس مشوانی سکھ مہاراجہ کی دعوت پر دربار میں شریک ہوئے۔ مہاراجہ نے سردار محمد خان اور اس کے ساتھیوں کی بڑی قدر و منزلت کی۔ چونکہ مہاراجہ کو ایک فوجی مہم کے سلسلے میں جلد پشاور پہنچنا تھا، اس لیے سری کوٹ میں صرف تین دن گزار کر وہ رخصت ہونے لگا تو محمد خان ترین اور ہری سنگھ نلوہ کو بھی ساتھ لے گیا تاکہ جیسے بھی ہو دونوں میں صلح صفائی عمل میں آسکے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سردار محمد خان کو بیس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر دئے جانے کا حکم بھی جاری کیا۔ تاہم سکھ حکومت میں چونکہ ہر سردار اپنی من مانی کرنے کا عادی تھا اور ہر ایک اپنا گھر بھرنے لگا تھا، اس لیے سردار ہری سنگھ نلوہ نے ہزارہ پہنچنے پر محمد خان ترین کو صرف دو ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر پر ٹالنا چاہا لیکن ترین سردار نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔

اس بار مہاراجہ رنجیت سنگھ سری کوٹ آیا تو وہاں ایک قلعہ تعمیر کرنے اور اس میں پانچ سو سکھ سپاہی متعین کرنے کا بھی حکم دیا۔ یہ سب چالیں سردار محمد خان اور اس کے جانباز ساتھیوں کو مرعوب کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔ بظاہر

یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی کہ سکھ فوج اپنے وقت میں برصغیر کی سب سے زیادہ منظم اور بہترین تربیت یافتہ تھی۔ اسے یورپی جرنیلوں نے تربیت دی تھی اور اس کے پاس بہترین اور جدید ترین اسلحہ بھی تھا تاہم وہ مسلمان مجاہدین کا سامنا کرنے سے سخت گھبراتی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ سردار محمد خان ترین جیسے عظیم مجاہدوں نے اپنے حُسنِ عمل سے مسلمانوں کے دلوں میں شوقِ شہادت کا وہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ٹکر لینے سے نہیں ڈرتے تھے، ان کی نظریں ظاہری اسباب کی بجائے اپنے خالقِ حقیقی کی تائید و نصرت پر لگی رہتی تھیں، اسی لیے وہ کسی حال میں بھی اہلِ کفر سے دبتے نہ تھے۔

سردار ہری سنگھ نلوہ ۱۸۲۲ء سے ۱۸۳۷ء تک ہزارہ کا گورنر رہا تاہم اس دوران اسے کئی بار فوجی مہمات کے سلسلے میں باہر بھی جانا پڑا۔ ۱۸۲۳ء میں ایک بار اسے ڈیرہ جات کی فوجی مہم پر بھیج دیا گیا تو اس کے پیٹھ پھیرتے ہی سارے ہزارہ میں سکھوں کے خلاف جدوجہد پھر زور پکڑ گئی۔ قریب قریب ہر قبیلے نے سکھوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا حالانکہ ہری سنگھ نلوہ جاتے وقت اپنے بیٹے گوردت سنگھ اور اپنے خسر ہرسا سنگھ اکالی کو دو سو سواروں اور پانچ سو پیادہ سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ ہری پور کے قلعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ سکھ فوج کا دائرۂ اختیار صرف قلعے اور شہر تک محدود تھا، شہر سے باہر عملاً سردار محمد خان ہی کی حکومت تھی اور اہلِ ایمان اس کے ایک اشارے پر جانیں لڑانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چنانچہ ایک بار سردار گوردت سنگھ نے موضع درویش سے شیشم کا ایک بہت بڑا درخت کٹوا دیا۔ خان محمد خان ترین نے اس بات کو بُرا منایا اور اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو ساتھ لے کر ہری پور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب گوردت سنگھ مسلمان مجاہدوں

کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گیا تو اس نے سکھ دربار سے کمک طلب کی۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ایک نہایت ہی آزمودہ کار اور با اعتماد جرنیل سردار بدھ سنگھ سندھیانوالہ کو بہت بڑی فوج دے کر ہزارہ بھیجا۔ کسی ناگزیر وجہ سے سردار بدھ سنگھ کے ہزارہ پہنچنے میں بہت تاخیر ہو گئی تو مسلمان سرفروشوں کی بن آئی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تنولی قوم نے قلعۂ دربند کو اور سواتی جانبازوں نے شنکیاری کے قلعے کو سکھوں کے تسلّط سے آزاد کرا لیا۔ انھوں نے نہ صرف بہت سے سکھ سپاہیوں کو بلکہ مالدار ہندو سکھ سیٹھوں کو بھی حراست میں لے لیا۔ تنولی اور سواتی مجاہدوں کی کامیابی کو دیکھ کر جدون لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے نواں شہر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن اس قلعے میں چونکہ سکھوں نے بڑی بڑی توپیں نصب کر رکھی تھیں، اس لیے ان جانبازوں کو کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کے باوجود انھوں نے کمال استقامت سے قلعے کا محاصرہ جاری رکھا۔

یہ حال دیکھ کر سکھ حکمرانوں کا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے پہلے تو ہرسا سنگھ اکالی کو اور پھر سردار مہاں سنگھ کو کثیر لشکر اور توپیں دے کر بھیجا۔ انھوں نے نواں شہر پہنچتے ہی جدون قوم کے مورچوں پر شدید گولہ باری کی اور پھر اسی پر بس نہ کی بلکہ ایک جگہ دو سو (۲۰۰) مسلمانوں کو جو نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے جامع مسجد میں جمع تھے، گھیرے میں لے لیا، سکھوں نے مسجد کو آگ لگا دی جس سے بہت سے مسلمان مسجد کے اندر ہی جل کر راکھ ہو گئے۔ جو جان بچانے کے لیے باہر نکلا اسے سکھوں نے اپنی تلواروں پر لے لیا اور اس طرح ایک ایک کر کے سارے نمازی شہید کر دیے گئے۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر جدون اپنے بال بچوں سمیت شہر کو خالی کر کے اپنی پہاڑی کمین گاہوں میں چلے گئے۔ ان

کی غیر حاضری میں سکھ فوجیوں نے ان کے گھروں کو لوٹا اور لوٹنے کے بعد آگ لگادی۔

انہی دنوں لاہور سے سردار بدھ سنگھ کی کمان میں بھیجا جانے والا سکھ لشکر بھی ہری پور پہنچ گیا۔ سردار بدھ سنگھ چونکہ سردار محمد خان ترین کی طاقت اور رسوخ سے خائف تھا اس لیے اس نے ترین سردار کو تحفے تحائف بھیجے اور ساتھ ہی یقین دلایا کہ وہ صرف پکھلی کی سکھ فوج کو کمک پہنچانے آیا تھا۔ محمد خان نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔

ایک طرف سے سردار بدھ سنگھ اپنے لاؤ لشکر سمیت نواں شہر کی طرف بڑھا، دوسری طرف سے حاکم کشمیر سردار ہری سنگھ بھی کثیر تعداد میں فوج لے کر آگیا۔ نواں شہر میں اُن دونوں سکھ فوجیوں کی پگڑیاں ہی پگڑیاں نظر آتی تھیں۔ اس متحدہ لشکر نے نواں شہر اور گردو نواح کے مسلمانوں پر وہ مظالم ڈھائے کہ خدا کی پناہ! — جب وہاں دل کی بھڑاس نکال چکے تو شنکیاری میں مسلمان مجاہدوں سے ٹکر لی۔ مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی اس لیے شنکیاری کے قلعہ پر دوبارہ سکھوں کا قبضہ ہوگیا۔ سردار بدھ سنگھ نے مانسہرہ میں بھی ایک قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ کچھ دن گزرے تھے کہ سکھ لشکر نے رات کو اچانک اگرور کے قصبہ پر حملہ کر دیا، مسلمان بے خبری ہی میں مارے گئے۔ دوسرے دن سکھ فوج اگرور سے کوچ کر کے نگڑی، تیسرے روز علاقہ حاجی میرا کے گاؤں بدھاڑ، چوتھے روز بگھاڑہ اور پانچویں روز میدان چھتر میں کونش پر حملہ آور ہوئی اور کسی اشتعال انگیزی کے بغیر وہاں کی مسلم آبادی کو ظلم کا نشانہ بنایا۔

دو روز تک سکھ لشکر کونش کے میدان میں ڈیرے ڈالے پڑا رہا۔

مسلمان مجاہدوں نے پہاڑوں کی اوٹ میں پناہ لی۔ تیسرے روز کونش سے سکھ لشکر شنکیاری پہنچا اور وہاں اپنے قلعے کی مرمت کرائی۔ چند دن تک ہر طرح کے مظالم ڈھانے کے بعد ہری سنگھ واپس چلا گیا۔ لوگوں پر ہری سنگھ کی اس قدر ہیبت طاری تھی کہ وہ سامنے آنے ہی سے گھبراتے تھے۔ دوسرے مسلمان یہاں متحد ہو کر لڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو کسی مرکزی تنظیم کا فقدان تھا، دوسرے آپس کا پرنہ جنلید دعداوتیں بھی ان کے ایک مرکز پر جمع ہونے میں رکاوٹ بنتی تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ بالائی ہزارہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ ندی نالوں نے اسے بے شمار ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے۔ راستے دشوار گزار ہیں اس لیے ایک جگہ کے لوگ چاہیں بھی تو مصیبت کے وقت دوسری جگہ کے لوگوں کی امداد کے لیے نہیں پہنچ سکتے۔ ادھر سکھوں کو بھی جو کامیابی ہوئی وہ محض وقتی اور عارضی تھی۔ سکھ جب تک کسی علاقے میں موجود رہتے لوگ دبے رہتے جونہی ان کے سپاہی پیٹھ پھیرتے لوگ پھر آزادی کا سانس لینے لگتے۔

اقتدار کا نشہ انسان کو چین نہیں لینے دیتا ورنہ سوچا جائے تو صوبہ سرحد کے علاقوں پر حملے کر کے سکھوں کے ہاتھ آیا بھی تو کیا؟ جتنا مالی اور جانی نقصان انھیں سرحدی مہمات کے دوران ہوا اور جتنے اخراجات انھیں برداشت کرنے پڑے اس نے ان کی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس کی بجائے اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی سرگرمیوں کا دائرہ پنجاب ہی کے میدانی علاقوں تک محدود رکھتے تو شاید ان کی حکومت اتنی جلدی زوال کا شکار نہ ہوتی۔ صوبہ سرحد اور افغانستان کے پہاڑ اکثر حملہ آوروں کے لیے موت کا دیوتا ثابت ہوتے رہے اور سکھوں کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا۔

اب کے سکھ سردار ہری سنگھ ایک ایک کر کے مختلف قبیلوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ پکھلی سے فارغ ہو کر اس نے تناول کی خبر لینی چاہی کیونکہ سربلند خان تنولی اور نواب خان تنولی سردار محمد خان ترین کے ساتھ مل کر بارہا سکھوں کے وقار پر کاری ضرب لگا چکے تھے۔

اور بہت بڑا لشکر لے کر سردار ہری سنگھ نلوہ پادہ کے راستے عازم تناول ہوا۔ حملے کی خبر ملتے ہی تنولی سرداروں نے شنگڑی کو خالی کر دیا اور اپنا سامان اور اہل و عیال کسی محفوظ جگہ بھیج دیا۔ تنولی بڑی بہادری سے لڑے اور موضع پورچھ میں انھوں نے سکھ لشکر کو گھیرے میں بھی لے لیا لیکن سکھوں کی توپوں کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ کافی نقصان اٹھانے کے بعد ہری سنگھ اس درے سے اپنی فوج نکال کر لے گیا۔ اس نے حسب عادت سربلند خان کے گاؤں شنگڑی کو جلا کر راکھ کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر سربلند خان اپنے ساتھیوں سمیت ڈھاکہ دُنہ کے کلیدی مقام پر پہنچ کر سکھ لشکر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ہری سنگھ موقع کی نزاکت کو بھانپ کر ہری پور سے مزید کمک لے کر ڈھاکہ دنہ پہنچا۔ سربلند خان اس وقت باندہ لوہاراں میں مقیم تھا۔ وہ خود اور اس کا بیٹا شبیر محمد خان نہایت بے دردی سے لڑے اور اپنے تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ اتنے بڑے سکھ لشکر کو کئی بار پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، ایک بار تو قریب تھا کہ سکھ فوج کو مکمل شکست ہو جاتی لیکن ہری سنگھ کی شخصی بہادری کی وجہ سے ایسا ہونے نہ پایا۔

اس نازک موقع پر جب ہری سنگھ نے میدان سکھوں کے ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو خود مردانہ وار آگے بڑھا اور اپنے بھاگتے ہوئے ساتھیوں کو للکارا۔ ہری سنگھ اس وقت ایک پہاڑی چٹان کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا اور

شیر محمد خان اس کی ٹوہ میں لگا تھا۔ جونہی شیر محمد خان اسے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ادھر سے گزرا ہری سنگھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چٹان کے پیچھے سے نکلا اور بندوق سے شیر محمد خان پر گولی چلا دی۔ قضا را گولی شیر محمد خان کے ماتھے پر لگی اور وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی تنولی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ سکھوں نے تنولی غازیوں کا پیچھا کیا۔ بہت سے مسلمان مجاہد سکھوں کی سنگینوں سے شہید ہوئے جبکہ باقی ارد گرد کی پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ سکھوں نے شیر محمد خان کی لاش کی بڑی بے حرمتی کی۔ سر کاٹ لیا گیا اور اسے کئی دن تک ہری پور کے قلعہ کے دروازے پر لٹکائے رکھا۔

اس معرکے کے نتیجے میں سر بلند خان مجبوراً سری کوٹ چلا گیا جہاں سردار محمد خان ترین بھی مقیم تھا۔ دونوں جانبازوں نے از سرِ نو ارد گرد کے مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے اہلِ ایمان ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ سردار ہری سنگھ اب تک مطمئن تھا کہ اس کا مقابلہ صرف تنولیوں سے تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ سردار محمد خان ترین پھر جہاد کے عزم سے اٹھا ہے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ہری سنگھ، محمد خان ترین کے ہاتھ دیکھ چکا تھا۔ سری کوٹ کے معرکے میں ترین سردار نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔ اس سے پیشتر فوجدار مکھن سنگھ، دیوان رام دیال اور بہت سے دوسرے سکھ زعماء بھی اس کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اس لیے اب ہری سنگھ کو محمد خان ترین کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ محمد خان ترین کو زیر کیے اور اس کا مضبوط مورچہ سری کوٹ توڑے بغیر ہزارہ میں سکھ حکومت کی بنیاد کبھی مضبوط نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس نے با دلِ ناخواستہ سری کوٹ پر چڑھائی کر دی۔

۱۸۲۷ء میں سکھ فوج قلعہ ہرکشن گڑھ سے نکل کر سری کوٹ کی طرف بڑھی۔ سکھ لشکر میں سات ہزار سے بھی زیادہ سوار اور پیادے تھے اور ایک سوزنبورکیں (چھوٹی توپ) اور کئی بھاری توپیں بھی ساتھ تھیں۔ ہری سنگھ نے ارد گرد کے کئی سکھ سرداروں کو بھی اپنی مدد کے لیے بلوا رکھا تھا۔ جب دوسرے دن سکھ فوج ناڑہ سید خانیاں کے مقام پر پہنچی تو گاؤں خالی تھا اور لوگ اپنا سازوسامان اور اہل وعیال کو لے کر سری کوٹ کی طرف جا چکے تھے۔

ناڑہ ہی پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ ایک طرف دنیا کی بہترین مسلح فوج تھی اور دوسری طرف بے سروسامان مجاہد، جو محض اللہ کی امداد کے بھروسہ پر باطل کے خلاف صف آرا تھے۔ سارا دن سکھ توپ خانہ آگ برساتا رہا، فوجی ایک دوسرے کو بندوقوں سے نشانہ بناتے رہے۔ لیکن جنگ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہ پہنچ سکی، اس پر سردار ہری سنگھ نلوہ نے اپنے تمام کمانڈروں کو بلا کر غیرت دلائی کہ اگر سات ہزار سپاہی اور ایک سو توپیں لا کر بھی ناڑہ اور سری کوٹ فتح نہ ہوئے تو ہم مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ اس پر سکھوں نے نئے جوش وخروش سے پُرزور حملے کیے لیکن وہ پہاڑی مورچوں میں بیٹھے ہوئے مجاہدوں کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ سردار محمد خان ترین اور سربلند خان تنولی کی قیادت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط رہے۔

اندھیرا چھا گیا تو سردار ہری سنگھ، سردار مہاں سنگھ اور دوسرے بڑے افسر شب بسری کے لیے ناڑہ کے ایک مکان میں چلے گئے۔ انھیں بستر پر لیٹے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ غازیوں نے اپنے مورچوں سے نکل کر اس مکان کو گھیر لیا۔ غازیوں سے کلہاڑیوں سے مکان کے دروازے توڑ دیے چھتوں میں سوراخ کر دیے اور سکھ سرداروں پر گولیاں برسانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے

بہت سے سکھ سردار مارے گئے، بہت سے زخمی ہوئے اور باقی ماندہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سردار ہری سنگھ نلوہ چپکے سے ایک کوٹھڑی کے اندر پڑا رہا لیکن جب غازیوں نے مکان کو آگ لگادی تو باہر نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے پہلے مہان سنگھ کے بھائی کشن سنگھ کو باہر بھیجا کہ حالات کا جائزہ لے۔ وہ ابھی نکلا ہی تھا کہ غازی اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کی تکا بوٹی کر دی۔ بعد میں سردار ہری سنگھ اور سردار مہاں سنگھ اکٹھے نکلے دونوں نے زرہ پہن رکھی تھی۔ غازیوں کی تلواریں انھیں گزند نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ بالآخر غازیوں نے ان دونوں پر پتھر برسانے شروع کر دیے۔ پتھر لگنے سے ہری سنگھ سخت زخمی ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا پہاڑی کے نیچے ایک کھڈ میں جا گرا۔ جب لڑائی رکی تو سردار مہاں سنگھ کا یہ خیال تھا کہ ہری سنگھ اپنے ڈیرے کی طرف چلا گیا ہے۔ وہ ادھر گیا تو وہاں بھی اسے موجود نہ پایا۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی اور یہ خبر عام ہو گئی کہ ہری سنگھ مارا گیا ہے۔ ادھر سکھ مقتولوں کی لاشوں میں سے کسی ایک پر ایک مسلمان غازی کو ہری سنگھ کی لاش کا گمان ہوا۔ اس نے اس کا سر کاٹ کر اپنے سالاروں کے پاس پہنچا دیا۔ وہ سکھ مقتول اپنے سردار ہری سنگھ سے اتنا مشابہ تھا کہ ہر ایک نے یقین کر لیا کہ ہری سنگھ نلوہ مارا گیا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ ہری سنگھ زخموں سے چُور کھڈ میں پڑا تھا۔ شور اس لیے نہیں کرتا تھا کہ مسلمان مجاہد سُن لے گا تو اسے فوراً موت کے گھاٹ اُتار دے گا۔ آخر ایک سکھ سپاہی کا اُدھر سے گزر ہوا تو سردار ہری سنگھ نے اس کا دامن پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا "میں ہری سنگھ نلوہ ہوں، مجھے یہاں سے نکالو اور ہری پور پہنچا دو۔" وہ سکھ سپاہی اپنے سردار کو اپنی پیٹھ پر لاد

کر مہان سنگھ کے پاس لے آیا۔ سردار مہان سنگھ نے اسے طبل جنگ والے گھوڑے پر، جو پاس ہی کھڑا تھا، سوار کر کے اور چند پیادوں کو ساتھ لے کر ہری پور کے قلعہ میں پہنچا دیا۔ کئی مہینے کے علاج کے بعد سردار ہری سنگھ صحت یاب ہو گیا۔

سکھ مقتولوں کی لاشیں ناڑہ ہی میں پڑی تھیں۔ تقریباً چار سو سکھ مارے گئے تھے جن میں سردار جمیعت سنگھ اور اس کا چھوٹا بھائی، مولراج اور دوسرے افسر بھی شامل تھے، بہت سامان غنیمت غازیوں کے ہاتھ لگا۔

جب اس تباہی کی خبر لاہور پہنچی تو سکھ دربار میں تہلکہ مچ گیا۔ خود مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اعلان کیا کہ وہ ایک لشکر عظیم لے کر ہزارہ جائے گا اور باغیوں کو مزہ چکھائے گا۔ سردار ہری سنگھ مہاراجہ کی فطرت سے بخوبی واقف تھا وہ جانتا تھا کہ مہاراجہ کبھی ہری سنگھ کو معاف نہیں کرے گا۔ اس سانحہ کی ساری ذمہ داری اس پر ڈالے گا اور سزا دے گا۔ اس لیے اس نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے مہاراجہ کے ہری پور پہنچنے سے پہلے ہی ایک لشکر ترتیب دیا اور بگڑہ کے گاؤں پر اچانک شبخون مارا۔ بگڑہ میں اس وقت وہ بہت سا سامان جمع تھا جس پر سکھوں کی شکست کے بعد مجاہدوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ سکھوں نے وہ سامان دوبارہ اپنی تحویل میں لے لیا۔ ساتھ ہی بگڑہ پر حملہ کر کے ہری سنگھ نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا کیونکہ اس سے پہلے خبر مشہور ہو گئی تھی کہ ہری سنگھ نلوہ ناڑہ میں مارا گیا ہے۔

ادھر مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک لشکر جرار کے ساتھ منزل بمنزل سفر کرتا ہوا راولپنڈی پہنچا، کچھ دنوں کے لیے وہ وہیں فروکش رہا۔ سکھ حکمران اس امر کو بخوبی جانتا تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر ہزارہ کے سرفروشوں کو دبانا قطعاً

ناممکن ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سردار محمد خان ترین کے ہوتے ہوئے ہزارہ میں اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکے گی۔ اس لیے اس نے حیلہ بازی سے کام نکالنا چاہا۔ بالآخر اس نے اپنے سپہ سالار دیوان چند کو صلح کا پیغام دے کر محمد خان ترین کے پاس بھیجا۔ دیوان چند بہت چرب زبان اور خوش بیان شخص تھا۔ اس نے سردار محمد خان ترین سے کچھ ایسے مخلصانہ انداز میں بات چیت کی کہ وہ اس کے ہمراہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس راولپنڈی جانے کو تیار ہو گیا۔

اصل میں مہاراجہ کی طرف سے دیوان چند کو بھی اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ اس نے ترین سردار کو یہ بتایا تھا کہ مہاراجہ اس کی شجاعت، اور عظیم صلاحیتوں سے متاثر ہو کر صلح کا ہاتھ بڑھا رہا ہے تاکہ خلق خدا فتنہ و فساد اور لڑائیوں سے بچ جائے لیکن اسے رنجیت سنگھ کے مذموم عزائم کا پتہ نہ تھا۔

سردار محمد خان ترین راولپنڈی جا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملا۔ بظاہر اس نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی، پھر اسے اپنا مہمان بنا کر لاہور لے گیا لیکن لاہور پہنچتے ہی مہاراجہ کی نیت بدل گئی۔ اس نے محمد خان ترین کو کانگڑہ کے قلعہ میں بھیج دیا جہاں اس کے ساتھ ایک قیدی کا سا سلوک کیا جانے لگا۔

دیوان چند اپنی ذاتی ضمانت پر محمد خان ترین کو راولپنڈی لایا تھا، وہ دل ہی دل میں محمد خان سے بڑا شرمندہ تھا، اس نے کئی بار مہاراجہ رنجیت سنگھ سے محمد خان ترین کی رہائی کا مطالبہ کیا لیکن مہاراجہ ہر بار اسے ٹالتا رہا۔

"تاریخ ہزارہ" مؤلفہ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی میں اس واقعہ کو قدرے مختلف صورت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس تاریخ کا کہنا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے لشکر کے ساتھ ہزارہ آیا تو جاگل کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اس نے اپنے پیادے

دوڑا کر علاقے کے سر کردہ رئیسوں کو بلا بھیجا۔ محمد خان ترین، سر بلند خان تنولی اور شاہ محمد مشوانی تو راجہ کے پاس حاضر ہوئے لیکن باقی سردار دریائے سندھ کو پار کر کے علاقہ یوسف زئی (مردان) چلے گئے۔ چونکہ اس بار کسی نے مزاحمت نہ کی تھی اس لیے سری کوٹ، اور تربیلا پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ مہاراجہ ایک دن اچھے موڈ میں تھا اور دریائے سندھ کے بائیں کنارے سیر سے محظوظ ہو رہا تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر لوگ جمع ہو گئے اور نعرے لگانے لگے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سکھوں کو چڑانے کے لیے انھوں نے ایک دو گائیں ذبح کیں اور ان کا گوشت بھون بھون کر کھانے لگے۔ اس پر مہاراجہ کو طیش آ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ کیا اور کھبل کو جلا دیا جائے۔

دوسرے دن دریائے سندھ کو پار کر کے مہاراجہ اور اس کا لشکر امب کی طرف بڑھے، نواب امب پائندہ خان نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ اس پر سکھ مہاراجہ پائندہ خان کے بیٹے جہانداد خان کو بطور یرغمال اپنے ساتھ لے گیا۔

جب مہاراجہ ہزارہ کے معاملات نمٹا کر واپس جا رہا تھا تو محمد خان ترین کو مہمان بنا کر ساتھ لے گیا۔ جب راولپنڈی پہنچ کر سردار محمد خان ترین اور سر بلند خان تنولی نے اپنے علاقے کو واپس جانے کی اجازت چاہی تو مہاراجہ نے انھیں قیدی بنا لیا، اس نے ہزارہ کے گورنر سردار ہری سنگھ کو بلا بھیجا اور محمد خان ترین کو اس کی تحویل میں دے کر کہا کہ اسے ساتھ لے جاؤ اور اس وقت تک رہا نہ کرو جب تک ایک لاکھ روپیہ جرمانہ ادا نہ کر دے۔ ہری سنگھ نلوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مہاراجہ صرف روپیہ پیسہ کا بھوکا ہے دوسرے یہ خدشہ بھی دامن گیر تھا کہ اگر ایک بار (جرمانہ ادا کر کے ہی سہی) سردار محمد خان ترین آزاد ہو جائے تو سکھوں پر دنیا تاریک ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے

سکھ مہاراجہ کو صاف کہہ دیا کہ ایک لاکھ روپیہ اس ملک سے وصول نہیں ہو سکتا لہذا وہ محمد خان کو پاس رکھنے کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا۔ اس پر مہاراجہ نے محمد خان کا روزانہ الاؤنس مقرر کر دیا اور اسے اپنے ساتھ لاہور لے گیا۔ پھر بڑے خفیہ اور پُراسرار طریق سے اُسے کانگڑہ کے قلعے میں قید کر دیا۔

میجر سمتھ نے اپنی کتاب "لاہور کے سکھ حکمران" میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے کہ......" اس مقصد کے لیے رنجیت سنگھ نے اپنے ایک افسر مصر دیوان چند کو بھیجا کہ وہ دم دلاسہ دے کر محمد خان ترین کو راولپنڈی لے آئے جہاں ان دنوں راجہ مقیم تھا۔ دیوان چند اپنی شخصی ضمانت دے کر محمد خان کو ساتھ لے آیا۔ وہاں سے سکھ مہاراجہ ترین سردار کو مہمان بنا کر لاہور لے گیا۔ وہاں جا کر رنجیت سنگھ نے وعدہ خلافی کی اور محمد خان کو جیل میں ڈال دیا۔ مصر دیوان چند نے بڑا احتجاج کیا اور مہاراجہ کو یاد دلایا کہ وہ محمد خان کو اپنی ذاتی ضمانت پر ساتھ لایا ہے اور اس سے دوستی کا عہد کر رکھا ہے۔ وہ میرے متعلق کیا سوچے گا۔" اس احتجاج کے باوجود محمد خان کو ایسے خفیہ طریق سے کانگڑہ بھیج دیا کہ خود دیوان چند کو بھی خبر نہ ہو سکی۔

ایک دن مصر دیوان چند نے بھرے دربار میں رنجیت سنگھ کو کہا۔ "میں محمد خان ترین کو قول دے چکا ہوں کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے گا، لہذا اسے رہا کیا جائے۔" لیکن محمد خان کی رہائی کا تو ذکر ہی کیا رنجیت سنگھ مصر دیوان چند سے بھی بگڑ گیا اور کہا۔ "محمد خاں کو چھوڑو تم اپنی جان کی فکر کرو۔" اس بدعہدی پر دیوان چند احتجاجاً دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اسے رنجیت سنگھ کی اس وعدہ خلافی کا اتنا قلق تھا کہ اس نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

رنجیت سنگھ نے دیوان چند کی اس طرح کی موت کا سنا تو سخت نادم ہوا۔ دو دن تک کچھ کھایا نہ پیا۔ اس نے محمد خاں کی رہائی کا حکم دے دیا لیکن رہائی کا پروانہ پہنچنے سے پہلے ہی مردِ مجاہد محمد خان ترین قید خانے ہی میں وفات پا گیا تھا۔

محمد خان ترین کی شہادت کے ضمن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دستور تھا کہ دسہرے کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا کرتا تھا، اس موقع پر دور و نزدیک کے سکھ سردار لاہور میں حاضری دیتے اور مہاراجہ کو نذرانے پیش کرتے۔ چنانچہ دسہرہ کی تقریبات میں شرکت کے لیے جب ہری سنگھ نلوہ لاہور گیا تو رنجیت سنگھ نے نہ صرف اسے انعام و اکرام سے نوازا بلکہ راولپنڈی اور نواحی علاقے کا گورنر بھی بنا دیا۔ ساتھ ہی رنجیت سنگھ نے سردار محمد خان ترین کو (جو اس وقت تک سکھوں کی قید تھا) پچپن ہزار روپے کے عوض ہری سنگھ نلوہ کے حوالے کر دیا اور اسے اختیار دیا کہ چاہے تو یہ رقم محمد خاں سے وصول کرے اور چاہے تو اجتماعی جرمانے کے ذریعے اکٹھا کرے، سردار ہری سنگھ نلوہ محمد خان ترین کو اپنے ساتھ راولپنڈی لے آیا۔

قیام راولپنڈی کے دوران نلوہ نے سردار محمد خان ترین کو اپنے سامنے بلایا اور کہا "میں نے تمھارا سر پچپن ہزار روپے کے عوض مہاراجہ رنجیت سنگھ سے خریدا ہے۔ تم یہ روپیہ اپنے گھر سے لا کر یا اپنے علاقے کے لوگوں سے وصول کر کے مجھے پہنچاؤ ورنہ جان کی خیر نہ ہو گی۔

محمد خان ترین سارے معاملے کو بھانپ گیا لیکن اس نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ میری حیثیت تو اس وقت ایک پابہ زنجیر قیدی کی سی ہے۔ میں بے بس ہوں۔ البتہ اگر مجھے رہا کیا جائے تو شاید مطلوبہ رقم ادا کر سکوں"۔

سردار ہری سنگھ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایک بار محمد خان ترین جیسا شیر پنجرے سے آزاد ہو گیا تو دوبارہ اسے پکڑ کر پنجرے میں بند کرنے والا کہاں سے آئے گا اس لیے وہ محمد خان ترین کو رہا کرنے پر تیار نہ ہوا بلکہ بڑی تلخ کلامی پر اتر آیا۔ اس نے محمد خان ترین کو قلعۂ کلر کہار (کوہستانِ نمک) میں قید کر دیا اور قلعہ دار کو ہدایت کی کہ محمد خان کو روزانہ آدھ پاؤ آٹے کی روٹی ایک پاؤ نمک ڈال کر کھلائی جائے اور اس کے سوا کوئی خوراک ہرگز نہ دی جائے۔" بطلِ حریت سردار محمد خان ہر مصیبت اور مشکل کو گلے لگاتا رہا۔ لیکن اس نے سکھوں کے سامنے رحم کے لیے ہاتھ نہ پھیلایا لیکن ہری سنگھ نلوہ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جیسا کہ عام مشہور ہے) چپکے سے محمد خان ترین کو کھانے میں زہر دے دیا گیا اور اس طرح یہ عظیم مجاہد شہادت حاصل کر کے اپنے خالقِ حقیقی کے حضور جا پہنچا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ سردار محمد خان ترین کو ایک ویران کنویں میں قید کیا گیا اور اسے ہر طرح کی اذیتیں دینے کے لیے کھانے میں بہت سا نمک ملا کر دیا جاتا اور پانی تک نہ دیا جاتا۔ اسی حالت میں وہ شہادت کا مرتبہ پا گیا۔

ہری سنگھ نلوہ محمد خان ترین سے انتقام لے کر اپنا دل ٹھنڈا کر چکا تھا لیکن اسے پچپن ہزار روپیہ کی وہ رقم ابھی وصول نہ ہوئی تھی جو وہ محمد خان ترین کے سر کے عوض سکھ مہاراجہ کو ادا کر چکا تھا۔ نلوہ نے حاکم ہزارہ سردار مہان سنگھ کو بلایا اور تاکید کی کہ "جیسے بھی ہو یہ رقم اہلِ ہزارہ سے وصول کر کے مجھے دو"۔ چنانچہ نلوہ کی ہدایت پر سردار مہان سنگھ نے سارے ہزارہ پر اجتماعی جرمانہ عائد کر دیا۔ ہر گھر سے ڈھائی روپیہ کی رقم تاوان کے طور پر وصول کی جانے لگی۔

آئے دن کی لڑائیوں، کساد بازاری اور سیاسی حالات کی ابتری کے باعث لوگوں میں جرمانہ ادا کرنے کی سکت نہ تھی۔ اس پر سکھ کارندوں نے کئی لوگوں کے مال مویشی نیلام کر دیے۔ کئی ایک کی زمینیں قرق کر لی گئیں اور کئی ایک کے گھریلو برتن اور دوسرا سامان فروخت کر دیا گیا تب کہیں جا کر پچپن ہزار روپیہ کی یہ رقم پوری ہوئی۔ مہاں سنگھ نے راولپنڈی جا کر یہ رقم سردار ہری سنگھ نلوہ کی ہتھیلی پر رکھی تب کہیں اس کی جان میں جان آئی۔

سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ کا دور انتہائی دہشت گردی کا دور تھا۔ نہ کوئی قانون تھا نہ انصاف۔ سکھ سرداروں کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ سردار محمد خان ترین منظرِ عام سے ہٹا تو سکھوں کو اور بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ وہ ہر جگہ اپنی مرضی کے حاکم مقرر کرتے جو لوگوں سے جبراً مالیہ اور "نذرانہ" وصول کرتے، بیگار لیتے اور ذرا ذرا سی بات پر عبرتناک سزائیں دیتے۔ ہزارہ کے مختلف علاقے مالیہ کی وصولی کی غرض سے مختلف سکھ سرداروں کو اجارہ پر دیے گئے۔ پکھلی اور شنکیاری پر گلاب سنگھ، پکھلی بایاں پر سردار دل سنگھ، مانسہرہ پر بھائی حکم سنگھ، تناول پر منشی بھوانی داس، ناڑہ پر حسن شاہ سید، تربیلا پر تھانیدار فتح سنگھ اور سرائے صالح پر مول سنگھ کو حاکم بنا دیا گیا۔ اسی طرح کاغان، اگرور اور بھوگڑ منگ کے علاقے تیس ہزار روپے سالانہ اجارہ پر گڑھی کے حبیب اللہ خان کے سپرد کر دیے گئے لیکن جب وہ مقررہ رقم ادا نہ کر سکا تو اس کے ایک بھائی اور بھتیجے کو ہری پور کے قلعہ ہرکشن گڑھ میں قید کر دیا گیا۔ مالیہ کی وصولی کا طریق کار بھی سکھ دور میں انوکھا اور نرالا تھا۔ ہر علاقے کا مالیہ نیلام کیا جاتا، جو سرکردہ شخص بولی دے کر اجارہ لے لیتا وہ اپنی من مانی کرتا اور عوام کو جس طرح قربانی کا بکرا بنانا چاہتا، نہ تو مالیہ

کی کوئی شرح مقرر تھی نہ ہی کسانوں کو کسی کے پاس اپیل یا شکایت کرنے کی اجازت تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

بوستان خان ترین

سردار محمد خان ترین کی غیر حاضری میں ہری پور اور نواحی علاقہ کی قیادت اس کے بھتیجے بوستان خان ترین کے حصے میں آئی۔ اس سے پیشتر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے بھی اسے خصوصی مراعات اور جاگیر دی جا چکی تھی اس لیے سردار مہاں سنگھ اعلانیہ بوستان خان پر اپنا حکم نہیں چلا سکتا تھا تاہم وہ اندر ہی اندر بوستان خان سے بدلہ لینے کے موقع کی تلاش میں رہتا۔ بوستان خان سے کیے گئے وعدے ایفا نہ کیے گئے، نہ اس کے مرتبے اور مقام کا خیال رکھا گیا۔ اس لیے تھوڑے ہی عرصے میں اس کا دل سکھوں سے بھر گیا، اس نے مشوانی، سید تانی اور دوسرے قبائل کے زعماء کو بلایا اور پھر سے سکھوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا۔ چھوٹتے ہی مجاہدین نے سری کوٹ کے سکھ قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ سکھوں نے دیکھا کہ قلعے میں خوراک اور پانی ختم ہونے والا ہے تو انھوں نے مہاراجہ کے پاس ایلچی دوڑائے۔ اتفاق سے ان دنوں سکھوں کا ایک بہت بڑا لشکر فرانسیسی نژاد جرنیل ونطورا کی کمان میں پشاور کی مہم پر جاتے ہوئے حسن ابدال میں خیمہ زن تھا۔ ہزارہ مہاں سنگھ حاکم ہزارہ نے بڑی منت سماجت سے فرانسیسی جرنیل کو اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ پشاور جانے سے پہلے سری کوٹ کی محصور شدہ سکھوں کی رہائی کے لیے ان کی مدد کرے۔ فرانسیسی جرنیل ہزارہ آیا اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ سری کوٹ کے غریب پہاڑی لوگوں کو تو سکھوں کے

خلاف فوج کشی کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ سب بغاوت ہری پور کے میدانی علاقوں کے رئیسوں ہی کی شہ پر ہوتی ہے، اس لیئے پہلے ہری پور کے خوانین سے نبٹنا ضروری ہے۔ فرانسیسی جرنیل نے فوری طور پر فوجی کارروائی کر کے سردار بوستان خان ترین کو جاگل سے، جلال خاں دلازاک کو سرائے صالح سے، راجہ ہاشم خان کو ماکرلٹے سے اور سنجی خان جدون کو نواں شہر سے گرفتار کر کے ہری پور کے قلعہ میں بند کر دیا۔ ونطورا کے اس اقدام سے اہل ہزارہ کے حوصلے پست ہو گئے اور حریت پسندوں کا زور ٹوٹ گیا اور ہری کوٹ اور دوسرے مقامات پر سکھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

ونطورا تو اس کارروائی کے بعد اپنے پروگرام کے مطابق غازی اور تربیلا کے راستے پشاور روانہ ہو گیا لیکن یہ دشمن اسلام جاتے جاتے حاکم ہزارہ سردار مہاں سنگھ کو اُلٹی پٹی پڑھا گیا۔ چنانچہ ہری پور واپس پہنچتے ہی اس نے سارے ہزارہ کے سرکردہ خوانین کو صلاح مشورے کے بہانے بلا لیا اور پھر بڑی سنگدلی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سردار محمد خان ترین کے بھتیجے اور جانشین سردار بوستان خان ترین، جلال خان دلازاک (سرائے صالح) سنجی جان جدون (نواں شہر) پائندہ خان تنولی، شیر محمد برادر صالح محمد اور سلیم شاہ مشوانی کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا۔ اور یوں یہ سرفروش اپنے ملک و ملت کی عزت و ناموس پر قربان ہو کر شہادت کا رتبہ پا گئے۔

سردار غلام خان ترین

سکھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان سرکردہ خوانین کی شہادت کے بعد مقامی آبادی کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ ہری کوٹ کے مشوانیوں کو وطن بدر

کر دیا گیا۔ وہ بیچارے چھ سات برس تک اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ کئی ایک دریائے سندھ پار کر کے علاقہ صوابی کی طرف چلے گئے۔ کئی نے دوسرے مقامات کا رخ کیا۔ سکھوں نے بہت سے مشوانی نوجوانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اپنی فوج میں بھرتی کر لیا اور کافی عرصہ تک ان بے چاروں سے بیگار لی جاتی رہی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد سکھوں میں انتشار نے سر اٹھایا اور ان کا زور ٹوٹتا دکھائی دینے لگا۔ مہاراجہ شیر سنگھ باپ کی جگہ گدی نشین ہوا تو اس نے کشمیر اور ہزارہ کے علاقے اپنے بیٹے کنور پرتاپ سنگھ کو سونپ دیئے جس نے اپنی طرف سے اربیل سنگھ کو ہزارہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک تو سکھوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ دوسرے انگریزوں سے شکست کے نتیجے میں ان کا اقتدار رُو بہ زوال ہو گیا۔ جب اربیل سنگھ کی گرفت اہل ہزارہ پر کمزور پڑتی دکھائی دی تو اس کی جگہ دیوان مولراج کو حاکم ہزارہ مقرر کیا گیا۔ تاہم حالات سدھر نہ سکے۔ اس افراتفری، بدامنی اور طوائف الملوکی سے مسلمان سرداروں نے فائدہ اٹھایا اور از سر نو سکھوں کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کر دیا۔ جگہ جگہ دیوان مولراج کی سکھ فوج اور مقامی مجاہدوں میں معرکے ہوئے۔

اب سکھوں کی ہوا اکھڑ چکی تھی۔ دیوان مولراج جیسا صاحب تدبیر بھی مجاہدوں کے سامنے ٹھہر نہ سکا چنانچہ قوم ڈھونڈ نے ماڑ کا قلعہ اور حسن علی خان کرڑال نے گڑھی کا قصبہ سکھوں سے چھین لیا۔ اسی طرح مشوانی سرفروشوں نے سری کوٹ پر، راجہ حیدر بخش گکھڑ نے خانپور پر، نواب خان تنولی نے شیروان پر، قوم جدون نے نواں شہر پر اور سردار غلام خان ترین نے جاگل پر قبضہ کر لیا۔

اور سکھوں کو ان مقامات سے نکال باہر کیا — ایبٹ کے ہری پور کے قلعہ ہرکشن گڑھ پر تسلط باقی رہ گیا تھا لیکن دس فروری ۱۸۴۶ء کو سبھراؤں (پنجاب) میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد سکھوں کی رہی طاقت بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہزارہ کی سکھ فوج کے لیے ہری پور شہر کا تحفظ کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس پر اردگرد کے مسلمان عوام نے سردار غلام خان ترین، خانی زمان خان طاہر خیلی اور مولوی ولایت علی کی قیادت میں شہر ہری پور کا محاصرہ کر لیا۔ انھوں نے قلعہ کی سکھ فوج کو پانی پہنچانے والی نہر کو بند کر دیا۔ کچھ عرصہ تو سکھ لشکر نے قلعے کے تالابوں کے پانی پر گزارہ کیا لیکن جب پانی کا ذخیرہ بالکل ختم ہو گیا اور سپاہی پیاس سے مرنے لگے تو سکھ فوج باہر نکل کر لڑنے پر مجبور ہو گئی۔ سکھوں کا توپ خانہ بہت مضبوط تھا۔ انھوں نے اردگرد کے دیہات پر اندھا دھند گولہ باری کی، جس سے بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا، بالآخر مجاہدین نے ہری پور کا محاصرہ ختم کر دیا اور وہ گندگر کی پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، سکھ لشکر نے اردگرد کے دیہات کو لوٹ کر آتش غضب بجھائی۔

سکھوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس موقع پر انھیں پشاور سے مزید کمک بھی سردار کاہن سنگھ کی کمان میں پہنچ گئی ورنہ ان کی حالت اتنی نازک ہو چکی تھی کہ ہری پور پر قبضہ رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ انہی دنوں ملتان میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان زبردست لڑائی ہو رہی تھی۔ دیوان مولراج بہانہ بنا کر ہزارہ سے سکھ فوج نکال کر ملتان پہنچانا چاہتا تھا لیکن اس کے باوجود سکھ فوج سنبھل نہ سکی۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد انگریزوں اور سکھوں کے مابین دوسری اور فیصلہ کن

لڑائی چھڑ گئی جو ۱۹/اپریل ۱۸۴۸ء سے ۱۶/مارچ ۱۸۴۹ء تک جاری رہی۔ سکھوں اور انگریزوں کے مابین آخری معرکوں میں کابل سے سردار دوست محمد خان کی فوج بھی سکھوں کی حلیف تھی۔ شکست کھانے کے بعد افغان فوج نے راہِ فرار اختیار کی تو درہ خیبر تک انگریز کمانڈر والٹر گلبرٹ نے ان کا تعاقب کیا۔

۱۶/اپریل ۱۸۴۶ء وہ دن تھا جب سکھ دربار کی جانب سے مقرر کیا ہوا حاکم ہزارہ دیوان مولراج ہری پور سے اپنا لاؤ لشکر نکال کر حسن ابدال روانہ ہو گیا۔ سردار غلام خان ترین نے موقع غنیمت سمجھا اور ہری پور کے قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرا دیا۔ اب تک لوگ سکھا شاہی کا حشر بھی دیکھ چکے تھے اور مقامی خان خوانین کے تحت رہ کر بھی تجربہ کر چکے تھے۔ اب سابقہ تجربہ کی بجائے وہ ایک بہتر نظامِ حکومت کے خواہاں تھے۔ اس وقت ہزارہ پر سید احمد بریلوی کی تحریک مجاہدین کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ باہمی صلاح مشورے سے لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب کے اسلامی نظامِ حکومت کو آزمایا جائے، چنانچہ ہزارہ کے تمام سرکردہ قبائل کا ایک نمائندہ جرگہ ہری پور میں بلایا گیا، جس میں اتفاق رائے سے سید اکبر شاہ آف ستھانہ کو علاقے کا بادشاہ منتخب کیا گیا اور سردار غلام خان ترین اور نواب خان تنولی وزیر مقرر ہوئے۔ شریعتِ محمدیہ کا نفاذ عمل میں آیا۔ ساری قوم نے عُشر دینا منظور کیا۔ مقدمات اور تنازعات کے فیصلے شرعی قوانین کی رو سے کیے جانے لگے اور یوں ایک اسلامی، جمہوری اور فلاحی مملکت کا قیام وجود میں آیا اور لوگوں کے سکھ کا سانس لیا، لیکن چونکہ اس اسلامی حکومت کو کام کرنے کا بہت تھوڑا موقع ملا اور بہت جلد سارے علاقے پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا، اس لیے اسے "لنڈی مسلمانی" یا "اسلام کا مختصر دورِ حکومت" کہا جاتا ہے۔

سکھ حکومت کے دوران سرزمین ہزارہ کشمیر کے صوبے کا ایک حصّہ تھی، بعد میں جب خالصہ سرکار نے ایک حقیر رقم کے عوض کشمیر کو ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا تو بھی ہزارہ کی قسمت کشمیر ہی سے وابستہ رہی، بعد میں ڈوگرہ سردار کو پتہ چلا کہ ہزارہ کے سرفروش مسلمانوں کو قابو میں رکھنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے اس نے انگریزوں سے درخواست کی کہ وہ ہزارہ اپنی عملداری میں شامل کر لیں اور اس کے عوض جموں کا علاقہ ڈوگرہ شاہی کے حوالے کر دیں۔ انگریزوں کی نظریں تو شروع ہی سے ہزارہ کے صحت افزا مقامات پر لگی تھیں اور وہ علاقے کی کلیدی حیثیت سے بھی آگاہ تھے اس لیے انھوں نے فوراً گلاب سنگھ کی تجویز مان لی اور میجر جیمز ایبٹ کو ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا گیا۔

اقتدار کی اس تبدیلی کو سردار غلام خان ترین جیسے مجاہد ملت نے کوئی وقعت نہ دی، ایک کافر کے جانے اور دوسرے کافر کے آنے میں اس نے کوئی امتیاز روا نہ رکھا۔ اس نے اپنی مجاہدانہ سرگرمیاں انگریز کے خلاف بھی جاری رکھیں۔ ۱۳ مئی ۱۸۴۹ء کو میجر ایبٹ نے کسی بہانے غلام خان ترین کو بلا بھیجا۔ جونہی غلام خان اس سے ملنے گیا، انگریز افسر نے اسے گرفتار کر کے اٹک کے قلعہ میں قید کر دیا۔ بعد ازاں چپکے سے اسے وہاں سے الہ آباد (ہندوستان) کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو غلام خان نے کسی نہ کسی طرح جیل کے سارے قیدیوں کو انگریز کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا۔ بعد میں انگریزی حکومت نے بغاوت کے الزام میں اسے پھانسی دے دی۔

یہ تھے شمع حریت کے تین پروانے ——— اور ترین خاندان کے تین سرفروش۔

جنھوں نے اپنی جانیں دیں لیکن اپنی آن پر حرف نہ آنے دیا۔ محمد خان ترین، بوستان خان اور غلام خان ترین کے اخلاف میں بھی بڑی بڑی نامور ہستیاں اٹھیں۔ خان میر افضل خان، رسالدار میجر میر داد خان، سردار بہادر خان، عبد المجید خان تلوکر سب نے خوب نام کمایا۔ لیکن جو شہرت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے حصے میں آئی وہ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہو۔ اس کی قیادت میں پاکستانی افواج نے بھارت کا غرور خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

○

گوڈری شہزادہ

وہ کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا، کسی کو پوری طرح معلوم نہیں، البتہ یہ سبھی جانتے ہیں کہ وہ ایک سرفروش تھا اور پروانہ وار شمع اسلام پر اپنی جان نچھاور کرنے آیا تھا۔

اہل سرحد اور قبائلی علاقے کے لوگ اپنے مشائخ اور علماء کی بڑی قدر کرتے ہیں، انھیں ان کے نام سے نہیں پکارتے بلکہ کسی معزز لقب سے پکارتے ہیں۔ پیرزادوں کو عموماً یہ لوگ "شہزادہ" یا "صاحبزادہ" کہتے ہیں۔ گوڈری شہزادہ بھی خطۂ سرحد کا ایک جلیل القدر پیرزادہ تھا، یہاں تک کہ پشاور کے دُرّانی حاکم بھی اس کی قدر کرتے تھے۔

جس وقت سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے صوبہ سرحد میں جہاد کا پرچم بلند کیا اور لوگ دھڑا دھڑ ان سے رجوع کرنے لگے تو گوڈری شہزادہ نے بھی سید صاحب کی بیعت کی اور کہا "میں خالصتہً لوجہ اللہ حاضر ہوا ہوں، آج کے بعد آپ کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا، انشاء اللہ!"

دُرّانی سردار ملاقات اور مشوروں کے لیے آئے تو سید صاحب بھی ہنڈ سے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نوشہرہ پہنچے، اس وفد میں فتح خان رئیس پنجتار، اشرف خان رئیس زیدہ اور خادی خان رئیس ہنڈ کے علاوہ گوڈری شہزادہ بھی

تھا، سید صاحب واپس پنجتار چلے گئے تو سردار یار محمد خان نے گودڑی شہزادہ کو روک لیا اور اس کی بڑی قدر و منزلت کی۔

مولانا غلام رسول مہر کا کہنا ہے کہ گودڑی شہزادہ شیدو کی جنگ میں شریک تھا، اس موقع پر کم و بیش ایک لاکھ آدمی سید صاحبؒ کا ساتھ دے رہے تھے اور ہر غازی کو یقین تھا کہ یہ کثیر التعداد فوج سکھوں کو شکست فاش دے کر اٹک پر پیش قدمی کرے گی اور پنجاب کی تطہیر کی مہم فوری طور پر شروع ہو جائے گی لیکن یار محمد خان عین اس وقت جب کامیابی سامنے نظر آ رہی تھی، اپنی فوج وہاں سے نکال کر لے گیا۔ اس کے فرار کے ساتھ دوسرے لوگوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور مجاہدین یہ جیتی ہوئی بازی ہار گئے۔ اس افراتفری میں بھی جب ہر ایک اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا چند مخلص خوانین، غازی اور گودڑی شہزادہ چٹان کی طرح اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔

شہزادہ گودڑی کا مورچہ شیدو کے گاؤں میں تھا۔ وہ اپنا جیش لے کر سکھ لشکر گاہ کے قریب پہنچا۔ اور خار بندی سے گزر کر اندر داخل ہو گیا، پیچھے مڑ کر اس نے لڑائی کا نقشہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ عین حالتِ جنگ میں اسے صحیح صورتِ حال کا پتہ تو نہ چل سکا تاہم اس نے جہاد جاری رکھا۔ سکھوں نے اس کے جیش پر دباؤ ڈالا تو وہ پیچھے ہٹتا ہٹتا گاؤں والے مورچے میں پہنچ گیا، جب وہاں بھی سکھوں کا ہجوم دیکھا تو پیچھے ہٹ کر قبرستان میں مورچہ قائم کر لیا اور آخر دم تک لڑتے ہوئے شہادت کا مرتبہ پا کر اپنے مالکِ حقیقی کے دربار میں پہنچ گیا"۔

"منظورہ" کا بیان ہے کہ گودڑی شہزادہ نے رستمانہ شجاعت سے کام لیتے ہوئے بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس کی جماعت

نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوطی اور استقامت کا ثبوت دیا اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر کے امیر المجاہدین سے کیا گیا وعدہ وفا کر دکھایا۔

"جماعتِ مجاہدین" کے الفاظ ہیں کہ پرانا شید و موجودہ آبادی سے تھوڑے فاصلے پر دریا کے عین کنارے پر واقع تھا۔ طغیانی کی وجہ سے وہ دریا بُرد ہو گیا اب صرف کھنڈر باقی ہیں۔ انھیں کھنڈروں میں شہزادہ گودڑی کی قبر ہے۔ لوگ اب بھی اسے احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

سیّد محمد حبان

تحریکِ مجاہدین ہمارے ہاں کی ایک عدیم النظیر، پُرجوش اور نتیجہ خیز تحریک تھی۔ عصرِ حاضر کا نامور مورخ ٹائن بی اسے برِصغیر کو انگریز اور اس کے ہندو سکھ حلیفوں سے نجات دلانے کی اولین کوشش اور حصولِ پاکستان کی جانب بنیادی قدم قرار دیتا ہے۔ کئی صدیوں کے بعد، اس تحریک کے زیرِ اثر مسلمان خود اپنے آپ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پیش کرنے لگے اور مجاہدانہ زندگی ہی کو سچّی اسلامی زندگی سمجھنے لگے۔ لوگ خود آتے اور اسلامی لشکر میں شامل ہوتے، انھیں نہ دنیا کا لالچ تھا نہ کسی شہرت کی طلب۔ وہ صحیح معنوں میں اللہ کے اطاعت گزار سپاہی تھے اور انھیں اللہ کی خوشنودی مطلوب تھی۔

صوبہ سرحد میں سید اکبر شاہ آف ستھانہ اور ارباب بہرام خاں آف تہکال بالا کے بعد تحریکِ مجاہدین کے سب سے بڑے جاں نثار سیّد محمد حبّان تھے۔ "منظورہ" میں بتایا گیا ہے کہ سید محمد حبّان حد درجہ متقی، شجاع، غیّور اور بلند پایہ عالم تھے بڑے حق گو اور حق پرست شخص تھے لیکن تھے کچھ تیز طبیعت۔

سید محمد حبان کانڑا (غوربند) کے رہنے والے تھے، بہت بڑے عالم اور سحر انگیز مقرر تھے۔ ان کے الفاظ سننے والوں کے دل میں اتر جاتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف علمی مراکز میں رہ کر علومِ دین کی تکمیل کی تھی۔ اغلباً کلکتہ کے

کسی دینی مدرسہ میں مدرس بھی رہے تھے۔ آسودہ حال شخص تھے۔ سید احمد صاحب خار باجوڑ تشریف لے گئے تو وہیں سیّد محمد حبان بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ اللہ نے آسودگی بھی دے رکھی ہے۔ عزت وحشمت بھی، اور علمِ دین کی دولت بھی۔ اب کسی دنیوی چیز کی طلب اور خواہش نہیں۔ صرف اللہ کے لیے آیا ہوں۔ آپ کے ساتھ رہوں گا۔ دل نے اثر قبول کیا تو بیعت کروں گا ورنہ واپس گھر چلا جاؤں گا۔" سید صاحب نے فرمایا: بیعت کیجیے۔ اللہ تعالیٰ برکت دے گا۔" چنانچہ سید محمد حبّان نے بیعت کرلی۔ کچھ عرصہ گزرا تو کہا۔ "میں اندھا تھا، آنکھیں کھل گئیں۔ کافر تھا مسلمان ہو گیا۔" سیّد صاحبؒ نے ٹوکا کہ یوں نہ کہیے، یہ کہیے کہ پہلے ہی سے مسلمان تھا، اب ایمان ترقی کر گیا۔"

جب سیّد صاحبؒ نے لوگوں سے بیعت اقامتِ شریعت لی اور عُشر اور زکوٰۃ کی وصولی کا آغاز ہوا تو سید محمد حبان کو ان کی علمی صلاحیتوں اور خاندانی وجاہت کے پیشِ نظر قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا۔ اپنے ایک مکتوب میں سیّد صاحب نے اپنے اس انتخاب پر یوں اظہارِ اطمینان کیا ہے۔ "ایک بلند مرتبہ عالم اور دین سے محبّت رکھنے والے کو منصب قضا سونپ دیا گیا۔ دستارِ قضا اس کے سر پر باندھی گئی اور قضا کے اختیارات اس کے سپرد کر دیے گئے۔"

اس منصب پر فائز ہونے کے بعد سیّد محمد حبان کو عموماً قاضی محمد حبّان کہا جانے لگا۔ انھوں نے پہلے پہل تو علاقہ کے لوگوں سے نرمی سے زکوٰۃ اور عشر کی ادائیگی کے لیے کہا لیکن جب اس کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا تو انھوں نے امیرالمجاہدین سید احمد بریلوی سے کہا۔ "پشاور (مردان بھی ان دنوں انتظامی

طور پر پشاور ہی کے تابع تھا) کے میدانی علاقوں کے لوگ۔ خودسر ہو رہے ہیں انھوں نے عُشر کی ادائیگی کا وعدہ کیا تھا لیکن اب یہ وعدہ وفا نہیں کر رہے۔ بہتر ہوگا کہ کچھ لشکر مجھے سونپ دیا جائے۔ میں پہلے تو وعظ و نصیحت کے ذریعے لوگوں کو پابند شریعت بنانے کی کوشش کروں گا، جو زکواۃ و عُشر ادا کرنے کا حکم نہ مانیں گے ان سے بزور منواؤں گا۔"

اس سلسلے میں قاضی القضاۃ سید محمد حبّان نے شرط لگائی کہ اسے لشکر دینے کے ساتھ ساتھ پورے اختیارات بھی دیے جائیں، اس لیے کہ میں مقامی آدمی ہوں، اپنے ہم وطنوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

انھوں نے سیّد صاحب سے یہ درخواست بھی کی کہ شاہ اسمٰعیل شہید کو میرے ساتھ کر دیا جائے تاکہ اگر مجھ سے دانستہ یا نادانستہ کوئی فعل خدا اور اس کے رسول کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو شاہ صاحب مجھے ٹوک دیں۔" سیّد صاحب نے یہ رائے قبول کر لی اور چھ سو سوار اور پیادے قاضی سیّد محمد حبّان کے ہمراہ کر دیے۔ ان کے ساتھ توپیں بھی تھیں۔ قاضی محمد حبان کو رخصت کرتے وقت سیّد صاحب نے نصیحت فرمائی ــــ یہ خدا اور رسول کا کام ہے ایسا نہ ہو کہ اس میں نفس کی خواہش دخیل ہو جائے۔"

قاضی محمد حبّان نے سارے علاقے کا دورہ کیا اور ہر جگہ شرعی احکام نافذ کیے، ان کی کوششوں سے سارا علاقہ اسلامی تعلیمات کے نور سے منوّر ہو گیا۔ کسی کسی جگہ لوگوں نے ان کی مخالفت بھی کی، کھلابٹ کے لوگوں نے ابتدا میں شرعی احکام کی مخالفت کی لیکن قاضی صاحب اپنے حسنِ تدبّر سے انھیں راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دورے کے دوران قاضی صاحب اور ان کے ہمراہیوں نے جن مقامات کا دورہ کیا ان میں ٹوپی، شیخ جنہ، نواکئی،

کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈکوئی، پنج پیر، ہنڈ، زیدہ، شیوہ، چار گلئی، سدم، گھڑیالی، اسمٰعیلہ اور امان زئی وغیرہ شامل ہیں۔

سید محمد حبان ایک مدبّر انسان تھے۔ دوسرے وہ مقامی حالات و واقعات اور رسم و رواج سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اچھے عالم اور مقرر تھے، اس لیے لوگوں سے اپنی بات منوا لینے کے اہل تھے، ان کے مشورے اور تدابیر ہمیشہ تحریک مجاہدین کے حق میں فائدہ بخش ثابت ہوئیں۔

امب کے نواب پائندہ خان تنولی کی ضد کے باعث جنگ کی نوبت آئی۔ نواب صاحب کو شکست کا صدمہ دیکھنا پڑا تو دریائے سندھ کو عبور کر کے مشرقی کنارے چلے گئے۔ سیّد صاحب نے قاضی محمد حبان کو پائندہ خان سے مصالحت کے لیے بھیجا، پہلے تو پائندہ خان مانتا ہی نہ تھا لیکن بعد میں قاضی محمد حبان نے ایسی پُر تاثیر اور بے باکانہ تقریر کی کہ نواب پائندہ خان کے لیے فوراً صلح کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

قاضی محمد حبّان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ پختون معاشرے کی اصلاح کی جائے اور جو فضول رسمیں معاشرے میں گھر کر چکی ہیں، انھیں ختم کر دیا جائے۔ جہالت کی وجہ سے یا کفار کی دیکھا دیکھی عجیب باتیں دیکھنے میں آتی تھیں مثلاً دیہاتی لوگ دریا میں ننگے نہاتے تھے، سیّد محمد حبان نے انھیں روکا اور جب نرمی سے کام نہ چلا تو یہ حرکت کرنے والے سے جرمانہ وصول کیا جانے لگا۔

ہوتی مردان کا خان اپنے علاقے کا بہت ہی با اثر اور طاقتور شخص تھا پشاور کے سرداروں کے ہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ مجاہدین نے قاضی سید محمد حبّان کی قیادت میں مردان کا رُخ کیا تو خان اپنے بھائی کو نائب بنا کر خود درّانی سرداروں سے امداد لینے کے لیے چلا گیا۔ سید محمد حبان کو اس

واقعہ کا علم ہوا تو شاہ اسمٰعیل، رسالدار عبدالحمید خان اور دوسرے سر کردہ ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، سب نے یہی رائے دی کہ پیچھے ہٹنا مناسب نہیں، مردان پر یورش کرنی چاہیے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ قاضی صاحب اس پر خوش ہوئے اور مردان پر پیش قدمی کی۔ ان کی جنگی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ مردان پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا۔ صرف گڑھی میں خان کے سپاہیوں نے لڑائی جاری رکھی۔ گڑھی سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی لیکن سیّد محمد حبّان اور ان کے ساتھی گلیوں کی اوٹ میں برابر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک بار ان کے چار پانچ ساتھی تو گولیوں سے بچ بچا کر سلامتی سے آگے نکل گئے لیکن ایک مجاہد کے سر پر گولی لگی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ پھر قاضی سیّد محمد حبّان نے دوسری بار چار پانچ ساتھیوں کے ساتھ ریلا کیا۔ قاضی صاحب کے باقی ساتھی تو بچ گئے لیکن ایک گولی ان کے سر پر آ لگی اور وہ شہید ہو گئے۔

گڑھی کی تسخیر تک قاضی صاحب کی شہادت کی خبر اخفا میں رکھی گئی۔ تمام غازیوں کو ان کی موت پر بڑا صدمہ ہوا۔ خود سید صاحب بھی اس واقعہ پر کافی دن تک افسردہ خاطر رہے۔ قاضی سید محمد حبان جیسے عالم فاضل، غیور و جسور، حق گو اور بے باک انسان کی شہادت مجاہدین کے لیے ایک دلدوز سانحہ تھی۔ شاہ اسمٰعیل تو چاہتے تھے کہ سید محمد حبان کو مردان ہی میں دفن کیا جائے لیکن سیّد حبّان کے بھائی راضی نہ ہوئے اور اپنے ملکی رواج کے مطابق میت چارپائی پر ڈال کر اپنے وطن کانڑہ (غوربند) لے گئے ـــ اور یوں یہ سرفروش انسان سید صاحب سے کیا گیا وعدہ وفا کر گیا۔

ارباب فیض اللہ خاں مہمند

تینغوں کے سائے میں اور توپوں کے منہ کے آگے حق بات کہنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ہر دور میں ایسے اہلِ حق ضرور ملیں گے جنھوں نے جان دے دی لیکن حق کا ساتھ نہ چھوڑا، ایسے ہی ایک جرأت مند اور باکمال ہزارہ خوانی (ضلع پشاور) کے ارباب فیض اللہ خاں مہمند بھی تھے جنھوں نے اپنے لہو سے تاریخ میں وہ داستانِ وفا رقم کی جو صدیاں گزرنے پر بھی فراموش نہ کی جا سکے گی۔

۱۸۳۰ء کی بات ہے امیر المجاہدین سید احمد بریلوی اور ان کے رفقاء ریگی اور تہکال بالا سے ہوتے ہوئے فاتحانہ شان سے کابلی دروازے سے تاریخی شہر پشاور میں داخل ہوئے اور قصہ خوانی، چوک یادگار اور بازار کلاں سے ہوتے ہوئے انھوں نے گورکھٹڑی میں قیام کیا —— لوگوں نے، جو سردارانِ پشاور اور سکھوں کے مظالم سے تنگ آئے بیٹھے تھے۔ ان اللہ والوں کی آمد پر سکھ کا سانس لیا جو اللہ کی زمین پر اللہ ہی کی حکومت قائم کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔

مجاہدین نے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر دارالسلطنت پشاور پر قبضہ کر لیا تھا۔ اہلِ پشاور منتظر تھے کہ فاتح قائد اب مفتوح عناصر سے کیا سلوک کرتا ہے۔ کوئی دنیا دار ہوتا تو شہر کو لوٹتا، گھروں کو آگ لگا دیتا اور ہزاروں عوام کو

تلوار کے گھاٹ اتار دیتا لیکن مجاہدین اسلام کا نصب العین ہی الگ تھا۔ قیاس آرائیاں اور کشیدگی عروج پر تھی۔ ذرا سی غلط حرکت بھی جلتی پر تیل کا کام دے سکتی تھی لیکن ایسے میں ایک مردِ خدا آگے بڑھا اور مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین آبرومندانہ مصالحت کرانے کی کوشش میں لگ گیا۔ وہ پشاور کے نواحی قصبے ہزار خوانی کا سربراہ ارباب فیض اللہ مہمند تھا۔

مولانا غلام رسول مہر کا کہنا ہے کہ بارک زئی سردار سلطان محمد خان نے ارباب فیض اللہ خان کو مشورے کے لیے بلایا تو اس نے دو ٹوک کہہ دیا کہ مصالحت ہی قرین صواب ہے جب آپ سے میدانی علاقے میں جنگ نہ ہو سکی تو اب شہر میں لڑنے کی کون سی صورت ہے؟" اس پر سلطان محمد خان کے بھائی طیش میں آگئے اور کہنے لگے ہم ہرگز صلح کے لیے تیار نہیں۔ ہم برابر لڑتے رہیں گے۔ تاہم سلطان محمد خان نے تمام حالات پر غور و فکر کے بعد ارباب صاحب ہی کے مشورے کو پسند کیا اور انھیں ثالث بنا کر سید صاحب کے پاس بھیجا۔

ارباب فیض اللہ خان نے سید صاحب سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ سلطان محمد خان توبہ کے لیے تیار ہے، اس کی تقصیریں معاف فرما دیجیے۔ سید صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے تو ارباب صاحب نے کہا کہ "اگر کوئی کافر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہہ دے کہ میں ایمان لانا چاہتا ہوں تو کیا آپ اسے حلقۂ اسلام میں داخل نہیں کریں گے؟ سلطان محمد خان تو پھر بھی مسلمان اور مسلمان زادہ ہے، پھر اسے معافی دینے میں کیا توقف ہے، اس کا ملک اسے لوٹا دیجیے، عمر بھر اطاعت گزار رہے گا۔"

ارباب صاحب چونکہ صلح کے محرک تھے، اس لیے انھوں نے اپنی ضمانت دی کہ سردارانِ پشاور اب سابقہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گے۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ اگرچہ آپ فتح مند ہیں تاہم سرداروں کے پاس اب بھی کافی لشکر اور جنگی ساز و سامان ہے، اگر صلح نہ ہو سکی تو کُشت و خون کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلے گا۔ ارباب فیض اللہ خاں نے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ وکیل بن کر صلح کرا رہا ہے۔ اگر سلطان محمد خان اور اس کے بھائی اپنے وعدے وفا نہیں کریں گے تو ان کا ساتھ چھوڑ کر سید صاحب سے آملوں گا۔"

سید صاحب نے اس معاملے پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور اپنی جانب سے شاہ اسمٰعیلؒ اور ارباب بہرام خان کو مختار بنایا جب کہ سلطان محمد خان کے ساتھ ارباب فیض اللہ خان اور مردان علی نے بات چیت میں حصہ لیا۔ دونوں وفد دوبارہ ارباب صاحب کی قیام گاہ پر ملے اور بالآخر فریقین میں صلح نامہ طے پا گیا۔

بعد میں جب سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل اور ان کے لشکر نے پنجتار جانے کا ارادہ کیا تو ارباب فیض اللہ خان نے اپنے گاؤں ہزار خوانی میں پورے لشکر کے لیے پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا۔

سید صاحب کو پشاور سے رخصت ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ارباب فیض اللہ خان کے کانوں تک بہت منحوس باتیں پہنچنے لگیں۔ پتہ کرنے پر انھیں یقین ہو گیا کہ سرداران پشاور صلح نامہ میں مخلص نہیں ہیں۔ انھوں نے در پردہ سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیے ہیں، اس پر انھوں نے ایک مخلص دوست کی حیثیت میں مولانا مظہر علی کو (جو سید صاحب کی طرف سے قاضئ شہر تھے) آگاہ کر دیا کہ "ان لوگوں کی نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے اور وہ اندر ہی اندر بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ سید صاحب کو اطلاع دے کر مناسب ہدایات حاصل کر لیں۔"

حیرت ہوتی ہے کہ قاضی مظہر علی نے بھی امیر المجاہدین کو بروقت ان سازشوں سے آگاہ نہ کیا۔ ایک دن سلطان محمد خان نے آدمی بھیج کر قاضئ شہر مظہر علی کو بلا بھیجا۔ وہاں پہلے سے کچھ علماء بیٹھے ہوئے تھے اور انھوں نے مجاہدین کے خلاف ایک فتویٰ بھی تیار کر رکھا تھا۔ قاضی مظہر علی کے اندر آتے ہی سلطان محمد خان نے سختی سے پوچھا کہ ان کے بھائی یار محمد خان کو کس جرم میں قتل کیا گیا ہے ہ۔ قاضی مظہر علی مناسب جواب دیتے رہے لیکن سلطان محمد کا غصہ اور جوش بڑھتا ہی گیا۔ آخر قاضی مظہر علی کو مشورے کے بہانے ایک کوٹھڑی میں بلایا گیا جہاں بیک وقت کئی تلواریں ان پر برسنے لگیں اور ان کے جسم کے ٹکڑے اڑ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ارباب فیض اللہ خان بھی اس وقت قاضی مظہر علی کے ساتھ بلائے گئے تھے اور انھیں بھی اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں وہ مجاہدین کا ساتھ نہ دیں تہ تیغ کر دیا گیا ــــ جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ قاضی مظہر علی کے قتل کے بعد جب ارباب فیض اللہ خان سردارانِ پشاور سے اس بدعہدی کی وجہ دریافت کرنے آئے تو سلطان محمد خاں نے انھیں بھی قتل کرا دیا۔

یہی نہیں کہ ان دو حق پرستوں کو شہید کیا گیا بلکہ بعد میں مجاہدین کے خلاف کفر کے فتوے کی پوری طرح تشہیر کی گئی۔ ایک وقت مقرر کیا گیا۔ اُس وقت جہاں جہاں بھی کوئی مجاہد موجود تھا اسے قتل کر دیا گیا۔ شاید ہی تھوڑے سے لوگ جان بچا کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو سکے۔

ایک مقامی روایت کے مطابق پشاور شہر کے کوہاٹی دروازے کے اندر گرجا گھر کے بالکل سامنے سڑک کے کنارے جو مزار ہے وہ اسی مردِ حق ارباب فیض اللہ خان کا مرقد ہے۔ تاہم بعض لوگ اس مزار کو کسی دوسرے بزرگ سے منسوب کرتے ہیں۔

سیّد احمد شہیدؒ

ہماری قومی تاریخ میں "تحریکِ مجاہدینؒ" کو بڑی اہمیت حاصل ہے اسے بجا طور پر برصغیر میں احیائے اسلام کی اولین کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی کے نزدیک "یہ ہند و پاکستان کی ملتِ اسلامیہ کی زندگی میں سب سے پہلا اقدام اور مسلمانوں کی قومی نوعیت کی پہلی تحریک ہے"۔ سید مسعود عالم ندوی اسے "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" قرار دیتے ہیں ۔ ابو الحسن ندوی اس تحریک کے سرفروشوں کی قربانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان کی صحیح اور محتاط تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی ہجری میں صحابہ کرامؓ کا نمونہ تھے۔ مدتوں کے جمود و سکون کے بعد اس تحریک نے مسلمانانِ ہند کے دلوں میں غلبۂ اسلام کی تڑپ اور جہاد فی سبیل اللہ کی امنگ پیدا کی اور وہ غیروں کی دست نگری کو ختم کر کے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے جان و مال کی قربانی دینے نکل کھڑے ہوئے۔

اگرچہ تحریکِ مجاہدین وسطی اور جنوبی ہند سے اٹھی تاہم اس کی سرگرمیوں کی اصل جولان گاہ صوبۂ سرحد ہی کی سرزمین تھی۔ صوبہ سرحد کو مرکز جہاد بنانے کے سلسلے میں امیر المجاہدین حضرت سید احمد بریلویؒ کے وہ الفاظ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جو پنجتار (ضلع مردان) میں علماء اور معززین سرحد کے ایک بہت بڑے

اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہے: انھوں نے کہا:

"میں نے خیال کیا کہ ہندوستان میں کوئی ایسی مامون جگہ ہو جہاں مسلمانوں کو لے جاؤں اور جہاد کی تدبیر کروں، باوجود اس وسعت کے سارے ہندوستان میں کوئی جگہ ہجرت کے لائق خیال میں نہ آئی۔ کئی لوگوں نے صلاح کہ ہندوستان ہی میں رہ کر جہاد کرو۔ جو کچھ مال خزانہ، اسلحہ وغیرہ درکار ہوگا ہم دیں گے مگر مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لیے کہ جہاد سنت کے مطابق ہونا چاہیے، بلوہ کرنا منظور نہیں، تمھارے علاقے (صوبہ سرحد) کے ولایتی بھائی بھی حاضر تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک جہاد کے واسطے خوب ہے، اگر وہاں چل کر قیام کریں تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان و مال سے آپ کا ساتھ دیں گے۔"

صوبہ سرحد کو مرکز جہاد بنانے کے فیصلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن ندوی کا کہنا ہے کہ

"سید صاحب کو ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے انتخاب میں اس بات نے بھی مدد دی ہوگی کہ افغانوں کی جواں مردی، سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت و تہوّر کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی۔ جو افغان (صوبہ سرحد سے جاکر) ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے تھے، وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے۔ اودھ کی فوج کا بڑا حصہ انہی پٹھانوں پر مشتمل تھا جو سرحد سے آئے تھے یا ان کے قریبی مورث وہاں سے منتقل ہوئے تھے، شاہِ اودھ کی فوج انہی پٹھان افسروں کی ماتحتی میں تھی۔ نواب فقیر خاں آفریدی، عبدالباقی خان قندھاری، بلند خان رسالدار یہ سب افغانی الاصل

اور سرحدی پٹھان تھے۔ خود نواب امیر خان والئ ٹونک اور اس کے اکثر سردار اور رفقاء پٹھان تھے، روہیل کھنڈ جو ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اور دینی حمیت کا بڑا مخزن تھا۔ اور وقتاً فوقتاً دہلی کو بھی تازہ خون اور نئی قوت عطا کرتا رہتا تھا، افغانوں سے آباد تھا۔ خود سید صاحب کے ارادت مندوں میں ایک کثیر تعداد افغانوں کی موجود تھی۔ ہندوستان میں بسنے والے ان پٹھانوں کے تعلقات اور رشتہ داریاں افغانستان اور سرحد کے افغانی قبائل میں تھیں، انھوں نے بھی سید صاحب کو اپنے وطن یعنی شمال مغربی صوبہ سرحد کو اپنی دعوتِ جہاد کا مرکز قرار دینے کا مشورہ دیا ہوگا اور اپنے اعزا اور اہلِ تعلق سے امداد کی امید دلائی ہوگی"۔

مشہور قومی کارکن عبداللہ ملک اس سلسلے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

"تحریکوں کے اجراء کے لیے تاریخی تسلسل اور ماضی کے واقعات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سید احمد اور ان کے رفقاء کو مرکزِ جہاد کی تلاش میں برصغیر کی تاریخ نے بڑی مدد دی ہوگی کیونکہ ہندوستان پر کوئی حملہ آور ایسا نہ تھا جو درّہ خیبر کی راہ سے نہ آیا ہو (اس میں صرف دو مستثنیات ہیں۔ محمد بن قاسم اور فرنگی) سید احمد بریلوی نے بھی ضروری سمجھا کہ ملک کی شمال مغربی سرحد پر ایک آزاد مرکز ایسا قائم ہو، جہاں پیچھے سے امداد پہنچتی رہے اور جہاں کے لوگ مجاہد پیشہ اور سپاہیانہ صفات کے حامل ہوں"۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ مجاہدین نے برِصغیر کے سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگانے اور انھیں نیا عزم اور بلند نصب العین عطا کرنے میں بڑا کام کیا۔

مسلمانوں کی جو تحریک بھی بعد میں اٹھی، تحریکِ مجاہدین سے ضرور متاثر رہی۔ یہاں تک کہ مسلمانانِ ہند نے اپنے لیے علیحدہ آزاد وطن کا مطالبہ کیا تو اس میں بھی "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کا بنیادی جذبہ ہی کارفرما نظر آیا۔

تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو تحریکِ مجاہدین کا وجود میں آنا وقت کی ایک اہم ترین ضرورت تھی۔ ۱۷۰۷ء شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا سالِ وفات تھا۔ اس کے بعد مسلمانانِ ہند کا شیرازہ کچھ ایسا بکھرا کہ وہ آسمانِ عروج سے گر کر پستی کی انتہاء کو پہنچ گئے۔ ہر جگہ خود سر سردار چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرکے بیٹھ گئے۔ انھیں عیش و عشرت، خانہ جنگیوں اور محلاتی سازشوں ہی سے فرصت نہ تھی۔ مسلمان دینِ حق کے صراطِ مستقیم سے دور جا پڑے۔ ایک بھی ایسی اسلامی ریاست نہ رہی جس کی روحِ حیات میں بالیدگی کی کوئی جھلک نظر آتی، حالت یہ تھی کہ ایک دنیا مر چکی تھی اور دوسری میں پیدا ہونے کی سکت نہ تھی۔ "جہانِ تازہ" کی نمود کے لیے "افکارِ تازہ" کی ضرورت تھی لیکن یہاں تو مایوسی اور نامرادی کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے نہ دلوں میں امنگ تھی نہ ذہنوں میں روشنی۔

ایسے میں امید کی ایک کرن پھوٹی، شاہ ولی اللہؒ جیسے عظیم مفکرؒ نے اپنے اردگرد کے معاشرے پر نظر ڈالی اور اس کی اصلاح کی کوششوں میں لگ گئے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام محض عقائد و رسوم کا نام نہیں بلکہ یہ دینِ انسانیت کی تکمیل کے لیے ایک مکمّل اور قابلِ عمل ضابطۂ حیات ہے۔ انھوں نے عوام کی بیداری کے لیے کام کیا، معاشرتی عدل اور معاشی خوش حالی برپا کرنے کی کوشش کی، بادشاہِ وقت کو عوامی بہبود کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھا:

"ان سب کی بھلائی کے لیے کام کیا جائے۔ ان کی خوشحالی ہی سے ملک مضبوط اور مستحکم ہوگا۔"

لوٹ کھسوٹ کرنے والے امراء اور سرکاری عمال کو متوجہ کیا کہ اپنے مال میں نادار عوام کو بھی برابر کا شریک سمجھیں اور دولت کی مساوی تقسیم کے اصول کو اپنائیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا۔

"اگر دولت چند ہاتھوں میں اکٹھی ہو جائے گی تو قوم میں بے اطمینانی پھیلے گی"۔

انھوں سے سب سے بڑا انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ قرآن کریم کا آسان فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ عوام قرآنی تعلیمات کی رُوح کو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ صحیح معنوں میں آزادی کے مجاہد تھے۔ انھوں نے برّصغیر کے مسلمانوں کو مایوسی اور بد دلی سے بچایا۔ انھیں نیا عزم اور حوصلہ عطا کیا اور انھیں آگے بڑھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کا سبق سکھایا۔

شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے تعمیر ملّت کے پروگرام کو آگے بڑھایا۔ وہ سوئی ہوئی قوم کو فرنگی حکومت کے خلاف جہاد کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے مگر اتنی بڑی طاقت سے کھلم کھلا ٹکراؤ سے بھی بچنا چاہتے تھے، انھوں نے نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے یہ فتویٰ جاری کیا کہ "برّصغیر کے مسلمان اب دارالحرب میں ہیں"۔ اس فتوے کے مطابق اب مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو ہندوستان سے ہجرت کر جائیں یا پھر غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے میدانِ جہاد میں نکلیں۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ فتویٰ اصل میں جنگِ آزادی کا پہلا اعلان تھا۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک مسلمانوں کو بیدار کرنے میں کوشاں رہے۔

شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کی تحریک ایک فکری تحریک تھی۔ انھوں نے قوم کو افکارِ تازہ کی دولت بخشی جس سے عوام میں اپنی عظمتِ رفتہ کی

بازیابی کا جذبہ بیدار ہوا۔ تاہم اس تحریک جہاد کو صحیح معنوں میں خاندان ولی اللہی کے فیض یافتہ مجاہد سید احمد بریلوی نے آگے بڑھایا، انھوں نے فکر کو عمل میں ڈھال دیا اور ایک ایسی تنظیم قائم کی جو ہر اعتبار سے برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی عوامی تحریک تھی۔

امیر المجاہدین سید احمد رائے بریلی (ہندوستان) کے ایک ایسے سادات گھرانے میں ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے جو اپنے زہد و تقویٰ اور روحانی کمالات کی وجہ سے انتہائی عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ سید احمد جسمانی طور پر ایک باوقار شخصیت کے مالک، شروع سے انھیں مردانہ کھیلوں اور فن سپہ گری کا بہت شوق تھا، والدین نے انھیں دینی تعلیم کے لیے مختلف درس گاہوں میں بھیجا لیکن انھیں تو عسکری تربیت حاصل کرنے کا شغف تھا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نواب امیر خان آف ٹونک کی فوج میں شامل ہو گئے۔ تھوڑی ہی مدت میں سید احمد لشکر میں بہت ہر دلعزیز ہو گئے اور ان کے زہد و شوق عبادت کی وجہ سے نواب امیر خان بھی ان کا بہت احترام کرنے لگے۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ وہ نواب پر اثر انداز ہو کر اسے اسلامی جہاد کے لیے تیار کر لیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ بہر حال نواب امیر خان کی فوج میں سات سال تک رہنے سے سیّد صاحب میں وہ تمام عسکری صلاحیتیں اور قائدانہ خوبیاں پیدا ہو گئیں جو آگے چل کر ان کے بہت کام آئیں۔

نواب امیر خان کی ملازمت چھوڑنے کے بعد سیّد احمد ایک بار پھر دہلی آئے اور شاہ ولی اللہ کے گھرانے کے مہمان بنے۔ اس بار ان کا خیال تھا کہ دینی علوم کی تکمیل کریں لیکن قدرت کو ان سے بہت بڑا کام لینا تھا۔ دہلی آئے تو ان کی خدا داد صلاحیتیں کمال پر پہنچ چکی تھیں۔ وہ روحانیت کے بلند مقام

پر فائز تھے، جو دیکھتا وہ ان کے کمالات کا قائل ہو جاتا۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کا ہجوم ہو گیا۔ یہاں تک کہ مولوی محمد یوسف پھلتی (جو اپنے وقت کے جیّد عالم اور شاہ ولی اللہ کے بڑے بھائی شاہ اہل اللہ کے پوتے تھے) بھی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ بعد میں شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی جیسے عالی قدر علماء نے بھی ان کی بیعت قبول کر لی۔ رفتہ ان کے ارادتمندوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔ وہ لوگوں کو اصلاح رسوم، پابندیٔ سنت، نکاح بیوگان اور قیام الصلوٰۃ کی تلقین کرتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دین کا غلغلہ بلند ہوا اور مسلمانوں کی قوت بڑھتی گئی۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کو کسی تحریک کی قیادت کرنا ہوتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی اس تحریک کی بنیادی تعلیمات کا عملی نمونہ ہو، سیّد احمد شہید کی پوری زندگی میں یہ بات نمایاں رہی کہ انھوں نے جو بات دوسرے لوگوں کو کہی ہے وہ پہلے خود کی ہے۔ انھوں نے اپنے خاندان کی بیوہ خواتین کے نکاحِ ثانی کرائے۔ خود اپنی بیوہ بھاوج سے شادی کی۔ وہ قریہ قریہ بستی بستی جاتے اور لوگوں کو اسلام کی عملی زندگی کی طرف بلاتے۔ اس زمانے میں لوگوں نے راستے کی بدامنی وغیرہ کو بہانہ بنا کر حج پر جانا ترک کر رکھا تھا۔ سید صاحب کے وعظ و نصیحت سے لوگوں کے دلوں سے موت کا خوف دور ہو گیا چنانچہ جب انھوں نے کلکتہ سے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو سینکڑوں لوگ ساتھ ہو گئے۔ قریباً ایک سال تک سیّد صاحب نے سرزمینِ حجاز میں قیام کیا۔ بالآخر ۲۹ / اپریل ۱۸۲۴ء کو وطن واپس آئے۔ ان کے وعظ و نصیحت کی یہ تاثیر تھی کہ جو کوئی ایک مرتبہ ان سے ملتا عمر بھر کے لیے اطاعت گزار ہو کر رہ جاتا۔

ان دنوں حالت یہ تھی کہ فرنگی اور سکھ ہر جگہ مسلمانوں کو دبا رہے تھے۔ حکومت تو کھوئی جا چکی تھی اب معیشت کی راہیں بھی ان پر تنگ کر دی گئی تھیں۔ عامۃ المسلمین پنجرے کے پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ دماغ ماؤف تھے۔ دل بجھ چکے تھے اور ہر طرف مایوسی اور تاریکی مسلط تھی۔ ایسے میں بقول غلام رسول مہر (مرحوم) سید صاحبؒ کے سامنے تین راستے تھے۔

۱۔ حق کو چھوڑ کر باطل سے رشتہ جوڑا جائے۔

۲۔ حق کو چھوڑا نہ جائے اور اس سلسلے میں جو مصیبتیں پیش آئیں انھیں صبر و استقلال سے برداشت کیا جائے۔

۳۔ باطل کا مقابلہ مردانہ وار کر کے ایسی صورتِ حال پیدا کرنے کی سعی کی جائے کہ حق کے لیے غلبۂ اسلام کی فضا پیدا ہو جائے۔

یہ تیسرا راستہ ہی غیرت و حمیت اور ہمت و عزیمت کا راستہ تھا اس لیے سید صاحب نے یہی راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے اپنے مریدوں کو عسکری تربیت دی، انھیں اسلحہ کے استعمال اور طریقِ جنگ کے اسرار و رموز سمجھائے، دین کی راہ میں ہجرت اختیار کی۔ گھر بار اور عزیز و اقارب چھوڑے۔ ٹونک سے روانہ ہوئے اجمیر، دہلی، کرنال، مالیر کوٹلہ، بہاول پور، حیدرآباد سندھ اور شکارپور سے ہوتے ہوئے درۂ بولان کی راہ افغانستان میں داخل ہوئے۔ جہاں جاتے جہاد کی تبلیغ کرتے جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہوتے گئے۔ قندھار اور کابل سے ہو کر ۱۸۲۶ء میں پشاور کے علاقے میں داخل ہوئے۔ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء کو انھوں نے اکوڑہ خٹک میں مقیم سکھ فوج پر کامیاب شبخون مارا۔ جس سے ان کی دھاک بیٹھ گئی اور مقامی لوگ جوق در جوق ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

پشاور پر ان دنوں کابل کے سرداروں کی حکومت تھی۔ سردار یار محمد خان، سردار سلطان محمد خان اور ان کے بھائی برسرِ اقتدار تھے۔ وہ بظاہر تو سیّد احمدؒ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتے لیکن درپردہ اپنی حکومت کو بچانے کے لیے سکھوں تک سے جوڑ توڑ کرنے کو بھی معیوب نہ سمجھتے تھے۔ شیدو کے معرکہ میں یہی ہوا۔ مجاہدین جان کی بازی لگا کر سکھوں سے مقابلہ کرتے رہے، لڑائی اپنے جوبن پر تھی کہ کابلی سردار اپنے لاؤ لشکر سمیت میدان خالی کر گئے اور یوں مجاہدین جیتی ہوئی بازی ہار گئے۔

صوبہ سرحد کی مقامی سیاست بھی ایک گورکھ دھندا تھی۔ جگہ جگہ الگ الگ حکومت تھی۔ ہر جگہ کا خان الگ تھا۔ ان خوانین میں سے اکثر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ مجاہدین ایک کا ساتھ دیتے تو دوسرا بگڑ بیٹھتا۔ مقابلے میں سکھ لشکر پوری طرح منظّم تھا۔ اسے یورپی جرنیلوں الارڈ، ونٹورا، اور ایوٹیبل نے تربیت دے رکھی تھی۔ مجاہدین کو سکھوں سے بھی لڑنا پڑتا تا۔ سرداران پشاور سے بھی اور مقامی خوانین سے بھی۔ زمانۂ جہاد کا سب سے فیصلہ کُن مرحلہ ۱۸۳۰ء میں طورو مایار (نزد مردان) میں لڑا گیا جس میں درّانی لشکر چار ہزار پیادوں اور آٹھ ہزار سواروں پر مشتمل تھا جب کہ مجاہدین کی کل تعداد تین ساڑھے تین ہزار تھی۔ اس معرکہ میں بھی مجاہدین کامیاب رہے جبکہ سردار یار محمد خان زخمی ہوا اور زخموں کی تاب نہ لا کر دنیا سے چل بسا۔

اس معرکہ کے بعد سردارانِ پشاور کی ہمت جواب دے گئی اور مجاہدین نے بڑی آسانی سے صوبائی دارالحکومت پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ تاہم انتہائے سادگی سے سید احمد اور ان کے رفقاء درّانی حکمتِ عملی سے مات کھا گئے، سردار سلطان محمد خان سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ آئندہ علاقے میں اسلامی شریعت کے مطابق قوانین

نافذ کرے گا۔ سید احمد نے پشاور کی حکومت دوبارہ اسی کے ہاتھ میں دے دی۔ البتہ نفاذ شریعت کے لیے قاضی مظہر علی کو قاضی شہر مقرر کیا۔ اس واقعہ کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ سردار سلطان محمد خان نے قاضی مظہر علی کو بلایا اور اس سے جواب طلبی کی کہ سردار یار محمد کو کیوں مارا گیا ہے؟ قاضی صاحب نے جواب گیا دیتا تھا، بیسیوں تلواریں بیک وقت ان پر ٹوٹ پڑیں اور ان کی تکا بوٹی کر دی۔ اسی پر اکتفا کرتے تو بات بھی تھی، چند دنیا دار علماء کو بلا کر ان سے مجاہدین کے خلاف کفر کا فتویٰ حاصل کر لیا گیا اور انھیں واجب القتل قرار دے دیا گیا۔ پھر ایک وقت تعین کیا گیا۔ عین اس وقت پہاڑیوں پر الاؤ روشن کیے گئے، لوگ بندوقیں اور تلواریں لے کر نکل پڑے اور جہاں جہاں کوئی مجاہد نظر آیا قتل کر دیا۔ اس قتل عام کے بعد امیر المجاہدین کا دل ٹوٹ گیا۔ انھوں نے باقی ماندہ ساتھیوں کو لیا اور دریائے سندھ کے مشرق کو بالائی ہزارہ کی طرف نکل گئے۔ جو ڈیڑھ دو سو کے قریب غریب الوطن مجاہدین مسلمانوں کے ہاتھ سے بچ گئے وہ سکھ فوج کے جال میں پھنس گئے۔ مجاہدین مانسہرہ کے شمالی قصبہ بالاکوٹ میں پناہ لیے ہوئے تھے کہ سکھ حکمران مہاراجہ شیر سنگھ نے انھیں گھیرے میں لے لیا۔ سکھوں کی فوج پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی اس کے پاس توپ خانہ بھی تھا تاہم مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایک ایک مرد مومن نے بیسیوں کافروں کو تہ تیغ کیا۔ وہ ایک ایک کر کے داد شجاعت دے کر جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کا سورج غروب ہوا تو شہداء کے خون سے سارا علاقہ لالہ زار بن چکا تھا۔

مجاہدین کی عظمت و استقامت کا اندازہ ان معرکوں سے لگایا جا سکتا ہے جو انھیں پیش آئے۔ مثلاً اکوڑہ خٹک کی جنگ میں سکھوں کی فوج پانچ اور دس

ہزار کے درمیان تھی اور اس کے پاس عمدہ توپ خانہ بھی تھا جبکہ مجاہدین چند سو کی تعداد میں تھے تاہم وہ سرخرو رہے ۔۔۔ زیدہ کی لڑائی میں یار محمد خان کا لشکر آٹھ دس ہزار سے کم نہ تھا لیکن صرف سات سو مجاہدین نے اسے شکست فاش دی۔ اس معرکے میں صرف دو مجاہد شہید اور دو زخمی ہوئے۔ مایار کی لڑائی میں درانیوں کے پاس چار ہزار پیادہ اور آٹھ ہزار سوار تھے جبکہ مجاہدین صرف تین ساڑھے تین ہزار تھے۔ تب بھی میدان مجاہدین کے ہاتھ رہا۔

مولانا غلام رسول مہر نے "سیرت احمد شہید" میں بعض واقعات کی تصویر کشی نہایت عمدہ پیرایہ میں کی ہے جن میں سے دو اقتباس یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

"عبدالرحمن دکنی سواروں میں سے تھے۔ اعلیٰ درجے کے پھکیت اور بھرمار تھے۔ جب سید صاحب کے سوار درانیوں کے ہجوم میں الجھ کر پیچھے ہٹے تو عبدالرحمن اپنی جگہ پر جمے ہوئے ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، کچھ دیر تک گھوڑے پر بیٹھے بندوق سے فائر کرتے رہے۔ پھر اتر بیٹھے اور قواعد بھرماری سے بندوق چلانے لگے۔ آٹھ نو درانی سواروں نے انھیں نرغے میں لے لیا۔ آخر بہادر عبدالرحمن نے بندوق چھوڑ کر تلوار سنبھالی۔ تنہا نو دس سواروں کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے رہے کہ اکثر کو زخمی کیا اور خود محفوظ رہے۔ ایک درانی سوار نے تاک کر پیچھے سے نیزہ مارا، یہ گرے تو اس نے تلوار سے سر قلم کر دیا۔"

"رسالدار عبدالحمید خان کو بلا حکم حملہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ جب حاجی عبدالرحیم نے محبت و عقیدت کے جوش میں خود حملہ کر دیا تو مولوی احمداللہ ناگپوری، محمد سعید خان عظیم آبادی اور قاضی مدنی وغیرہ جو

رسالدار کے قریب کھڑے تھے، سمجھے کہ حملے کا حکم ہوگیا۔ اس پر رسالدار نے بھی حملہ کردیا۔ جنگ مایار کے دن اپنے سمند (گھوڑے) پر سوار تھے، جس طرف باگ اُٹھا کر جاتے صفوں کی صفیں پلٹ دیتے۔ ساتھیوں نے بعد میں بیان کیا کہ بار بار کہتے تھے کاش آج سبزہ گھوڑے پر سوار ہوتا تو دل کے ارمان نکل جاتے۔ تین چار مرتبہ ساتھیوں کو لے کر دشمن کے لشکر میں گھسے اور تلواریں مارتے پار نکل گئے۔ رسالدار کے بھی زخم لگتے رہے۔ جب زخموں سے چُور ہو گئے تو گھوڑے سے گر پڑے جسم ذرا فربہ تھا زرہ کی کڑیاں گوشت میں گھس گئی تھیں۔ انھیں میدان سے اٹھا کر مایار میں لایا گیا جس کی نظر اپنے محبوب رسالدار پر پڑتی بے اختیار اشکبار ہو جاتا۔"

ان ایثار پیشہ سرفروشوں پر خود سید احمد فخر کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے لکھا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ مخلص مومنوں کے دل میں نہ فتح کے وقت تکبر پیدا ہوتا ہے نہ شکست کے وقت ان میں انتشار اور افسردگی آتی ہے۔ کیونکہ وہ جہاد کو ایک فرض سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔"

یہ انہی سرفروشوں کا لہو تھا جس نے نہ صرف سکھ سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ برِ صغیر کی ہر اسلامی تحریک کو پوری طرح متاثر کیا۔ دیکھا جائے تو بنگال کی فرائضی تحریک اور مسلمان کسانوں کی جدوجہد آزادی اصل میں تحریک مجاہدین ہی کا تتمہ تھیں، یہاں تک کہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد بھی اکثر مجاہدین اپنے گھروں کو واپس نہیں گئے۔ صوبہ سرحد ہی کے شمالی پہاڑوں میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور مولوی عنایت علی عظیم آبادی نے

اس پرچم جہاد کو مدتوں بلند رکھا جو شاہ اسمٰعیل اور حضرت سیّد احمد نے لہرایا تھا۔ کبھی وہ ستھانہ میں اپنا مرکز قائم کرتے کبھی تدکا میں، کبھی چمرقند میں تو کبھی علاقہ مہمند میں ـــ قیام پاکستان تک ایک نہ ایک رنگ میں ان سرفروشوں نے فرنگی سامراجیوں کے خلاف محاذ قائم کیے رکھا۔ اور دنیا کی جابر ترین طاقت برطانیہ، بھی انھیں دبانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

مولانا غلام رسول مہر نے کیا پتے کی بات کہی ہے:ـ

"تاریخ ہند کے اوراق کو خوب کھنگال لو، پھر یہ بتاؤ کہ کیا کوئی ایسی جماعت مل سکتی ہے جس نے احیائے دین، اعلائے کلمۃ الحق اور آزادی بلادِ مسلمین کے لیے ایسی صعوبتیں دلی عشق و شیفتگی کے ساتھ قبول کی ہوں جس طرح سید احمد شہیدؒ کی جماعت نے قبول کیں۔"

○

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

"سارے ملک میں جہاد کی آواز گونج اٹھی، ہمالہ کی چوٹی سے بنگال کی وادی تک کے مسلمانوں کے دل آزادی کے جذبے سے سرشار ہو گئے۔ لوگ دوڑے آتے اور مجاہدوں کے جکتّش میں شامل ہوتے...

..... علماء اپنے حجروں سے اور امراء اپنے محلوں سے باہر نکل آئے۔ غربت، مجبوری اور سیاسی ابتری کے باوجود مسلمانوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔"

نامور دانشور اور مشہور مؤرخ سیّد سلیمان ندوی کی رائے میں اس انقلاب کا سہرا سیّد احمد شہید اور ان کے جانثار ساتھی شاہ اسمٰعیل شہید کے سر ہے۔ تحریک مجاہدین کی زمام جہاد یوں تو سیّد احمد کے ہاتھ میں تھی تاہم اس کے فکری رہنما شاہ اسمٰعیل ہی تھے جو مجدد وقت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کے پوتے، شاہ عبد الغنی کے بیٹے اور شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے بھتیجے اور دہلی کے سب سے سربرآوردہ علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاہ اسمٰعیل وہ مہر عالمتاب تھا جو ۲۹ اپریل ۱۷۷۹ء کو دارالسلطنت دہلی سے ابھرا اور ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو صوبہ سرحد کے مقام بالاکوٹ میں غروب ہو گیا۔ جہاد کے سلسلے میں ان کا میدانِ تگ و تاز سرحد ہی کی سرزمین تھی۔

شاہ اسمٰعیل بڑی خوبیوں کے انسان تھے، اتنے ذکی الطبع کہ بچپن میں جو کچھ پڑھتے ذہن نشین ہو جاتا۔ دینی علوم سے طبعی لگاؤ تھا کہ اس گھرانے کا ہر فرد علم و دانش کا ایک سمندر تھا۔ بڑے سے بڑا مسئلہ پیش ہوتا تو وہ فوراً حل کر دیتے۔ نو عمری ہی میں ایک بار شاہ عبدالعزیز کے فتوے پر اصلاح دی تو بڑے بوڑھے بھی حیرت میں پڑھ گئے۔ اب تک اس خاندان نے علمی میدان ہی میں عوام کی خدمت کو اپنا وظیفۂ حیات بنا رکھا تھا۔ لیکن شاہ اسمٰعیل اس خانوادے کے پہلے شخص تھے جنھوں نے تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ جہاد کی تربیت کا حصول بھی ضروری سمجھا۔

اپنی خدا داد استعداد کی بناء پر شاہ اسمٰعیل پندرہ سولہ سال ہی کی عمر میں منقول و معقول کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ پھر انھوں نے فوجی کرتب، تیر اندازی، نشانہ بازی گھڑ سواری اور شمشیر زنی کی تربیت حاصل کی۔ اس میدان میں بھی بڑے بڑوں نے ان کا لوہا مانا۔ وہ ایک سانس میں تیر کر جمنا کو عبور کر لیتے تھے۔ نشانہ بازی میں وہ مہارت بہم پہنچائی کہ ان سے اڑتی ہوئی چڑیا کا بچ نکلنا مشکل تھا ــــ

جب تحریکِ جہاد کا آغاز ہوا تو شاہ عبدالعزیز بڑھاپے کی وجہ سے اس میں شامل نہ ہو سکے تاہم انھوں نے شاہ اسمٰعیل کو امیر المجاہدین سید احمدؒ کے حوالے کر دیا۔ مجاہدین کا انقلابی قافلہ دورے پر روانہ ہوا تو شاہ اسمٰعیل اپنے علمی مرتبے اور مقام کے باوجود ایک شاگرد کی حیثیت سے سایہ کی طرح سید احمد شہید کے ساتھ رہے۔ ان سے عہد وفا نبھایا اور آخر میں انھیں کے ساتھ شہادت کا مرتبہ پا کر جنت الفردوس میں جا پہنچے۔

پھر شاہ اسمٰعیل نے جہاد بالسیف ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اصلاح و ارشاد کا فریضہ بھی انجام دیا۔ جہاں کسی بد عقیدہ اور بد عمل گروہ کی خبر پاتے، بے تکلف

وہاں پہنچ جاتے۔ جامع مسجد دہلی میں وعظ کرتے تو دُور دُور سے ہزاروں لوگ سننے آتے۔ ان کے وعظ و نصیحت کی بدولت ہر شخص دینی شعار کا پابند ہو گیا۔ شرک و بدعت کی بنیاد منہدم ہو گئی۔ مسجدیں نمازیوں سے بھر گئیں۔ وہ جو کہتے خود اس پر عمل کرتے۔ سید صاحب نے نکاح بیوگان کی تلقین کی تو شاہ اسمٰعیل نے اپنی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح بغرض احیائے سنت سید عبدالحی سے کر دیا۔ کفار سے جہاد کا وقت آیا تو وہ سر ہتھیلی پر رکھ کر سید صاحب کی قیادت میں نکل پڑے۔

ان کی خدمات جہاد کو مولانا غلام رسول نے یوں بیان کیا ہے :۔

"دوران قیام سرحد میں وعظ و تذکرہ ، دعوت و اعلام ، دفاع و اقدام تدبیر و سیاست وغیرہ تمام مشاغل میں وہ (شاہ اسمٰعیل) پیش پیش رہے ، مختصراً ان کے نمایاں کارنامے یہ تھے :۔

۱۔ ہنڈ کے مقام پر صوبہ سرحد کے علماء اور خوانین سے بہ سلسلۂ امامت تمام مذاکرات شاہ صاحب ہی نے کیے تھے۔

۲۔ جنگ شیدو کے آغاز سے پہلے دشمنوں نے سید احمد بریلوی کو زہر دے دیا تھا ، اور نیم بے ہوشی کے عالم میں انھیں ہاتھی پر سوار کر دیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے یہ دیکھا تو خود سید صاحب کے ساتھ سوار ہو گئے۔ ہاتھی کو میدان جنگ سے باہر لے گئے ، چپکے سے سید صاحب کو ایک گھوڑے پر سوار کر دیا اور ایک جماعت کے ہمراہ کسی محفوظ مقام کی طرف بھیج دیا لیکن خود ہاتھی ہی پر سوار رہے ، درانیوں کے فرار کے بعد سکھ فوجیوں نے اس ہاتھی کا تعاقب کیا تو شاہ اسمٰعیل اُتر کر کسی طرف نکل گئے۔ اس طرح اس نازک موقع پر سید احمد کی جان شاہ اسمٰعیل ہی کی بصیرت اور عزیمت کی بدولت بچی۔

۳۔ ہزارہ میں محاذِ جنگ کی ابتدائی تنظیمات انھوں نے ہی کیں۔

۴۔ شنکیاری کی جنگ میں تھوڑے سے رفیقوں کے ساتھ سکھوں کے بہت بڑے گروہ کو شکست دے کر بھگا دیا۔ شاہ صاحب کی قبا غنیم کی گولیوں سے چھلنی ہو گئی اور ہاتھ کی چھنگلیا پر سخت زخم لگا لیکن اللہ نے انھیں فتح و نصرت سے ہم کنار کیا۔

۵۔ صوبہ سرحد کے اڑھائی ہزار سرکردہ علماء اور خوانین کو شاہ صاحب ہی نے بیعتِ اقامتِ شریعت کے لیے آمادہ کیا۔

۶۔ تھوڑے سے غازیوں کے ساتھ ہنڈ کا مستحکم قلعہ فتح کیا۔

۷۔ زیدہ کی جنگ میں صرف سات سو غازیوں کے ساتھ یار محمد خان پر فتح پائی جس کے پاس دس ہزار فوجی اور سات سو توپیں تھیں۔ اتنے بڑے معرکہ میں صرف دو غازی شہید ہوئے۔

۸۔ پائندہ خاں تنولی کو شکست دے کر امب اور عشرہ پر قبضہ کر لیا۔

۹۔ مایار (ضلع مردان) کی جنگ میں تین ہزار غازیوں کے ساتھ (جن میں سے اکثر نوآموز مقامی لوگ تھے) آٹھ ہزار درانیوں کو شکست دی۔

۱۰۔ فتح پشاور کے بعد سردار سلطان محمد خان درانی سے صلح کی گفتگو میں سید احمدؒ نے شاہ اسمٰعیل ہی کو مختار بنایا تھا۔"

وزیر الدولہ کا بیان ہے کہ شاہ صاحب کو کوئی ایسی بیماری تھی جس کی وجہ سے کبھی کبھی دو دو دن تک سو نہ سکتے تھے لیکن اس حال میں بھی جب سیّد صاحب کا کوئی حکم جہاد کے بارے میں پہنچ جاتا تو فوراً ہتھیار ڈال کر ڈٹ جاتے۔ سیّد صاحب نے انھیں سواری کے لیے ایک گھوڑا دے رکھا تھا لیکن

عادت یہ تھی کہ پیدل چلتے اور اپنے گھوڑے پر کسی دوسرے کو سوار کر دیتے نیت یہ ہوتی کہ خدا کا کام ہے اپنے جسم کو جتنی مشقت میں ڈالیں گے اتنا ہی ثواب ہوگا۔ اگرچہ جسم کمزور تھا لیکن ہر موقع پر کمال درجہ کی عزیمت و استقامت کا ثبوت دیتے۔

سید صاحب سے اگرچہ انتہائی عقیدت تھی اور ان کا ادب بھی بہت کرتے تھے تاہم شرعی اور جماعتی معاملات میں اپنی رائے اس بے باکی سے ظاہر کرتے کہ ایک مرتبہ خود سید صاحب نے اعتراف کیا کہ امرِ حق کے اظہار میں ایسی بے باکی میں نے اپنے بھانجے سید احمد علی کے سوا کسی میں نہیں دیکھی۔

شاہ اسمٰعیلؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ اصلاح و ارشاد کے لیے وقف تھا۔ بعد میں جمعیت مجاہدین میں شمولیت نے انھیں اور زیادہ مصروف رکھا تاہم انھوں نے تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔ "ردالاشراک" "تقویت الایمان"، "منصب امامت" اور "عبقات" وغیرہ بڑی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔

خدمتِ دین میں ان کا انہماک اس پیمانے پر پہنچ گیا تھا کہ کھانے اور لباس تک کی پرواہ نہ تھی۔ سفرِ حج کے دوران کلکتہ پہنچے اور منشی امین الدین۔ وکیل کمپنی ان سے ملنے آئے تو لباس اتنا معمولی پہن رکھا تھا کہ منشی صاحب کو یقین نہ آیا کہ شہرۂ آفاق شاہ اسمٰعیل یہی ہیں۔

دورانِ قیام پشاور کچھ مولوی صاحبان کچھ اہم مسائل پوچھتے آئے تو شاہ اسمٰعیل گھوڑے کو کھریرا کر رہے تھے، اپنا کام بھی کرتے جاتے تھے اور ان کے مسائل کا جواب بھی دیتے جاتے تھے۔ جزئیاتِ فقہ اس انداز میں بیان کرتے تھے کہ مشہور اور نامور فقیہ سن کر دنگ رہ جاتے۔

اپنے زمانے کے جید عالم تھے، چاہتے تو زندگی بڑی آسائش سے گزار سکتے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ گوشہ نشینی اختیار کرنے کی بجائے علماء و صلحاء کو باہر نکل کر ایک صحیح اور صالح اسلامی معاشرے کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے۔ بالخصوص غیر مسلم حکمرانوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کو عملاً اپنانا چاہیے۔

وہ اسلام کی ان پاکباز ہستیوں میں سے تھے جو دینِ حق کی سربلندی کے لیے زندہ رہیں اور اسلام ہی کی راہ میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء ان کی حیاتِ مستعار کا آخری دن تھا۔ اس وقت کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ سر یا کنپٹی پر گولی کا خفیف زخم تھا۔ ڈاڑھی خون سے تر ہو گئی تھی۔ سر ننگا تھا۔ بھری ہوئی بندوق کندھے پر تھی اور ننگی تلوار ہاتھ میں۔ ایک ہجوم میں گھس گئے پھر کسی نے انھیں زندہ نہ دیکھا۔ جنگ کے بعد نعش سید احمد کی شہادت گاہ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر بالاکوٹ کے شمال میں ست بنے نالے کے پار ملی۔ وہیں انھیں دفن کیا گیا۔ اب قبر کو پختہ کر دیا گیا ہے۔

سید احمد شہیدؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، ارباب بہرام خان شہید، اور ان کے ساتھیوں نے اپنے لہو سے جو چراغ جلائے انھوں نے برِ صغیر کے مسلمانوں کو روشنی بخشی، حوصلہ دیا اور دین کی سربلندی کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا سبق سکھایا — اور دنیا نے دیکھا کہ ان کی قربانیاں رنگ لائیں اور آج اس سرزمین پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم نہایت آن بان سے لہرا رہا ہے۔

○

ارباب بہرام خان شہید

پشاور کے نواحی قصبے تہکال بالا کے ارباب خاندان نے قومی زندگی میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہر دور میں اس مردم خیز قصبہ سے بڑی بڑی نامور شخصیتیں اٹھیں۔ انہی میں سے ایک ارباب بہرام خان بھی تھے۔

"تاریخ پشاور" میں منشی گوپال داس کا کہنا ہے کہ سدوزئی اور سکھ حکمرانوں کے دور میں مختلف علاقوں (تپوں) کے لوگوں سے مالیہ کی رقم وصول کرنے کا اجارہ سرکردہ افراد کو دے دیا جاتا تھا۔ تپہ خلیل کا اجارہ تہکال کے ارباب صاحبان کے پاس تھا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"سرفراز خان کے مرنے پر بہرام خان کو منصب و مواجب حاصل ہوا۔ اس کی سردار سلطان محمد خان اور پیر محمد خان (سرداران پشاور) سے بن نہ آئی تو وہ جمرود چلا گیا اور اس کی جگہ جُمعہ خان نے لے لی، جب وہ بھی بارک زئی سرداروں کی خوشنودی حاصل نہ کر سکا تو گوجر خان کو ارباب مقرر کیا گیا۔ پھر عابد خان کی وفات پر زاہد خان نواب ہوا۔ سکھوں کی حکومت آئی تو ارباب صاحبان خیبر کو چلے گئے، وہاں سے نکلے تو امیر دوست محمد خان کے دربار میں پہنچ گئے۔ ہری سنگھ نلوہ علاقے کا حاکم قرار پایا تو اس نے کسی طرح محمد خان ولد معاذ خان کو جو بہرام خان

کے ساتھ جمرود چلا گیا۔ واپس بلایا اور نہ صرف سارے تپہ خلیل کا ارباب مقرر کر دیا بلکہ "نواب" کا خطاب بھی دیا۔ اس واقعہ کے کوئی ایک ہی سال بعد جب قلعہ باڑہ کے قریب سکھو سرنید میں امیر دوست محمد خان اور رنجیت سنگھ کی فوجوں میں جنگ ہوئی تو نواب محمد خان (تہکال) نے امیر دوست محمد خان کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اس پر سکھ راجہ نے اسے معزول کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد جب سردار تیجا سنگھ پشاور کا حاکم بنا تو اس نے گوہر خان، عبدالحمید خان برادر زاہد خاں اور محمد امیر خان پسر حسن خان کو بلایا اور تینوں کو الگ الگ ارباب اور اجارہ دار مقرر کر دیا۔ محمد امیر خان کو نصر اللہ خان کی جگہ، عبدالحمید خان کو زاہد خان کی جگہ اور گوہر خان کو بہرام خان کی جگہ مقرر کیا گیا۔

یہی ارباب بہرام خان ہیں جنھوں نے آگے چل کر امیر المجاہدین سید احمدؒ کا بھرپور ساتھ دیا۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ "سید اکبر شاہ ستھانوی کے سوا اکابر سرحد میں کوئی بھی اخلاص، تدبّر اور وفاکیشی اور ایثار و حق کوشی میں ارباب بہرام خان کے برابر نہ تھا"

سید احمد بریلوی نے صوبہ سرحد کو اس لیے مرکز جہاد بنایا تھا کہ یہاں کے لوگ جنگی صلاحیتوں اور اسلامی حمیت کے اعتبار سے ہندوستان کے باقی لوگوں سے بہتر خیال کیے جاتے تھے۔ یہ لوگ سکھوں کے ہاتھوں تنگ آئے بیٹھے تھے۔ اگر اہل سرحد کھل کر مجاہدین کا ساتھ دیتے تو سکھوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر لیتے لیکن اس سلسلے میں تین رکاوٹیں تھیں :-

ا۔ پشاور میں بارک زئی سرداروں کی برائے نام حکومت تھی جو وقت پر ہمیشہ دوہری چال چلتے تھے۔

ب۔ سکھ لشکر انتہائی منظم اور اعلیٰ تربیت یافتہ تھا۔

ج۔ مقامی خان خوانین ـــ جو باہمی مناقشوں اور پرہ جنبوں کی وجہ سے کبھی ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکے تھے۔

سید احمدؒ بریلوی کا مقصدِ وحید جہاد کے جذبے کو زندہ کرنا اور علاقے میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا اس لیے انھوں نے صوبہ سرحد میں قیام جماتے ہی تمام سرکردہ خان خوانین اور رؤسا کو خط لکھے جن میں کہا گیا تھا کہ "جب اسلامی بلاد پر غیر مسلم مسلط ہو جائیں تو تمام مسلمانوں پر عموماً اور مسلمان حکمرانوں اور سرکردہ لوگوں پر خصوصاً یہ واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ و مقاتلہ کی کوششیں اس وقت تک جاری رکھیں جب تک ۔۔۔ اسلامی بلاد ان سے واپس نہ لے لیے جائیں بصورتِ دیگر مسلمان گنہگار ہوں گے۔ ان کے اعمال باری تعالیٰ کے ہاں قبول نہ ہوں گے اور وہ خود قربِ حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔"

ارباب بہرام خان شروع ہی سے بڑے دین دار اور مخلص انسان تھے لوگ ان کی اسلام دوستی اور حق پسندی کی وجہ سے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ انھیں امیرالمجاہدین سید احمد بریلوی کا یہ مکتوب ملا تو بڑے متاثر ہوئے اور انھوں نے مجاہدین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے بیس پچیس سواروں کو ساتھ لیا اور سید صاحب کے پاس جا حاضر ہوئے۔ سید صاحب ان دنوں پنجتار (ضلع مردان) میں مقیم تھے۔ ارباب صاحب نے اس موقع پر ایک سبزہ رنگ گھوڑا سید صاحب کی نذر گزارا جس کا نام "اژدہا" تھا اور مجاہدین اسلام کا ساتھ دینے

کا اعلان کیا۔ اس وقت سے لے کر اپنی شہادت تک سفر میں، حضر میں، نرمی میں، سختی میں ہر لمحہ اور ہر لحظہ انھوں نے سیّد صاحب کا ساتھ نبھایا۔ شہادت کے وقت بھی وہ اپنے امیر کے شانہ بشانہ مصروفِ جہاد تھے۔

ارباب بہرام خان ایک جہاندیدہ انسان تھے اس لیے سیّد صاحب ان کے مشوروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پنجتار ہی کے قیام کے دوران ارباب بہرام خان نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ "یہاں کوئی خاص مصروفیت تو ہے نہیں اگر مناسب سمجھیں تو گرد و نواح کے دیہات کا دورہ کریں، یہ لوگ پرہ جنبہ اور "ترلوردلی" کی وجہ سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، ان کی باہمی مصالحت کرا دیں۔ ان میں مروجہ خراب رسموں اور غلط عقائد کی اصلاح کی جائے تاکہ یہ لوگ پھر اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔ چنانچہ ارباب صاحب کے مشوروں پر عمل کیا گیا۔

۱۸۲۷ء کے موسم بہار میں سید صاحب ابھی پنجتار ہی میں مقیم تھے کہ ہندوستان سے مجاہدین کے بہت سے قافلے پشاور آن پہنچے۔ یار محمد خان اور سلطان محمد خان نے انھیں سیّد صاحب کے پاس جانے سے روکا۔ سیّد صاحب نے ملّا قطب الدین ننگرہاری، احمد گل بیگ اور ارباب بہرام خان کو جرگہ کے طور پر ان قافلوں کو لانے کے لیے کابلی سرداران پشاور کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ ان دنوں ارباب صاحب کے پاؤں میں چھالے نکل آئے تھے، چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے، خود تو نہ جا سکے البتہ انھوں نے اپنے آدمیوں کو جرگہ کے ساتھ بھیج دیا۔

علاقہ پشاور کے جن خان خوانین نے مجاہدین کا ساتھ دیا تھا پشاور کے بارک زئی سرداروں نے انھیں بہت تنگ کیا۔ ان کی زمینیں اور مکان ضبط کر لیے گئے اور ان کے رشتہ داروں کو بڑی تکلیفیں دی گئیں۔ ارباب بہرام خان

اور ان کے بھائی ارباب جمعہ خان، اُتمان زئی کے عالم خان اور تنگی کے محمود خان کو بھی بارک زئی سرداروں کے اسی غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔

مجاہدین کے لیے سکھوں سے مقابلہ اتنا مشکل نہ تھا جتنا پشاور کے مسلمان حاکموں سے۔ ان دنوں پشاور پر چار بھائیوں سلطان محمد خان، پیر محمد خان، سید محمد خان اور یار محمد خان کا تسلط تھا۔ یہ لوگ بظاہر مجاہدین کا ساتھ دیتے بلکہ حضرت سید احمدؒ سے بیعت بھی کیے ہوئے تھے تاہم اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے سکھوں سے ساز باز کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ایک بار جب یہ پتہ چلا کہ ان سردارانِ پشاور کو کابل سے کمک پہنچنے والی ہے، امیر المجاہدین نے طے کیا کہ ایک جماعت کو خیبر بھیجا جائے اور خیبری قبائل کی حمایت حاصل کی جائے تاکہ وہ کابل سے آنے والوں کو اپنے علاقے سے گزرنے نہ دیں۔ چونکہ خیبر اور نواحی علاقوں میں ارباب بہرام خان کا کافی اثر تھا اس لیے انھیں اپنے بھائی ارباب جمعہ خان اور پچاس ساٹھ دوسرے سرکردہ لوگوں کے ساتھ خیبر بھیجا گیا۔ اس وفد میں سید صاحب کے بھانجے سیّد احمد علی، مولوی مظہر علی، شیخ ولی محمد، شیخ علی محمد، مولوی محمد حسن اور نصیر الدین منگلوری بھی شامل تھے۔ ارباب صاحب نے اہل خیبر کے نام ایک اعلام نامہ اس مضمون کا بھیجا۔

"مجاہدین اسلام کی اعانت ایمان و انقیاد کی علامت ہے اور ان سے الگ رہنا نفاق و فساد پر مبنی ہے۔ اب بغی و طغیان کا دائرہ اتنا پھیل چکا ہے کہ نفاق و فساد کو مٹائے بغیر جہاد ممکن نہیں لہٰذا منافقوں کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اسے جہاد کا اعلیٰ مرتبہ سمجھو۔"

ارباب بہرام خان اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے خلیل اور مہمند قبائل

نے جہاد کی دعوت قبول کر لی یہاں تک کہ آزاد مہمند قبیلہ کے سربراہ سعادت خاں لالپوری نے بھی مجاہدین کی امداد و اعانت کا اعلان کر دیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

ایک بار ارباب بہرام خان کے آدمی یہ خبر لے کر آئے کہ دُرّانیوں (سردارانِ پشاور) کا لشکر دریائے لنڈہ (کابل) کو عبور کر کے اتمان زئی پہنچ چکا ہے، اس کا مدعا یہ ہے کہ مناسب موقع پا کر سیّد صاحب سے جنگ کی جائے۔ کئی لوگوں نے سید صاحب کو مشورہ دیا کہ مخالف لشکر کی آمد کا انتظار کرنے کی بجائے آپ خود پیش قدمی کریں اور پشاور پہنچ جائیں۔

سیّد صاحب کو یہ تجویز قبول کرنے میں توقف تھا، وہ خائف تھے کہ کہیں ان مقامی خان خوانین کے جھگڑوں میں ہی الجھ کر نہ رہ جائیں اور جہاد کا اصل مقصد نظر سے اوجھل ہو جائے۔

اپنے نئے اقدام کا فیصلہ کرنے سے پہلے سید صاحب نے سرحدی خوانین علماء اور عمائدین کا اجلاس بلایا جس میں ارباب بہرام خان، ارباب جمعہ خان، عنایت اللہ خان (الہ ڈھنڈ) زید اللہ خان (خار باجوڑ) محمود خان (گھڑیالی) منصور خان (چارگلئی) قاضی سید محمد حبان (اغور بند) مولوی عبدالرحمٰن (طورو) ملّا کلیم اللہ اخوندزادہ (خار باجوڑ) اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ اس جرگے نے غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ سرداران پشاور نے اطاعت قبول کرنے کے بعد بغاوت کا راستہ اختیار کیا ہے، اس لیے ان کا خون مباح ہے اور ان کے ساتھ جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پشاور پر قبضہ کیے بغیر نفاق و عداوت اور فتنہ کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا۔

مجاہدین کی سرگرمیوں کو زیادہ منظّم بنانے اور اپنی حکمتِ عملی کو صیغۂ راز میں

رکھنے کی خاطر بھی سیّد صاحب نے ارباب بہرام خان ہی پر اعتماد کیا۔ قلعۂ ہنڈ پر حملہ کے لیے سیّد صاحب نے تمام جماعتوں میں سے پانچ سو آزمودہ کار غازی چنے۔ شاہ اسمٰعیل کو ان کا امیر اور ارباب بہرام خان کو نائب امیر مقرر کیا صرف انہی دو حضرات کو علم تھا کہ حملہ کب ہوگا اور اس کا طریق کار کیا ہوگا؛ ارباب صاحب چونکہ اس علاقے کے ماحول سے بخوبی واقف تھے اس لیے قلعہ ہنڈ کی فتح کا سہرا اصل میں انہی کے سر ہے۔ اس نمایاں کامیابی کے بعد سارے علاقے میں مجاہدین کی دھوم مچ گئی۔

بعد میں پشاور کا حاکم سردار یار محمد خان بہت بڑا لشکر جرار لے کر مقابلے کو آیا۔ زیدہ ضلع مردان محاذِ جنگ قرار پایا۔ اس نازک وقت میں ارباب بہرام خان سائے کی طرح ہر وقت امیر المجاہدین کے ساتھ رہے۔ اس کے دوران بھی لشکر کی تنظیم اتنے عمدہ پیمانہ پر کی گئی تھی کہ مخالفین کو عبرتناک شکست ہوئی۔ سردار یار محمد خان مارا گیا۔ اس کے تین سو ساتھی بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جن میں سات بڑے بڑے سردار بھی شامل تھے۔ بہت سا مال غازیوں کے ہاتھ لگا اور دور دور کے علاقوں تک ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

جب مجاہدین کی تعداد بڑھی تو ایک رسالدار کے تقرر کی ضرورت پیش آئی۔ اس پر سید احمد علی نے حمزہ علی خاں لوہارو والے کا نام پیش کیا لیکن شاہ اسمٰعیلؒ اور ارباب بہرام خان نے عبد الحمید خان کو رسالدار بنانے کی تجویز پیش کی۔ امیر المجاہدین سید احمدؒ نے اس معاملے میں بھی شاہ اسمٰعیل اور ارباب صاحب ہی کی بات منظور کی۔

ارباب بہرام خاں میں ایک بہت بڑا وصف اطاعتِ امیر کا تھا۔ وہ امیر المجاہدین کی ہر بات پر لبیک کہتے۔ جس امر کا حکم پاتے بسم اللہ کہہ کر اس پر

عمل پیرا ہو جاتے۔ ہر معرکہ میں وہ سید صاحب کے ساتھ رہتے اور ان کی ہر خدمت بجالاتے۔ مایار کی جنگ میں کامیابی کے بعد ارباب صاحب نے سید صاحبؒ کے چہرے پر نگاہ دوڑائی تو وہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ ارباب صاحب نے رومال نکالا اور سید صاحب کے چہرے سے گرد پونچھ دی۔ جس پر سیّد صاحب نے کہا:۔ "ارباب صاحب! ٹھہر جائیے یہ گرد و غبار بڑی برکت والا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔"

۱۸۳۰ء میں مجاہدین نے پشاور کی طرف پیش قدمی کی، وہ دریائے کابل کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ پھر دریا کو عبور کر کے علاقہ خلیل کے گاؤں ریگی پہنچے، جہاں شیخ امام الدینؒ کا مزار ہے اور وہ خشک نالہ ہے۔ جہاں سلطان محمود غزنوی نے جے پال کے خلاف جہاد کیا تھا، ریگی پلوسی میں ارباب بہرام خاں کے عزیز و اقارب آباد تھے۔ انھوں نے سیّد صاحبؒ اور مجاہدین کی خدمت اور مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اب کے سرداران پشاور کو مجاہدین سے ٹکر لینے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس لیے مجاہدین بڑے رعب او ز وقار سے مارچ نگ کرتے ہوئے پشاور شہر میں داخل ہوئے۔ کسی لشکری نے کسی چیز کو نقصان نہ پہنچایا۔ ہر طبقہ کے لوگ سرداران پشاور کے ظلم و ستم سے تنگ آئے بیٹھے تھے۔ مجاہدین کی آمد پر وہ اللہ کا شکر بجا لائے۔ مجاہدین کابلی دروازہ سے شہر میں داخل ہوئے اور قصّہ خوانی، چوک یادگار اور بازار کلاں سے ہوتے ہوئے گورگھٹری پہنچے جہاں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ خود سیّد صاحب کو گورگھٹری کے صدر دروازے کے اوپر والے کمروں میں ٹھہرایا گیا۔ ارباب بہرام خان کی ڈیوٹی ڈیوڑھی پر تھی۔ کوئی شخص ان کی اجازت کے بغیر امیر المجاہدین حضرت سیّد احمد سے مل نہیں سکتا تھا۔

ارباب صاحب نے سید صاحب کے حکم سے شہر میں یہ اعلان بھی کرا دیا کہ لوگ ہراساں نہ ہوں، اطمینان سے اپنا کاروبار جاری رکھیں، کسی کو کوئی آزار یا نقصان پہنچنے نہ پائے گا۔

سرداران پشاور بڑے چالاک تھے۔ جب انھوں نے مجاہدین سے مقابلے کی طاقت اپنے میں نہ پائی تو صلح کا جال بچھایا اور ہزارخوانی کے ارباب فیض اللہ خان کو امیرالمجاہدین کی خدمت میں بھیج کر اپنے سابقہ اعمال کی معافی مانگی۔ آئندہ کے لیے توبہ کی اور اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ ارباب بہرام خان اور اکثر مجاہدین کی یہ خواہش تھی کہ پشاور دوبارہ بارک زئی سرداروں کے حوالے نہ کیا جائے وہ انھیں آزما چکے تھے کہ وہ محض وقتی یار ہیں۔ اصل میں مفاد پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ پشاور کے تاجروں اور ہندو سیٹھوں کے وفد نے بھی حاضر ہو کر یہی درخواست کی کہ بارک زئی سرداروں پر اعتماد نہ کیا جائے، بلکہ ارباب بہرام خاں نے کسی کے ذریعے امیرالمجاہدین حضرت سید احمدؒ سے استدعا کی کہ اگر پشاور کی حکومت کسی کو دینی ہی ہے تو مجھے عنایت فرمائیں، انھوں نے سید صاحب کو یقین دلایا کہ اگر پشاور کی حکومت مجھے سونپی گئی تو

۱- میں اس کی حفاظت کروں گا۔ کابلی سردار مقابلے پر آئے تو امیرالمجاہدین سے مدد مانگے بغیر ان کا مقابلہ کروں گا کیونکہ میری قوم خاصی بڑی ہے۔ اپنے ہم قوموں کی امداد میرے لیے کافی ہوگی۔

۲- چار ہزار سپاہی بھرتی کر کے سید صاحب کے ہم رکاب کر دوں گا۔ ان سپاہیوں کی تنخواہ اور اخراجات میں خود برداشت کروں گا۔

۳- میں اس اعزاز کو دینی خدمت کا ذریعہ بناؤں گا نہ کہ دنیوی عیش کا۔

۴۔ میں اس علاقے کے حالات و واقعات سے بخوبی باخبر ہوں اس لیے یہاں کے نظم و نسق کو بہتر طور پر چلا سکوں گا۔

ارباب بہرام خان کی اس پیش کش پر سید صاحب نے جواب دیا کہ ہم نے دنیوی مقاصد اور مفاد کے لیے جہاد نہیں کیا۔ نہ ہم اقتدار کے خواہاں ہیں۔ ارباب صاحب اور ہمارے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اگر ہم حکومت بہرام خان کے حوالے کریں گے تو لوگ یہی کہیں گے کہ ارباب صاحب کے نام پر ہم نے حکومت اپنے پاس رکھ لی ہے۔ بہر حال سید صاحب نے ارباب صاحب کی پیش کش قبول نہ کی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ طوائف الملوکی اور سیاسی ابتری کے اس دور میں بھی پشاور کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ سے کم نہ تھی، اسی لیے ارباب صاحب چار ہزار سپاہیوں کی تنخواہ اور اخراجات برداشت کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ سید صاحب کا پشاور کی حکومت سابقہ حکمران سرداروں کو لوٹا دینا بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ سید صاحبؒ میدانِ جہاد میں تو کامیاب رہے لیکن میدانِ سیاست میں بازی ہار گئے۔ انھوں نے ارباب بہرام خان جیسے مخلص پیشہ ساتھی کی بجائے خود غرض سردارانِ پشاور پر اعتماد کیا حالانکہ وہ لوگ ہرگز قابلِ اعتماد نہ تھے۔ ان کا سید صاحب سے معاہدہ محض ایک فریب تھا۔ سید صاحب اس سیاسی فریب کا شکار ہو گئے۔

سردارانِ پشاور نے تھوڑے ہی عرصہ بعد آنکھیں پھیر لیں اور سازشوں کا ایسا جال پھیلایا کہ خطۂ پشاور سے مجاہدین کا نام ہی مٹ گیا۔ انھوں نے علماء سے

مجاہدین اور امیر المجاہدین کے خلاف کفر کا فتویٰ حاصل کر لیا۔ مجاہدین کی طرف سے مقرر کیے گئے قاضیٔ شہر مولانا مظہر علی اور ارباب فیض اللہ خاں کو کسی بہانے اپنے ہاں بلوا کر ان کی تکا بوٹی کر دی، ایک خاص وقت مقرر کیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ اس وقت جہاں کہیں بھی "مجاہد" نظر آئے تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ایسا وقت بھی آیا جب مجاہدین پر دنیا تنگ ہو گئی ـــــ ارباب بہرام خاں نے اس عالم میں بھی استقامت اور عزیمت کا اظہار کرتے ہوئے سید صاحب کا پورا ساتھ دیا۔ وہ پنجتار میں امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر رہے۔ امیر المجاہدین نے اپنے جان نثاروں پر نظر دوڑائی تو ان سے ان کی حالت دیکھی نہ گئی۔ سب کو جمع کیا اور کہا:۔

"ہم اپنی ساری عمر پروردگار کی راہ میں صرف کر دینے کا پختہ ارادہ کیے بیٹھے ہیں، یہ کٹھن راستہ ہے، اب بھی جو بھائی جسمانی اور نفسانی تکلیفیں برداشت نہ کر سکے بخوشی ہم سے رخصت ہو جائے لیکن جدا ہونے والے بھائی کو خراسان یا ہندوستان یا کسی دوسرے ملک میں جا کر نہیں بسنا چاہیے۔ بلکہ وہ عرب کے سوا کہیں قیام نہ کرے، وہی سرزمین ہے جہاں دین خلل سے محفوظ رہے گا۔ اگرچہ بدعات سے وہ ملک بھی خالی نہیں"۔

اس تقریر کو سن کر تمام غازی زار و قطار رونے لگے، کچھ اپنے گھروں کو چلے بھی گئے لیکن ارباب بہرام خان کا معاملہ ہی اور تھا۔ انھوں نے جب سے سید صاحب کی رفاقت قبول کی، پروانہ وار ان کے ساتھ رہے۔ اب یہ مرحلہ آیا تو انھوں نے اپنے اہل و عیال کو (جو پنجتار ہی میں سکونت پذیر تھے) جمع کر کے کہا ـــــ "میں تو حضرتؒ کے ہم رکاب ہی رہوں گا تم جانا چاہو تو میرے بھائی جمعہ خاں کے پاس چلے

جاؤ ـــــ لیکن ان سب نے بے توقف کہا کہ ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ رہیں گے، خواہ کچھ پیش آئے"۔

ارباب بہرام خان کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے دو اس وقت نابالغ تھے۔ ایک بیوی تھی اور ایک بیٹی ـــــ ایک بھتیجا محمد خان بھی تھا جس کی شادی اغلباً ارباب صاحب کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے ہر مشکل کا سامنا کیا لیکن حق کا راستہ نہ چھوڑا۔

پنجتار سے نکل کر مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے سید صاحب نے بالاکوٹ کے مقام پر قیام کیا۔ کوئی تین سو جان نثار ہمراہ تھے۔ وہیں پر انھیں پتہ چلا کہ سکھ شہزادہ شیر سنگھ کی کمان میں ہزاروں سپاہیوں پر مشتمل لشکر جرار ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس وقت بھی ارباب بہرام خان نے صلاح دی کہ بالاکوٹ کو چھوڑ کر کاغان کی پہاڑیوں کی طرف نکل جانا چاہیے لیکن سید صاحب نے کہا۔ "خان بھائی! اب اس بات کو چھوڑیے جو ہونا ہے وہی ہو رہے گا"۔ اس پر ارباب صاحب نے اپنی انگشت شہادت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ "یہ سر خدا کی راہ میں حاضر ہے"۔ اور ارباب صاحب نے عملاً اپنی بات پوری کر دکھائی۔

۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کی شہادت گاہ نے دیکھا کہ ارباب بہرام خاں بندوق اٹھائے امیر المجاہدین کے ساتھ ساتھ تھے۔ چشم دید گواہ کا کہنا ہے کہ وہ سید احمد کے آگے آگے دوڑتے پھرتے اور انھیں بچانے کی ہر کوشش کرتے۔

سارا دن محاذ جنگ گرم رہا۔ شام ہوئی تو دیکھا کہ ارباب بہرام خان کی نعش بھی شاہ اسمٰعیل کی نعش سے تھوڑی دور پڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں شہادت پا کر جنت الفردوس میں پہنچ چکے تھے۔ دونوں شہیدوں کو تھوڑے فاصلے پر دفن کیا گیا۔

معرکۂ بالا کوٹ کے کوئی چھ ماہ بعد ارباب شہید کے بھتیجے اور داماد ارباب محمد خان نے اپنے قبیلہ والوں کو جمع کیا اور کہا میں ارباب صاحب مرحوم کے جسم کو بالا کوٹ سے تہکال لانا چاہتا ہوں۔ لوگ حیران تھے کہ اب ہڈیاں کھود کر لانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ لیکن نوجوان ارباب محمد خان کو یقین تھا کہ ان کے چچا نے خلوص نیت سے سید احمد شہید کا ساتھ دیا تھا اس لیے وہ شہید ہیں اور یقیناً ان کی نعش قبر میں صحیح سالم ہوگی۔ چنانچہ محمد خان نے ایک تابوت بنایا اور چالیس آدمیوں کو لے کر بالا کوٹ گیا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی قبر کھودنے سے منع کیا لیکن ارباب محمد خان اپنے ارادے کا پکا تھا۔ بالآخر ارباب شہید کی نعش نکالی گئی تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ نہ جسم کا کوئی حصہ بگڑا تھا نہ اس میں بدبو پیدا ہوئی تھی۔ صرف پاؤں کے ناخنوں پر ذرا سا نشان تھا۔ ہزاروں لوگوں نے بصد عقیدت و احترام ارباب شہید کو دوبارہ تہکال میں دفن کیا۔ ان کے مرقد کو دیکھ کر بے اختیار زبان پر آتا ہے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

○

غازی دلاسہ خانؒ

غازی دلاسہ خان ضلع بنّوں کا وہ عظیم سرفروش ہے جس کی ساری عمر سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے میں گزری۔ اس کی قربانیوں اور جذبۂ ایثار کی جتنی بھی قدر کی ہے کم ہے۔

غازی دلاسہ خاں کے والد کا نام خٹک خان، دادا کا نام عالم خان اور پردادا کا نام غازی خان تھا، دلاسہ خاں کا مورثِ اعلیٰ داؤد شاہ تھے جس کا شجرۂ نسب مشہور محقق اور نامور مؤرخ سرفراز خان خٹک عقاب ایڈووکیٹ نے یوں لکھا ہے داؤد شاہ ولد خوزک ولد پہیک ولد سورانی ولد شیتک۔ داؤد شاہ کے نام پر بنوں کا ایک علاقہ ٹپہ داؤد شاہ کہلاتا ہے۔ گویا دلاسہ خان اسی علاقے کے رئیس خاندان کا چشم و چراغ تھا، اسے قیادت ورثہ میں ملی تھی۔ اسی لیے ابتداء ہی سے نڈر، حق گو اور غیوّر تھا۔ اس کا سالِ ولادت عقاب خٹک کے نزدیک ۱۷۷۷ء ہے۔

دلاسہ خان نے بڑے ہو کر سکھوں کا دور دیکھا۔ سکھ ڈیرہ اسمٰعیل خان فتح کرنے کے بعد بغیر کسی مزاحمت کے بنّوں پر قابض ہو گئے تھے تاہم ان کی حکومت برائے نام تھی۔ ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۷ء تک یہاں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ہر ایک گاؤں میں قلعہ بنا ہوا تھا۔ ہر گاؤں کا خان وہاں کا مطلق العنان حکمران تھا۔

سکھوں کے کارندے گاہے گاہے فوجی دستے لے کر مالیہ کی وصولی کے لیے آن دھمکتے اور جو کچھ ہاتھ لگتا لے کر چلتے بنتے۔ لوگوں کی معاشی حالت سخت ابتر تھی۔ سکھ فوجی ان سے مالیہ یا قلنگ طلب کرتے، غریب لوگ ادا نہ کر سکتے تو ان کے گھروں کو جلا دیا جاتا۔ فصلیں تباہ کر دی جاتیں، مردوں کو قتل کر دیا جاتا اور لڑکوں لڑکیوں کو قید کر کے ان سے جبری مشقت لی جاتی۔

پھر مالیہ کی وصولی تو ایک طرف رہی، سکھ سپاہی ہر طریقے سے مسلمانوں کو ذلیل کرتے، جب تک وہ دیہات میں موجود رہتے نہ تو کسی کو اذان کہنے دیتے نہ نماز پڑھنے کی اجازت دیتے اور نہ ہی گائے بھینس ذبح کرنے دیتے۔

خالصہ دربار کا ایک عُہدہ دار محمد حیات ایک سکھ جرنیل سوچیت سنگھ کے تعصّب اور تنگ نظری کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ دورے پر آیا ہوا تھا کہ موضع اللہ داری تپہ مندہ خیل میں کسی شخص نے بچھڑا ذبح کر دیا، جونہی سکھ جرنیل نے خبر سنی اس نے فوج کو حکم دے دیا کہ گاؤں کے رہنے والے سبھی لوگوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے اور جو بوڑھا ہو اس کے ہاتھ اور ناک کاٹ دیے جائیں۔

غازی دلاسہ خان یہ باتیں سنتا تو اس کا خون کھول اٹھتا، ویسے تو اس کا شمار بڑے ملکوں میں نہیں ہوتا تھا اور وہ تپہ داؤد شاہ میں ایک چوتھائی ملکیت رکھتا تھا تاہم اس کی قومی بصیرت، جرأت اور قائدانہ صلاحیتوں کے پیش نظر لوگ اسے ہی علاقے کا ملک مانتے تھے۔ اس کے گاؤں گلہ خان زدرائی پر سکھوں نے پانچ ہزار روپیہ کا قلنگ یا محصول لگا رکھا تھا۔

یوں تو علاقے کے سارے ملک اور مزارعین سکھوں کے مظالم سے ناک بدم تھے تاہم کوئی ان سے ٹکر لینے کی جرأت اس لیے نہیں کرتا تھا کہ سکھ فوج انتہائی منظم اور مسلح تھی، اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی جرنیلوں نے اسے تربیت دی

تھی۔ بے دے کے ملک دلاسہ خان ہی دہ نڈر اور جری جوان تھا جو بے دریغ میدانِ جنگ میں کود پڑتا۔ ہر مشکل وقت میں عوام کی نظریں دلاسہ خان ہی کی طرف اٹھتیں۔

۱۸۲۶ء میں کنور کھڑک سنگھ اپنے سپہ سالار فتح سنگھ کو ساتھ لے کر بنوں آیا اور اس جگہ ڈیرہ جمایا جہاں ان دنوں قلعہ دلیپ گڑھ ہے۔ سکھوں کی تعداد بہت زیادہ تھی پھر بھی غازی دلاسہ خان نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جب کوئی پیش نہ گئی تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ڈوڈ کے پہاڑوں کا رخ کیا اور سکھ فوج دیکھتی ہی رہ گئی۔

۱۸۳۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا کاردار تارا چند فوج لے کر مالیہ کی وصولی کے لیے آیا، پہلے تو اس نے علاقہ مروت کے لوگوں کو لوٹا اور جو سامنے آیا اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر بنوں پہنچا اور موضع ککی بھرت کے پاس اکرہ میں خیمہ زن ہوا۔ اس نے اپنے افسر ادھر اُدھر بھیجے جنھوں نے جاکر خبر دی کہ دلاسہ خان کسی طرح بھی اطاعت کرنے اور مالیہ ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اکرہ سے روانہ ہو کر اس نے ممش خیل میں پڑاؤ کیا۔ صبح سویرے ہی وہ اٹھا اور اس نے دلاسہ خان کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ دلاسہ خان اور اس کے جانباز مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ سکھ لشکر نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور فصیل پر بے پناہ گولہ باری کی، جونہی گولہ لگنے سے فصیل میں شگاف پڑتا، غازی کوئی درخت کاٹ کر وہاں ڈال دیتے اور شگاف بند ہو جاتا، جب سکھ لشکر کی جانب سے دباؤ بڑھا تو غازی بے دھڑک باہر نکلے اور انھوں نے سکھ توپچیوں پر حملہ کر دیا۔ بہت سے سکھ توپچی ہلاک ہوئے اور کئی ایک توپیں بے کار ہو کر رہ گئیں۔ اپنے توپچیوں کا یہ حال دیکھ کر سکھوں کی پیادہ افواج نے گاؤں پر ہلہ بول دیا۔ غازی پہلے تو پے بہ پے

دشمن پر بندوقوں سے گولیاں برساتے رہے لیکن جب سکھوں کا سیلاب نہ رکا تو بنوچیوں نے تلواریں سونت کر دست بدست لڑائی شروع کر دی۔ ادھر گاؤں کے چاروں کونوں پر برج بنے تھے۔ ماہر نشانہ باز غازی ان مورچوں سے سکھ سپاہیوں پر گولیوں کی بارش کرتے رہے اور سکھ زخمی ہو ہو کر گرتے رہے۔ بالآخر سکھ فوجی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، خیمہ گاہ میں پہنچنے کے بعد بھی ان پر مسلمان مجاہدوں کا خوف اتنا غالب تھا کہ انھوں نے کیمپ کے اردگرد خندقیں کھود لیں تاکہ مجاہدوں کے حملے سے محفوظ رہ سکیں۔

بتیس[۳۲] دن تک سکھ لشکر وہیں پڑا رہا اور موقع کا منتظر رہا کہ کب مجاہدوں پر حملہ کرے۔ لیکن غازی بھی جان سے ہاتھ دھو کر بیٹھے تھے، بالآخر سکھ لشکر جدھر سے آیا تھا ادھر کو چل دیا۔ اس بار تارا چند کو صرف عیسکی اور مندا اترڑ سے تھوڑا بہت مالیہ وصول ہوا۔ ضلع بنوں کے باقی سبھی دیہات نے علم بغاوت بلند کیے رکھا۔

غازی دلاسہ خان کا یہ اقدام کوئی معمولی نوعیت کا نہ تھا کیونکہ تارا چند کا لشکر آٹھ ہزار آزمودہ کار سکھ فوجیوں پر مشتمل تھا اور اس کے پاس بارہ[۱۲] توپیں بھی تھیں۔ لشکر کی کمان فرانسیسی جرنیل کورٹ کر رہا تھا۔ اس کے باوجود غازی دلاسہ خان نے نہ صرف ان کی پیش قدمی روک دی بلکہ سردار جے سنگھ اٹاری والا اور دو سو سکھ سواروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جب کہ پانچ سو سکھ فوجی زخمی ہوئے۔

تارا چند نے بنوں پہنچ کر سکھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو رپورٹ بھیجی کہ بنوں کے سبھی ملک باغی ہو چکے ہیں۔ اس پر رنجیت سنگھ نے تمام ملکوں کو پروانہ بھیج کر اپنے دربار لاہور میں طلب کر لیا۔ پروانہ میں لکھا تھا کہ جو لوگ

سکھ سرکار کے تابع اور طرف دار ہیں وہ سلام کے لیے لاہور آئیں اور جو حاضر نہ ہوں گے ان کا شمار باغیوں میں کیا جائے گا۔

اس حکم نامہ کی تعمیل میں ملک دکس خان، ملک میر ہوس خان، جعفر خان اور جنگی خان لاہور روانہ ہو گئے۔ دلاسہ خان کو چونکہ سکھ دربار میں حاضر ہونا گوارا نہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنی طرف سے اپنے ہندو وکیل میگھا رام کو لاہور بھیج دیا۔ بنوں کے ملکوں کا یہ وفد امرتسر کے مقام پر رنجیت سنگھ سے ملاقی ہوا۔ رنجیت سنگھ نے ان سے مالیہ نہ دینے اور بغاوت کرنے کی وجہ پوچھی۔ جس پر ملک دکس خان نے بتایا کہ مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں ضلع بنّوں کا مالیہ بارہ ہزار روپیہ تھا جبکہ سکھ سرداروں شہزادہ کھڑک سنگھ اور فتح سنگھ نے اسی علاقے پر ایک لاکھ روپیہ سالانہ مالیہ مقرر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ غریب علاقے کے لوگ اتنی رقم ادا نہیں کر سکتے۔ ملک دکس خان نے یہ بھی بتایا کہ مالیہ کی وصولی میں کاردار تارا چند نے بے جا سختی کی جس کی بناء پر دلاسہ خان سے جنگ کی نوبت آئی۔ اس پر رنجیت سنگھ نے الٹا تارا چند ہی کو ڈانٹ ڈپٹ پلائی۔ اور یوں سارا معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد ۱۸۳۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ہندو وکیل کو مالیہ کی وصولی کے لیے بنّوں بھیجا لیکن اہلِ بنّوں نے متحد ہو کر مالیہ دینے سے بالکل انکار کر دیا۔ اس پر ۱۸۳۶ء میں کنور نونہال سنگھ اور راجہ سوچیت سنگھ سکھ دربار کی طرف سے بہت بڑی فوج لے کر بنّوں پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک دلاسہ خان کے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول پکڑا تو دلاسہ خان کے ساتھیوں کو فاقوں کی نوبت آگئی۔ دوسرے مقامات سے جو لوگ اس کی مدد کو آئے تھے انھوں نے بھی جنگ کو طول پکڑتا دیکھ کر علیحدگی اختیار کر لی اور

اپنے اپنے دیہات کو چل دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میدان سوچیت سنگھ کے ہاتھ رہا۔ اس بار اس کے فوجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ انھوں نے ضلع بنّوں کے لوگوں پر خوب مظالم ڈھائے۔

ملک دلاسہ خاں کی ہیبت کا یہ حال تھا کہ بنّوں کے پہلے انگریز حاکم ایڈورڈز نے لکھا ہے کہ "سکھ بنّوں آتے تو دلاسہ خاں کا خوف لے کر اور جب واپس جاتے تو نفرت بھری یادیں دے کر"

سکھوں نے دریائے ستلج کے کنارے انگریزوں سے شکست کھائی تو اس وقت دونوں کے مابین ایک معاہدہ طے پا گیا۔ اس معاہدہ کی رُو سے سکھ دربار میں انگریز افسروں کا تقرر بھی عمل میں آیا۔ بنّوں میں ہربرٹ ایڈورڈز (یہ وہی ایڈورڈز ہے جس کے نام پر پشاور میں سکول اور کالج قائم ہوئے) کو مالیے کی وصولی اور نظم ونسق کی اصلاح کے لیے متعین کیا گیا۔ ایڈورڈز ۱۵ مارچ ۱۸۴۷ء کو پہلی بار بنّوں آیا اور بڑی حکمتِ عملی سے کام لے کر ملک دلاسہ خاں کو ملاقات کے لیے بلوایا۔ ملک دلاسہ خان ساٹھ سواروں کے ایک دستہ کے ساتھ بڑی سج دھج سے آیا اور سکھ سرداروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایڈورڈز سے کہا۔ "مجھے سکھوں پر کوئی اعتماد نہیں۔ میں تمھارے بلانے پر آیا ہوں کہ تم ایک اہلِ کتاب ہو اور اپنا وعدہ نبھاؤ گے۔" ایڈورڈز نے بظاہر ملک دلاسہ خان کی بڑی آؤبھگت کی۔ واپسی پر وہ سیر کے بہانے اس کے ہمراہ اس کے گاؤں تک گیا۔ اس موقع پر سردار شمشیر سنگھ بھی ایڈورڈز کے ہمراہ تھا۔ انھوں نے دلاسہ خان کے قلعے کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس پر دلاسہ خان سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے اور سکھ لشکر اصل میں اس پر حملہ آور ہونے کی فکر میں ہے۔ وہ خود تو آزاد قبائل کے علاقہ ڈوڑ کی طرف چل دیا اور ایڈورڈز کو خط لکھ کر بتا دیا کہ وہ

اس پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

۸ دسمبر ۱۸۴۷ء کو ہربرٹ ایڈورڈز دوبارہ بنوں آیا تو اس نے سبھی ملکوں اور سرداروں کو بلا بھیجا۔ سبھی ملک اس کے بلاوے پر آئے لیکن نہ آیا تو ملک دلاسہ خان نہ آیا۔

دلاسہ خان نے قبائلی علاقے میں کئی مرتبہ لشکر جمع کر کے سکھوں پر یلغار کا ارادہ کیا لیکن ہر بار سرمایہ کی کمی آڑے آئی۔ یہاں تک کہ اس نے اس سلسلے میں امیر دوست محمد خان، والئی افغانستان سے بھی اس کے بیٹے سردار محمد اکرم خان کے توسط سے امداد چاہی لیکن خانہ جنگیوں کی وجہ سے کابل کا حال بھی خود ابتر تھا۔

ایڈورڈز کے بعد میجر ٹیلر کو بنوں کا اسسٹنٹ ریذیڈنٹ بنایا گیا۔ اس نے غازی دلاسہ خاں سے نرم رویہ اختیار کیا اور اسے اپنے وطن بلا بھیجا۔ آزادی کا یہ علمبردار، بطل حریت اپنے وطن لوٹا لیکن اس حال میں کہ بیماری کے سبب چارپائی سے لگا ہوا تھا، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے تک کے قابل نہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسی حالت میں اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

غازی دلاسہ خان کے مرتے ہی سکھ اور فرنگی حکمرانوں کو کھل کھیلنے کا موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے بنوچیوں کو خوب دبایا۔ دیہات کے تمام قلعے (جن کی تعداد چار سو سے کم نہ تھی) مسمار کر دیے۔ جبراً مالیہ وصول کیا ۔ شہزادہ دلیپ سنگھ کے نام پر بنوں کا نام دلیپ گڑھ رکھا اور ایک قلعہ اس مقام پر تعمیر کیا جہاں سے ضلع بنوں کی تمام نہروں کو آسانی سے کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ سکھوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد بنوں کا نام ایڈورڈز آباد رکھا گیا تاہم لوگ ہمیشہ اسے بنوں ہی کے نام سے پکارتے رہے۔

غازی دلاسہ خان کو بڑے احترام کے ساتھ خواجہ عبداللہ باباؒ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ قبرستان کے جنوب مشرقی کونے میں ایک بڑی سی اونچی قبر اس عظیم مردِ مجاہد کی آخری آرام گاہ ہے، جس کی ساری عمر اپنے دین کی آبرو بچانے اور اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کی حفاظت کرنے میں گزری۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

○

سیّد اکبر شاہ

سکھ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف صوبہ سرحد کے جس مردِ مجاہد نے سب سے بڑھ کر نتیجہ خیز کردار انجام دیا وہ غوثِ بونیر حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا علیہ الرحمۃ کے خانوادے کا ایک معزز رکن سید اکبر شاہ آف ستھانہ تھا، اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں انگریز مؤرخوں کا کہنا ہے کہ "۱۱ ر مئی ۱۸۵۷ء کو بادشاہ سوات سید اکبر شاہ کی وفات فرنگی اقتدار کے لیے ایک نیک فال تھی۔ یہی وہ دن تھا جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی خبر پشاور پہنچی۔ اگر سید اکبر شاہ زندہ رہتا تو صوبہ سرحد کی سیاسی صورت حال کچھ اور ہی ہوتی"۔

صوبہ سرحد کے اولیائے کرام اور مشائخ عظام میں حضرت پیر باباؒ بونیری بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں انھوں نے اسلام کی تبلیغ و ارشاد میں جو کارنامے انجام دیے ان کی مثال اس خطہ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ فخر بھی مصلحِ اعظم، شہنشاہ خراسان سیّد علی غواص المعروف پیر بابا علیہ الرحمۃ ہی کی حاصل ہوا کہ ان کی اولاد میں سے متواتر وہ عظیم ہستیاں اٹھیں جنھوں نے تاریخِ اسلام کے صفحات پر اپنا نام چھوڑا۔ اللہ نے اس پاکباز گھرانے کے افراد کو دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا اور علم اور عمل کے میدان میں امتیازی مقام بخشا۔ دنیائے اسلام کے نامور انقلابی سید جمال الدین افغانی

بھی اسی ترمذی گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور بادشاہ سوات سید اکبر شاہ آف ستھانہ بھی اسی عظیم خانوادے کے ایک معزز رکن۔

سادات ستھانہ ترمذی سید ہیں انھیں سارے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں انتہائی عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، وہ نہ صرف حضرت پیر بابا کے نامور اخلاف میں سے ہیں بلکہ اس علاقے کی دینی، سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بھی انھوں نے ہمیشہ قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ یہ لوگ آج کل منگل تھانہ، تختہ بند، ستھانہ اور دوسرے سرحدی مقامات پر آباد ہیں جب کہ اصل میں اس خاندان کا مرکز اعلی کنٹر (افغانستان) کا قصبہ اسد آباد ہے۔ یہ حضرات ترمذی سادات کہلاتے ہیں اور بونیر کے علاوہ کئی اور مقامات پر بھی آباد ہیں۔

حضرت پیر بابا ۱۵۰۲ء میں تولد ہوئے اور ۱۵۸۳ء تک (جو ان کا سال وفات ہے) ان سارے علاقوں میں دین کی روشنی پھیلاتے رہے۔ وہ ایک جامع طریقت و شریعت ہستی تھے اور زاہد گوشہ نشین ہونے کے ساتھ مجاہد فی سبیل اللہ بھی رہے ان کے جانشین بھی روحانی کمالات کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے نمایاں مقام کے مالک رہے۔

انہی سادات ستھانہ کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر اپنی تصنیف "سرگزشت مجاہدین" میں لکھتے ہیں۔

> اٹھارھویں صدی عیسوی میں اس گاؤں کو سید ضامن شاہ نے آباد کیا۔ چونکہ سادات ترمذی کا یہ گھرانا بڑی عزت و احترام کا مالک تھا۔ اس لیے اس گاؤں کو "آستانہ" یا "آستانۂ سادات" کہا جانے لگا۔ ستھانہ کا اصل قصبہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر تھا لیکن ۱۸۴۱ء میں دریائے سندھ میں زبردست سیلاب آیا تو قدیم ستھانہ کو بڑا نقصان پہنچا۔

اس لیے ستھانہ نام کا موجودہ گاؤں دریا سے کچھ ہٹ کر بنایا گیا۔
ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر اپنی تصنیف "ہندوستانی مسلمان" میں رقم طراز ہے :۔
"ستھانہ کیمپ بظاہر مسلمان درویشوں کی دینی خانقاہ تھی۔ جہاں پر علماء اپنے سینکڑوں شاگردوں کو اسلامی عقائد و عبادات کا درس دیتے تھے تاہم ان لوگوں کا اصل مقصد لوگوں کو انگریزی اقتدار کے خلاف بغاوت اور جنگ پر تیار کرنا تھا۔ یہ لوگ موقع ملتے ہی انگریز افسروں کو اغوا کر کے لے جاتے اور بھاری معاوضہ وصول کر کے رہا کرتے۔"

یہ فخر بھی سید اکبر شاہ کے اسی گھرانے کو حاصل ہوا کہ انھوں نے ہر ظالم قوت کے خلاف، ہر دور میں ہر ممکن طریق سے جہاد کیا۔ سکھوں کے خلاف مزاحمت کی مہم کا سہرا بھی سادات کے سر ہے۔ اس وقت بھی جب سلطان محمد خان (حاکم پشاور) امیر دوست محمد خان (والی افغانستان) اور دوسرے زعماء نے خالصہ سرکار کی منظم اور مسلح افواج سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کی۔ سید اکبر شاہ اور ان کے سرفروش ساتھی انتہائی بے سرو سامانی کے باوجود مقابلے پر ڈٹے رہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ صوبہ سرحد میں یہی ایک خاندان ہے جس کے ہر فرد کا ایک ایک لمحہ سیّد احمد بریلویؒ کو تقویت پہنچانے میں گزرا۔ پھر یہی ایک خاندان ہے جس نے سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی اپنے جان و مال کو انتہائی بے غرضی سے مجاہدین کے لیے وقف رکھا، یہاں تک کہ اس راہ میں ان سادات کرام کو اپنے پشتوں کے وطن ستھانہ سے بھی محروم ہونا پڑا۔ جب فرنگی کی توپوں نے ستھانہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو یہ سادات کرام وہاں سے ۳۵ میل دور ایک پہاڑی ٹھکانے ملکا میں جا بیٹھے ــــ وہاں بھی انگریزوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا تو اللہ کے توکل

پر وہاں سے بھی نکل کھڑے ہوئے ــــ پچاس برس تک ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کے بعد انھیں موقع ملا تو انھوں نے پھر ستھانہ میں حکومت اختیار کر لی۔ آج بھی وہاں سادات کا پرچم لہرا رہا ہے۔ جو ہمیں اس عظیم خانوادے مجاہدانہ قربانیوں اور عزم و استقامت کی یاد دلاتا ہے۔

اس گھرانے کی سرگزشت یہ ہے کہ سید اکبر شاہ کے جدِّ امجد سید ضامن شاہ اپنے آبائی وطن تختہ بند (بونیر) سے نکل کر دہلی کو چل پڑے۔ راستے میں چھچھ کے ایک افغان سردار نے اپنی صاحبزادی ان سے بیاہ دی۔ دہلی دربار سے انھیں نوشہرہ کا علاقہ جاگیر کے طور پر ملا۔ لیکن ان آزاد منش اور سیر چشم لوگوں کو دنیاوی جاہ و حشم کی کیا پرواہ تھی ــــ یہ جاگیر کسی اور کے حوالے کر دی اور خود ادھر ادھر پھرتے رہے۔ کچھ عرصہ اُتمان زئیوں نے انھیں ستھانہ میں اراضی دے دی جہاں انھوں نے اپنا "استانہ" آباد کیا جسے عام لوگ ستھانہ کہنے لگے ــــ پیر بابا کی اولاد ہونے کے سبب سبھی اہل ہزارہ بلکہ اہل سرحد ان لوگوں کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔ یہ لوگ روحانی پیشوا ہونے کے ساتھ سخاوت، شجاعت اور علم و فضل میں بھی یگانۂ روزگار رہے ہیں، سید ضامن شاہ بادشاہ ایک بار پکھلی کے کے دورے پر گئے ہوئے تھے کہ بفہ میں ان کا آخری وقت آن پہنچا، ان کا جسدِ خاکی بفہ سے لاکر ستھانہ میں دفن کیا گیا۔

سید ضامن شاہ کے دو فرزند تھے سید شاہ گُل عرف شاہ جی اور سید شاہ مردان (جو عالمِ شباب ہی میں فوت ہو گئے) سید شاہ گُل کی شادی گندف میں سید شیر شاہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ گندف کے سادات بھی حضرت پیر بابا ہی کی اولاد میں سے ہیں۔

سید شاہ گُل نے چھ بیٹے چھوڑے، سید اعظم شاہ، سید اکبر شاہ، سید عمر شاہ،

سید عمران شاہ، سید اصغر شاہ اور سید شاہ مدار۔ یہ سارے حضرات حد درجہ متقی اور دیندار تھے اور ان میں مثالی محبت تھی۔ تاہم سید اکبر شاہ کی ذہانت، دینی محبت دنیوی وجاہت اور شجاعت کی بات ہی کچھ اور تھی ـــــ دینی بصیرت کے ساتھ ساتھ اللہ نے انھیں دینی وجاہت اور قائدانہ صلاحیت سے بھی وافر حصہ عطا کیا تھا۔ ان کے بھائیوں میں سیّد اعظم شاہ سب سے بڑے تھے۔ ان کی شادی احمد علی خان پلال کی بیٹی سے ہوئی تھی (جو شادل کے خان نوابِ خان کی حقیقی بھانجی تھی اور جس کی دوسری بہن نواب پائندہ خان سے بیاہی ہوئی تھی) خاندانی دستور کی رُو سے شاہ گُل کی وفات کے بعد سید اعظم شاہ ہی کو دستارِ قیادت ملنی چاہیے تھی لیکن انھوں نے سید اکبر شاہ کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر یہ منصب بخوشی ان کے حوالے کر دیا ـــــ سید اکبر شاہ ایک لحاظ سے تحریکِ مجاہدین کے سرپرست تھے۔ سید احمد بریلویؒ، شاہ اسمٰعیلؒ اور تحریکِ مجاہدین کے دوسرے زعماء ہر بات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ مشیر ہونے کے علاوہ وہ تحریکِ مجاہدین کے خزانچی بھی تھے۔ ہندوستان بھر سے مسلمان مجاہدین کو روپے بھیجتے جو سید اکبر شاہ ترمذی ہی کی تحویل میں رہتے۔

غلام رسول مہر "سید احمد شہید" میں کہتے ہیں :۔

"سید صاحب ابھی کھبل ہی میں تھے کہ سید اکبر شاہ اپنے بھائی سید اصغر شاہ اور اپنے عزیزوں سید نور جمال سکنہ منڈی اور سید کامل شاہ کو ساتھ لے کر ملاقات کے لیے پہنچے۔ ان کے اخلاقِ کریمانہ کی وجہ سے امیر المجاہدین (سید احمد) اور تمام غازی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔"

مولوی سید جعفر علی نقوی کا کہنا ہے :۔

"ان سادات خصوصاً سید اکبر شاہ کے اخلاقِ کریمانہ ذکر و بیان سے باہر ہیں۔ ابتداء سے لے کر آخر تک ان کے خلوص و وفا میں کوئی کمی آنے نہ پائی"۔

"وقائع" (صفحہ ۱۱۸۶) پر ہے:-

"سید اکبر شاہ کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کا بیان کیسے کروں جس کسی نے انھیں دیکھا ہے اور ان کی صحبت سے فیض پایا ہے وہ خوب واقف ہے کہ ایسا خوش خُلق، خندہ رُو، سلیم الطبع، سلیم المزاج سخی، شجاع، صاحبِ تدبیر، صاحبِ دِل، راست گفتار اور حضرت امیر المجاہدین کا مخلص، بے ریا، محب باصفا اور معتقد صادق کوئی رئیس ولایت سرحد میں نہ تھا۔"

سید اکبر شاہ اور ان کے اقرباء کی عزت افزائی کے لیے سید احمد بریلوی خود ستھانہ گئے۔ ڈیڑھ سو سر کردہ غازی ساتھ تھے۔ اہلِ ستھانہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ سید اکبر شاہ کی والدہ بھی زندہ تھیں، سب نے سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

دورانِ سفر سید احمد بریلوی نے بونیر میں پاچا کلی کے مقام پر حضرت پیر باباؒ علیہ الرحمۃ کے مزار پر حاضری بھی۔ انھوں نے مزار پر مراقبہ کرنے کے بعد فرمایا۔ "یہ بڑے مرتبے والے بزرگ اور صاحبِ ہدایت تھے۔ ان کی رُوح سے ملاقات ہوئی۔ کمال محبّت و اخلاص سے میرا ہاتھ پکڑا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا۔"

بعد میں انھوں نے حضرت پیر بابا کے پوتے سید عبدالوہاب کے مزار پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی بھی کی۔

سید اکبر شاہ کی خوبیوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے امیر المجاہدین سید احمد بریلوی

ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اکثر امور میں ان کے مشورے ہی پر عمل کیا کرتے تھے، جب سید احمد کو امب سے پنجتار جانا پڑا تو انھوں نے قلعہ امب کا انتظام شیخ بلند بخت دیوبندی کے حوالے کیا لیکن تمام انتظامات میں سید اکبر شاہ کو اس طرح شریک رکھا گیا کہ کوئی بات بھی ان کی مرضی کے بغیر طے نہ پاتی تھی

اسی طرح ستمبر ۱۸۲۷ء میں جب امیر المجاہدین سید احمد بریلوی نے پنجتار کے قیام کے دوران ایک لشکر پکھلی کی طرف بھیجا جس میں شاہ اسمٰعیل کی قیادت میں ڈیڑھ دو سو مجاہدین شامل تھے تو سید اعظم شاہ اور سید اکبر شاہ آف ستھانہ نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ بعد میں سید اکبر شاہ نے تنہائی میں مولانا سید اسمٰعیل کو بتایا کہ ان لوگوں (خوانین پکھلی و ہزارہ) میں سے اکثر نفاق پیشہ ہیں۔ مقابلہ ہوگا تو لڑائی میں آپ کو تنہا چھوڑ کر تماشا دیکھیں گے۔ فتح حاصل ہو گی تو چیلوں کی طرح مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑیں گے۔ شکست کی صورت میں بالا ہی بالا اپنے گھروں کی راہ لیں گے۔ البتہ ممکن ہے کہ عنایت اللہ خان (خان خیل) عبد المغفور خان (اگرور) اور ناصر خان (بٹ گرام) وفادار رہیں"۔ سید اکبر شاہ چونکہ پکھلی کے تمام خوانین کے حالات سے آگاہ تھے۔ اس لیے ان کا یہ تجزیہ بعد میں بالکل درست ثابت ہوا۔

اصل میں سرحدی خان خوانین ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اس لیے مجاہدین کے لیے بڑی مشکل تھی۔ اگر ایک خان کا ساتھ دیتے تو دوسرا بگڑ جاتا۔ نواب پائندہ خان آف امب کا بھی یہی معاملہ تھا۔ ایک طرف تو وہ سکھوں کے خلاف محاذ پر لڑ رہا تھا دوسری طرف اس کے اپنے بھائی بند بھی اس سے برسرِ پیکار تھے۔ دیکھا جائے تو مسلمان کو ہمیشہ اپنوں ہی کے ہاتھوں زک اٹھانا پڑی اور غیروں سے کبھی اتنا نقصان نہ پہنچا جتنا اپنوں

کے ہاتھوں پہنچا۔

جہاں تک سید اکبر شاہ کا تعلق ہے صوبہ سرحد میں سکھوں کے خلاف سے بڑا جہاد انھوں نے ہی کیا۔ تاریخ میں اسے "پیرسباک کا جہاد" کہا جاتا ہے۔

پیر سباک کا جہاد

پیرسباک کے جہاد کا پس منظر یہ تھا کہ پنجاب کا مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے وقت کا بڑا جابر اور ظالم حکمران تھا۔ "ہزارہ گزیٹیر" کے مطابق اس کی حکومت دہشت گردی پر مبنی تھی، جبکہ پشاور ڈسٹرکٹ گزیٹیر "ص۔") کا کہنا ہے کہ "اباسین سے وادی لوند خوڑ تک شاید ہی کوئی گاؤں ہو جسے سکھوں نے لوٹا یا جلایا نہ ہو۔" سکھ اپنے دور کی بہت بڑی طاقت تھے، ان کی فوج کو یورپی جرنیلوں نے جدید بنیادوں پر جنگی تربیت دے رکھی تھی اور ان کے پاس بہترین اسلحہ اور توپ خانہ تھا۔ اسی لیے لوگ رنجیت سنگھ کا نام سنتے ہی خوفزدہ ہوجاتے تھے اور مقابلے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ دوسری طرف ان دنوں افغانستان کا برسراقتدار خاندان آپس ہی کی خانہ جنگیوں میں الجھا ہوا تھا۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا، اس لیے سکھوں کی پیش قدمی کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔

۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ نے چپکے سے اٹک کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ دریائے سندھ کو پار کرکے اس نے خیرآباد میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور سکھ فوج کو وہاں متعین کردیا۔ اس پر پشاور کے مسلمانوں کی غیرت جوش میں آئی۔ خصوصاً قبیلہ خٹک کے ہزاروں مجاہد میدان میں نکلے اور سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں عارضی طور پر تو کچھ کامیابی نصیب ہوئی لیکن سکھوں کی عددی برتری اور بہتر اسلحہ جنگ

کی وجہ سے انھیں شکست فاش نہ دے سکے۔ اگر پشاور کے کابلی حکمران اس موقع پر جرأت کا ثبوت دیتے تو سکھوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہوتا لیکن حالت یہ تھی کہ جونہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا لشکر جرار پشاور کی طرف بڑھا یار محمد خان نے اُسے جزیہ دینے اور اطاعت بجالانے کا یقین دلایا چنانچہ اس بار سکھ مہاراجہ یار محمد خان کو باجگذار بنانے کے بعد لاہور واپس چلا گیا۔

اس وقت بارک زئی بھائیوں میں سے سردار محمد عظیم خان افغانستان میں دادِ حکومت دے رہا تھا۔ اسے اس بات پر بڑا قلق تھا کہ اس کے بھائی یار محمد خان نے سکھوں کے مقابلے میں بڑی کمزوری دکھائی ہے اور انھیں خراج دینا منظور کر لیا ہے۔ عظیم خان نے اپنے ایک بھائی سمندر خان کو چند سرکردہ علماء کے ساتھ علاقہ یوسف زئی میں بھیجا تاکہ لوگوں کو اسلامی جہاد کے لیے تیار کریں، سمندر خان نے سید اکبر شاہ اور دوسرے سرکردہ خوانین سے مدد مانگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیس ہزار یوسف زئی اور خٹک مجاہدوں کا ایک لشکر جرار نوشہرہ کے متقابل دریائے کابل کے بائیں کنارے پیر سباک کی پہاڑیوں میں جمع ہو گیا، ان سرفروشوں کی قیادت سید اکبر شاہ جیسے جانباز کے ہاتھ میں تھی ــــ یہ حال دیکھ کر رنجیت سنگھ بنفس نفیس ایک بہت بڑے سکھ لشکر کو لے کر مجاہدین کے مقابلے کے لیے نکلا۔ اس نے ہنڈ پہنچ کر اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ لشکر کا بڑا حصہ تو اپنے سب سے جرأت آزما جرنیل اکالی پھولا سنگھ کی کمان میں پیر سباک کو بھیجا جبکہ فوج کا باقی ماندہ حصہ اس نے اپنے ساتھ رکھا اور خود دریا کے دائیں کنارے پیر سباک کے سامنے خیمہ زن ہوا۔ ادھر کابل سے سردار محمد عظیم خان بھی اپنی فوج اور توپ خانے کو لے کر نوشہرہ سے آگے بڑھا اور دریائے کابل کے دائیں کنارے پر فروکش ہوا۔ یہ مارچ ۱۸۲۳ء کا ایک دن تھا۔ اس دن آسمان نے ایک بار پھر صدیوں

پہلے والا منظر دیکھا جب۔ چند سو بے سرو سامان مسلم کفار کے بڑے سے بڑے لشکر کے سامنے ڈٹ جایا کرتے تھے۔ ایک طرف شمع اسلام کے پروانے تھے جن کے پاس نہ مناسب اسلحہ جنگ تھا، نہ توپ خانہ۔ نہ رسد رسانی کا انتظام نہ کوئی اور سہولت۔ دوسری طرف سکھ فوج کے بہترین دستے تھے جو جدید ہتھیاروں سے لیس تھے اور جن کی تربیت دنیا کے بہترین یورپی جرنیلوں نے کی تھی۔ سکھوں کا جرنیل پھولا سنگھ وہ شخص تھا جس کی بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ملتان فتح کیا تھا۔ پنجاب گورنمنٹ کا ریکارڈ اس کی سفاکی پر شاہد ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ

"پھولا سنگھ اکالی کو اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ مسلمان آبادیوں پر جتنے گھناؤنے ظلم کرنا چاہے، کرے۔"

اکالی اس جوش سے لڑتے تھے کہ انھیں سر پیر کا ہوش نہ رہتا تھا۔ پھولا سنگھ نے چھوٹتے ہی مسلمان غازیوں پر پے بہ پے حملے کیے۔ اس کی کوشش تھی کہ پیر سباک کے پہاڑی مورچوں سے مجاہدین کو پیچھے دھکیل دے لیکن اس طرف سید اکبر شاہ کی قیادت میں غازی بھی سر پر کفن باندھے لڑ رہے تھے، دن بھر زبردست رن پڑا۔ تین بار سکھوں نے پوری طاقت سے غازیوں کے مورچوں پر چڑھائی کی لیکن تینوں بار غازیوں نے انھیں پسپا کر دیا۔ ادھر عظیم خان اپنے لشکر اور توپ خانے سمیت دریا کے دائیں کنارے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اگر وہ مجاہدین کی تھوڑی بہت بھی امداد کرتا تو وہ سکھوں کو ختم کر کے رکھ دیتے لیکن عظیم خان کو نہ اپنے بھائیوں پر اعتماد تھا نہ اپنے زورِ بازو پر۔ اسے شک تھا کہ یار محمد خان اور سلطان محمد خان رنجیت سنگھ سے دوستی گانٹھنے کی فکر میں تھے۔ عرصہ تک میدانِ جنگ کا یہی عالم رہا بلکہ قریب تھا کہ سکھوں کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ یہ حال

دیکھ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ دریا کو پار کر کے خود اپنے ہاتھی پر سوار، اپنے سورماؤں کو للکارتے ہوئے غازیوں کے مورچوں پر حملہ آور ہوا۔ سکھ مہاراجہ کو خود لڑتے دیکھ کر سکھوں کا حوصلہ بڑھا لیکن مجاہدین پھر بھی ڈٹے رہے۔ اس پر سکھ مہاراجہ گورکھا سپاہیوں کی دو رجمنٹوں اور اپنے باڈی گارڈ سواروں کو لے کر غازیوں پر ٹوٹ پڑا ــــ گورکھا سپاہی پہاڑی جنگ کے ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ مہاراجہ کے جوش دلانے پر وہ دیوانہ وار لڑے۔ مقابلے میں غازیوں نے بھی کمال کی اسلامی حمیت کا ثبوت دیا۔ بیس ہزار میں سے دس ہزار لڑتے لڑتے زخمی اور شہید ہوئے۔ شام کا اندھیرا چھا رہا تھا لیکن ایک مورچہ پر دو سو پختون غازی پھر بھی ڈٹے ہوئے تھے۔ آخر میں وہ تلواروں سے دست بدست لڑتے رہے اور ایک ایک کر کے سبھی نے راہِ خدا میں جان دے دی لیکن قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ سرحدی جنگوں میں یہ ایک یادگار جنگ تھی ــــ سیّد اکبر شاہ کی کمان میں غازیوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ دوسرے دن غازیوں نے پھر صبح سویرے ہی دشمن پر حملے شروع کر دیے لیکن اتنی بڑی سکھ فوج کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔

نوشہرہ کے قریب ترکئی کا وسیع قبرستان اب بھی سیّد اکبر شاہ کے سرفروش ساتھیوں کی شجاعت کا زندہ نشان بنا ہوا ہے۔ دوسرے دن دریائے کابل کے بائیں کنارے سکھ مہاراجہ اور اس کے سردار کھڑے اپنے زخموں کو چاٹ رہے تھے، وہ ان بے سروسامان غازیوں کے مقابلے میں پیر سباک کا یہ معرکہ جیت چکے تھے لیکن انھیں یہ فتح مہنگی پڑی تھی، سکھ فوج کا سب سے نامور جرنیل اکالی پھولا سنگھ لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اس کی ہلاکت پر سکھ دربار میں صف ماتم بچھ گئی۔ رنجیت سنگھ نے پیر سباک کے مقام پر اس کی شایان شان

"سمادھ" (مقبرہ) تعمیر کرایا اور اس کے ساتھ لاکھوں ایکڑ زرعی اراضی وقف کر دی۔

سکھ حکمران کے مقابلے میں دریائے کابل کے دائیں کنارے کابلی فرمانروا سردار محمد عظیم خان افسردہ و دل شکستہ کھڑا تھا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا کہ اس سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی بندوں کی تھوڑی بہت مدد کرتا یا اپنے توپ خانے سے دو ایک گولے ہی سکھ فوج کو ہراساں کرنے کے لیے چلا دیتا —— اس نے اپنا ساز و سامان اکٹھا کیا اور کابل کی راہ لی لیکن پشیمانی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ راستے ہی میں فوت ہو گیا۔ مرتے وقت وصیت کی کہ میرے چھوڑے ہوئے خزانہ کو جنگی تیاریوں پر خرچ کیا جائے لیکن اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

اس فتح کے بعد رنجیت سنگھ شیر ہو گیا، وہ پشاور پر چڑھ دوڑا۔ دارالحکومت کے محلّات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ باغ تباہ کر دیے۔ جو سامنے آیا اسے تہ تیغ کر دیا۔ پشاور کے سردار سلطان محمد خان اور یار محمد خان نے اب کے پھر وہی کچھ کیا جو وہ کرتے چلے آئے تھے۔ انھوں نے سکھ حکمران کو اعلیٰ درجے کے گھوڑے ہیرے جواہرات اور تحفے تحائف پیش کیے اور اس سے صلح کر کے اس کا باجگذار بننا قبول کر لیا۔

بادشاہ ہزارہ

سنہ ۱۸۲۴ء میں مجاہد کبیر سید اکبر شاہ نے ہزارہ کا رخ کیا۔ ہر معرکے میں وہ سکھوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔ اس نے تحریک مجاہدین کو ہر ممکن تقویت بہم پہنچائی اور ہر معرکے میں ان کا ساتھ دیا۔ تاہم مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرتے ہی سکھوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس پر مزید یہ کہ سکھ انگریزوں سے ٹکرا

بگسٹے اور پے بہ پے شکستیں کھائیں۔ سکھوں کی طاقت کمزور پڑتے ہی ہزارہ اور صوبہ سرحد میں طوائف الملوکی مچ گئی۔ کوئی مضبوط حکومت نہ رہی۔ امن و امان غارت ہو گیا، ہر شخص کی جان، مال اور آبرو خطرے میں پڑ گئی۔ ایسے میں سید اکبر شاہ کی تجویز پر ہزارہ کے تمام سرکردہ قبائل کا ایک نمائندہ جرگہ ہری پور میں منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس کے بعد نہ کسی سلطان کا حکم چلے گا نہ کسی راجہ کا۔ صرف اور صرف اسلامی نظامِ حکومت کو تسلیم کیا جائے گا جس میں شرعی قوانین پر عملدرآمد ہوگا۔ اس جرگہ میں اتفاق رائے سے سید اکبر شاہ آف ستھانہ کو علاقے کا بادشاہ اور غلام خان ترین اور نواب خان آف شنگڑی کو وزیر منتخب کیا گیا۔

ساری قوم نے عشر اور زکوٰۃ دینا منظور کیا۔ مقدمات اور تنازعات کے فیصلے شرع محمدی کی رو سے کیے جانے لگے اور اس طرح پہلی بار اس علاقے میں ایک اسلامی، جمہوری اور فلاحی مملکت کی داغ بیل پڑی اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ تاہم چونکہ اس حکومت کو کام کرنے کا بہت تھوڑا موقع ملا کیونکہ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی فرنگی قوانین نافذ ہو گئے۔ اس لیے اسے "گنڈٹی مسلمانی" یا "اسلام کا مختصر دورِ حکومت" کہا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس اولین اسلامی حکومت کے قیام میں بھی سید اکبر شاہ ہی کی کوششوں کا نمایاں حصہ ہے۔

سید اکبر شاہ کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف سبھی اہل سرحد کو تھا اس لیے آگے چل کر انھیں عوام نے اس سے بھی بڑا اعزاز بخشا۔ اب تک حالت یہ تھی کہ سوات، بونیر اور نواحی علاقے کبھی کسی غیر ملکی طاقت کے زیرِ اقتدار نہ آئے تھے۔ تاہم ۱۸۴۹ء میں عنانِ حکومت سنبھالتے ہی فرنگی سامراجیوں نے ان علاقوں پر بھی فوج کشی شروع کر دی۔ گائیڈ رسالے کا ایک دستہ

رسالدار فتح خان خٹک کی سربراہی میں علاقہ یوسف زئی پر حملہ آور ہوا۔ اس نے پنجتار کی پہاڑیوں میں باغ کلی پر حملہ کر کے گاؤں کے تمام مکانات جلادیے تاہم فرنگی لشکر کو وہاں زیادہ تر ٹھہرنے کا حوصلہ نہ ہوا اور وہ جلد ہی مردان چھاؤنی کو لوٹ گیا۔

اُن دنوں سوات اور بونیر میں مشہور روحانی پیشوا غوث سوات، اخون صاحب عبدالغفور علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ لوگ ہر معاملے میں انہی سے رہنمائی کے طالب تھے، اخون صاحبؒ اور دوسرے اکابر فرنگی کی اس ناپاک جرأت پر بڑے حیران ہوئے اور انھوں نے اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ حضرت اخون صاحبؒ جانتے تھے کہ اگر قبائل متحد رہے تو کسی کو بھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ ہو سکے گی۔ اس لیے انھوں نے علاقے کے تمام قبائل کا ایک نمائندہ اجلاس سید و شریف میں بلایا اور تمام حاضرین سے پُر درد اپیل کی کہ اگر وہ اپنی آزادی اور سلامتی چاہتے ہیں تو فوری طور پر متحد ہو جائیں اور اپنی ایک منظم اسلامی شرعی حکومت قائم کریں۔" جرگے کے تمام ارکان نے حضرت اخون صاحب کی اپیل پر لبیک کہا البتہ دیر کے خان غزن خان جرگے سے اٹھ کر چلے گئے۔

حضرت اخون صاحب نے عوام کے صلاح و مشورے سے حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے گھرانے کے سربراہ سید اکبر شاہ کا نام علاقے کی بادشاہت کے لیے تجویز کیا، مجاہد ملت سید اکبر شاہ کی صلاحیتوں اور خوبیوں کے پیش نظر تمام حاضرین نے تجویز سے اتفاق کیا اور یوں سید اکبر شاہ کو صوبہ سرحد میں وہ منفرد اعزاز حاصل ہوا جو اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہوا تھا۔ سید اکبر شاہ کو مقامی عمائدین کے علاوہ تحریک مجاہدین کے اکابر کی حمایت بھی حاصل تھی۔

یہ واقعہ ۱۸۵۰ء کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں نے اتفاق رائے سے حضرت اخون صاحب سوات کو علاقے کا شیخ الاسلام مقرر کیا اور یوں سوات، بونیر اور نواحی علاقوں میں ایک شرعی اور اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔

اسلامی نظام کی برکت سے سارا علاقہ امن و امان کا گہوارہ بن گیا، لوگ آپس کے تنازعات اسلام ہی کے نظامِ عدل کے تحت طے کرنے لگے۔ ہر کوئی بخوشی عشر اور زکوٰۃ ادا کرتا۔ اتحاد و اتفاق اور خوشحالی کی یہ فضا ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔ یہ وہ دن تھا جب مجاہدِ ملّت سید اکبر شاہ وفات پا گئے۔ اتفاق سے یہ وہی دن تھا جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی خبر پشاور پہنچی تھی، اس دور کے کمشنر پشاور سر ہربرٹ ایڈورڈز نے بعد میں سید اکبر شاہ کی وفات کے بارے میں کہا۔ "اگر سوات کی شرعی حکومت کا بادشاہ سید اکبر شاہ زندہ ہوتا تو آج ہمارے لیے صورتِ حال کچھ اور ہی ہوتی"۔

سید اکبر شاہ کی وفات کے بعد ان کے فرزند سید مبارک شاہ کچھ عرصہ کے لیے سوات اور بونیر کی اسلامی حکومت کے سربراہ رہے، بعد میں علاقے کی روحانی اور دنیوی سیادت حضرت اخون صاحبؒ ہی کی اولاد کے ہاتھوں میں رہی۔ میاں گل عبدالودود خان نے اسلامی بنیادوں ہی پر ریاست سوات کی بنیاد رکھی جسے ان کے نامور جانشین میاں گل عبدالحق جہاں زیب نے ایک جدید، ترقی یافتہ اور مثالی ریاست بنا دیا۔ ۱۹۶۹ء تک انھوں نے کمال عدل و انصاف سے ریاست پر دادِ حکومت دی، جس کے بعد یہ ریاست پاکستان میں ضم کر دی گئی اور اسے ایک ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔

شیر علی آفریدی

۸ر فروری ۱۸۷۲ء کی شام جزائر انڈیمان کی تاریخ کی یادگار شام تھی — جزائر انڈیمان خلیج بنگال کے وہ سیہ بخت جزیرے ہیں جنھیں "کالا پانی" بھی کہا جاتا ہے۔ برطانوی دور میں عمر قید کے سزا یافتہ قیدی وہاں بھیج دیے جاتے۔ وہیں وہ محنت مشقت کرتے اور قید کے دن پورے کرتے۔ جزیرہ میں قیدیوں اور ان کے نگران عملہ کے علاوہ اور کوئی آبادی نہ تھی۔ قیدیوں پر فرنگی مظالم کے واقعات اکثر اخبارات میں موضوعِ بحث بنتے اور حکومت پر زور دیا جاتا کہ قیدیوں کی اصلاح و آسائش پر زور دیا جائے۔

۱۸۶۹ء میں لارڈ میو ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا تو اس نے اس مسئلے پر خصوصی توجہ دی، اسی کے کہنے پر ۱۸۷۱ء میں قیدیوں کو کچھ مراعات دی گئیں۔ اس اقدام سے وائسرائے کی شہرت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوا۔ لارڈ میو کی خواہش تھی کہ وہ انڈیمان جائے اور قیدیوں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ پروگرام بنایا گیا جس کے مطابق وائسرائے ۸ر فروری ۱۸۷۲ء کی صبح کو شاہی بجرے میں انڈیمان پہنچا۔ لیڈی میو اور بڑے بڑے عمائدینِ حکومت بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب برِّصغیر کا ایک وائسرائے حرماں نصیب قیدیوں کی بستی انڈیمان انڈیمان دیکھنے آرہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جزیرے کے باسیوں میں غیر معمولی جوش و خروش

پایا جاتا تھا ـــــ اکیس ۲۱ ضرب گولوں سے وائسرائے کی سلامی اتاری گئی، لوگ اسے خوش آمدید کہنے قطاروں میں کھڑے تھے۔ سارا دن لارڈ میو قیدیوں کی بارکوں، ورکشاپ اور فیکٹریوں وغیرہ کا معائنہ کرتا رہا۔ شام ہوئی تو جزیرے کی ایک پہاڑی چوٹی "مونٹ ہیریٹ" (MOUNT HARRIET) پر جا بیٹھا۔ یہ پہاڑی خاصی اونچی تھی اور اسے ایک عمدہ سیرگاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وائسرائے نے وہاں بیٹھ کر غروب آفتاب کا نظارہ کیا۔ وہ بڑا لطف اندوز ہوا ـــــ یہاں تک کہ اندھیرا پھیلنے لگا تو لارڈ میو بادلِ ناخواستہ اٹھا اور واپس جانے کا ارادہ کیا۔

راستے میں ایک پل پڑتا تھا جس کا نام "ہوپ ٹاؤن پل" تھا۔ اس پل سے لارڈ میو کو ایک کشتی کے ذریعے اپنے شاہی جہاز میں (جو کچھ فاصلے پر خلیج میں لنگر انداز تھا) جا کر رات گزارنی تھی۔ مشعلیں اٹھائے دو شخص اس کے آگے چل رہے تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری اور باڈی گارڈ دائیں بائیں رواں تھے۔ پولیس کی مسلح گارد پیچھے پیچھے تھی۔ وائسرائے اور پرائیویٹ سیکرٹری خراماں خراماں جا رہے تھے۔ جونہی انہوں نے کشتی میں قدم رکھنا چاہا تو کچھ آہٹ ہوئی۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے دیکھا تو پتہ چلا کہ ایک آدمی لارڈ میو کی پشت پر چھری سے وار کر رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی دس بارہ سپاہی حملہ آور پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ہاتھ سے چھری چھین لی۔ حملہ آور ایک قیدی تھا۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے بمشکل اس کی جان بچائی ورنہ محافظ اسے مار دیتے۔ اس افراتفری میں مشعلیں گل ہو گئیں تھیں اور سبھی لوگ سراسیمہ اور دہشت زدہ سے تھے۔

دوبارہ مشعلیں روشن ہوئیں تو پتہ چلا کہ وائسرائے ہند زخمی ہو کر پانی میں گر گیا تھا اور رومال سے اپنا چہرہ پونچھ رہا تھا۔ پرائیویٹ سیکرٹری کے دریافت کرنے پر وائسرائے میو نے کہا۔ "مجھے زخم آیا ہے ـــ تاہم فکر نہیں۔ زخم معمولی ہے۔"

مشعلیں قریب لائی گئیں تو پتہ چلا کہ وائسرائے کی پشت سے کوٹ کٹا ہوا تھا۔ اور اس سے خون پرنالے کی طرح بہہ رہا تھا۔ ہمراہیوں نے رومالوں سے خون کو روکنے کی کوشش کی۔ دو تین منٹ تک تو وائسرائے نے ضبط سے کام لیا پھر اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور وہ پیچھے کی طرف گر گیا۔ ایک بار اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور دھیمی آواز میں کہا۔ "میرا سر تھام لو" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی ختم ہو گئی۔

وائسرائے کو اس کے جہاز پر لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے دیکھا تو اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ زخم کاری تھے۔ شانے سے لے کر سینے تک گہرے زخم تھے۔ لارڈ میو دیو قامت اور مضبوط انسان تھا کہ اتنے زخم سہہ گیا ورنہ عام آدمی ایسا ایک زخم بھی برداشت نہ کر سکتا۔

یہ قاتلانہ حملہ ایک قیدی شیر علی آفریدی نے کیا تھا جو اصلاً تیراہ کا رہنے والا تھا اور کمشنر پشاور کے اردلی کے طور پر ملازمت کرتا تھا۔ شیر علی طبعاً اچھا آدمی تھا لیکن خاندانی دشمنی اور انتقام کے جذبے نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ اس کے قبیلے کی دو شاخوں میں ایک عرصہ سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جس فریق کو موقع ملتا دوسرے کو جان سے مار دیتا۔ کئی قیمتی جانیں جذبۂ انتقام کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ ایک بار اس نے پشاور چھاؤنی میں اپنے دفتر کے نواح میں واقع کمپنی باغ میں اپنے ایک تربور (دشمن) کو دیکھ لیا اور اسے گولی سے اڑا دیا۔ کمشنر پشاور کی ناک کے نیچے یہ قتل کہاں چھپ سکتا۔ شیر علی کو گرفتار کر کے اس پر قتل کا مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

شیر علی بڑا خدمت گزار اور وفادار شخص تھا۔ اس نے انگریز افسروں کی بڑی خدمت کی تھی۔ وہ اس زعم میں تھا کہ وہ ان کی سفارش سے بچ نکلے گا لیکن اس

کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور بالآخر ۲ اپریل ۱۸۶۷ء کو اسے پھانسی کا حکم سنا دیا گیا۔

تاہم چونکہ اس کا عام چال چلن اچھا تھا اور جنگِ امبیلہ میں بھی اس نے سرکار انگریزی کی کافی خدمات انجام دی تھیں، اس لیے اس کی اپیل پر سزائے موت کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور (کالا پانی میں عمر قید) میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۸۶۹ء میں وہ جزیرہ انڈیمان پہنچا لیکن وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کسی بڑے انگریز افسر کو قتل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرے گا۔

بظاہر وہ بڑا دیندار شخص تھا، اکثر روزے رکھتا، تنخواہ اور مزدوری سے جو کچھ بچ جاتا وہ خیرات کر دیتا۔ مہینے دوسرے مہینے مسکین قیدیوں کی دعوت کرتا۔ اپنے نیک کردار کی وجہ سے وہ قیدیوں میں بھی بڑا ہر دلعزیز تھا اور نگران عملہ کی نظر میں بھی اس کی بڑی عزت تھی۔ اس کی کڑی نگرانی نہیں کی جاتی تھی اور مشقتی قیدیوں کے لیے اسے حجام بنا دیا گیا تھا۔

وائسرائے لارڈ میو کے اس اچانک قتل سے ساری سلطنتِ برطانیہ میں کہرام مچ گیا۔ تفتیشی ٹیمیں جزیرہ میں پہنچ گئیں اور کام شروع کر دیا۔ انگریزی حکومت کو یقین تھا کہ یہ قتل کسی گہری سازش کا شاخسانہ ہے۔ اتفاق سے ان دنوں تحریک مجاہدین کا سزا یافتہ کارکن محمد جعفر تھانیسری بھی جزیرہ انڈیمان میں قید تھا۔ حکومت کا گمان غالب یہی تھا کہ مولوی محمد جعفر اور دوسرے سرکردہ مجاہدین ہی کے اکسانے پر شیر علی اس قتل کا مرتکب ہوا ہے۔ بڑے بڑے تجربہ کار افسروں کو اس قتل کی تفتیش پر مامور کیا گیا۔ ان میں سے ایک ایشوری پرشاد بھی تھا جس نے پہلے بھی مجاہدین کو کئی مقدموں میں ملوث کیا تھا اور اس طرح اب ترقی پا کر سورج گڑھ کا ڈپٹی کلکٹر بن چکا تھا۔ اسے بھی انڈیمان بھیجا گیا۔ اس نے اس "سازش" میں ان مجاہدین کو ملوث کرنے کی پوری کوشش کی جو پہلے ہی سے وہاں "جرمِ بغاوت"

کی پاداش میں سزائے قید کاٹ رہے تھے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔

شیر علی آفریدی نے مقدمے کے دوران اپنے بیانات میں بتایا کہ دقوعہ کے روز وہ گھات لگائے سارا دن وائسرائے کی آمد کا انتظار کرتا رہا، تاہم اسے حملہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ مایوس ہو کر وہ شام کو ماؤنٹ ہیریٹ پہ جا بیٹھا۔ اسے پروگرام کا علم نہ تھا کہ وہ شام کو وہاں غروب آفتاب کا نظارہ کرنے آئے گا۔ تقدیر خود وائسرائے کو وہاں لے گئی۔ شیر علی آفریدی بظاہر بڑا دبلا پتلا انسان تھا شکل و صورت سے بھی عاجزی ٹپکتی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ چھ فٹ قدو قامت اور مضبوط جثہ والے لارڈ میو پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اس وقت جانے شیر علی خان میں کہاں سے طاقت آگئی تھی کہ لارڈ میو کو ایک ہی حملہ میں موت کی نیند سلا دیا۔

"سرگزشت مجاہدین" میں مولانا غلام رسول مہر نے اس واقعہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ویسے شیر علی بڑا اولوالعزم اور جرأت مند تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک موقع پر اس نے بھاری بیڑی اور ہتھکڑی توڑ کر بتی بجھائی اور گورے پہرے دار کی سنگین چھین کر اسی سے اسے زخمی کر دیا۔ وائسرائے لارڈ میو، پر حملے کے بعد جب اس سے پوچھا جاتا کہ تم نے یہ حملہ کس کی ایماء پر کیا ہے تو وہ صرف یہی جواب دیتا "خدا کے حکم سے"۔

شیر علی پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا ہوئی۔ ۱۱ر مارچ ۱۸۷۳ء کو جب اسے پھانسی گھاٹ پر لایا گیا تو وہ بڑا مطمئن تھا۔ اس نے پھانسی کے رسّے کو چوما اور بلند آواز سے کہا "میں نے جب اس کام کا ارادہ کیا تھا تو اپنے تئیں مردہ سمجھ لیا تھا ـــــ" اس نے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "مسلمان بھائیو! میں نے تمہارے دشمن کو مار ڈالا ـــــ تم گواہ رہو کہ میں

مسلمان ہوں۔"

یہ کہہ کر تنبیر علی کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ دو مرتبہ کلمہ پوری صحت سے پڑھا۔ تیسری بار پھانسی کی رسی سے گلا گھٹنے لگا تو پورا کلمہ ادا نہ کر پایا۔ انگریز اپنے انتقامی جذبہ سے باز نہ آیا، اگرچہ "مجاہدین" پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا پھر بھی ان کی سزائے قید کی مدت میں دس سال کا اضافہ کر دیا گیا۔

○

اخون صاحب سوات

۲۳ر اگست ۱۸۶۳ء کا گرم دن تھا۔ درا مبیلہ کا دشوار گزار پہاڑی درہ، ہندوستان بھر کے طول و عرض سے برطانوی فوج کے دستے دھڑا دھڑ محاذِ جنگ پر پہنچ رہے تھے۔ ایک طرف برطانوی سلطنت کے سب مادی وسائل تھے، دوسری طرف سرزمین یوسف زئی کے بے سروسامان مجاہد — ایک طرف سر نیول چیمبرلین جیسا آزمودہ کار اور جہاندیدہ جرنیل تھا دوسری طرف ایک درویش خدامست حضرت اخون عبدالغفور آف سوات۔ ایک طرف توپ و تفنگ سے مسلح، انتہائی منظم فرنگی فوجی اور دوسری طرف وہ مخلص اور ایثار پیشہ رضا کار جو صرف اللہ کے آسرے پر، شوقِ شہادت سے بےتاب دشمن کے مقابلے پر اترے تھے۔ انگریز نے برصغیر کی چھاؤنیوں سے چُن چُن کر اپنے تمام سپاہی اس سرحدی مہم پر بھجوا دیے تھے یہاں تک کہ گورنر پنجاب کے ۴۲ سپاہیوں پر مشتمل باڈی گارڈز کے علاوہ ایک سپاہی بھی پیچھے نہیں رہ گیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ختم ہوئی تو انگریز نے اپنی ساری توجہ سرزمین یوسف زئی کی تسخیر پر مرکوز کر دی۔ فرنگی سامراج اس طرح ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ایک مقصد تو مہابن کے پہاڑ پر واقع مرکز مجاہدین ملکا کو تباہ کرنا تھا۔ دوسرا مقصد سوات اور بونیر کے سرفروشوں کو سبق سکھانا تھا کہ آئندہ وہ مجاہدین کی امداد سے باز رہیں۔ کبھی انگریز افسر شکار کھیلنے کی آڑ میں آتے اور علاقے کا جائزہ لیتے، کبھی

سیاسی سازشوں کا جال پھیلاتے کہ یوسف زئی مجاہدوں میں اختلافات کو ہوا دیں۔

کشمکش جاری تھی۔ مجاہدین سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنے مورچوں پر ڈٹے ہوئے تھے، جب کبھی موقع ملتا وہ کسی فرنگی کیمپ پر دھاوا بولتے اور دشمن کو خاک و خون میں تڑپتا چھوڑ کر واپس ستھانہ پہنچ جاتے۔ جولائی ۱۸۶۳ء میں فرنگی نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لشکرِ جرار جمع کیا اور ستھانہ کے مرکزِ مجاہدین کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ جواب میں ۷ ستمبر ۱۸۶۳ء کو تحریک مجاہدین کے جیالوں نے گائیڈ رسالہ کے ایک کیمپ پر شبخون مارا اور دشمن کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

یہ معرکے جاری تھے۔ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ بونیر اور سوات پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ایسے میں امیر المجاہدین مولوی محمد عبد اللہ کو روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ وہ غوثِ زماں حضرت اخون صاحب سوات کی خدمت میں پہنچا اور اسلام کے مقدس نام پر ان سے اعانت اور رہنمائی کا طالب ہوا۔ اخون صاحب جہاں ایک طرف عابد شب زندہ دار اور تارک الدنیا بزرگ تھے وہیں اپنے زمانے کے نامور مجاہد بھی۔ انھوں نے امیر المجاہدین کی اپیل قبول کر لی اور جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کر دیا ــــ فرنگی نہیں جانتا تھا کہ حضرت اخون صاحب سوات کے اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کون مسلمان تھا جو اس پاکباز ہستی کے اعلانِ جہاد کے بعد خاموشی سے گھر میں بیٹھا رہتا۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ ساٹھ ہزار مردانِ کار سر پر کفن باندھ کر فرنگی کے خلاف میدان میں اتر پڑے۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں اس قبائلی لشکر کی تفصیل یوں دی ہے :-

حسن زئی دو ہزار، اکازئی ایک ہزار، چغرزئی چھ ہزار، مدّاخیل
چار ہزار، اتازئی ڈیڑھ ہزار، گدون چار ہزار، خدا خیل دو ہزار
بونیر وال بارہ ہزار، باجوڑی تین ہزار، رانی زئی دو ہزار، اہل دیر
چھ ہزار، سواتی دس ہزار، دوسرے لوگ سات ہزار۔

جہاد امبیلہ نے فرنگی کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ بالآخر ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو سر نیول چیمبرلین سات ہزار مشّاق فوج لے کر امبیلہ کی طرف بڑھا۔ وہ ان دنوں سرحدی مہمات کا سب سے زیادہ تجربہ کار جرنیل تھا۔ توپ خانہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ پہاڑی علاقے کی جنگ تھی۔ رسد رسانی کے لیے چار ہزار خچر اس کے ساتھ تھے۔ سارے پنجاب سے اتنی ہی تعداد میں خچر اسے مل سکے تھے۔ ڈھونڈھنے سے بھی کوئی خچر اب کسی جگہ باقی نہ رہا تھا۔

ہر روز فرنگی کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ صوبہ سرحد کی تمام شاہراہوں پر فوجی سپاہی ہی سپاہی نظر آتے تھے۔ قبائلی مجاہد سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے تھے۔ ایسے میں فرنگی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ چیمبرلین ہیڈکوارٹرز کو تار پر تار دیتا کہ مزید کمک بھیجی جائے —— چودہ نومبر تک دھڑا دھڑ فرنگی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا لیکن اس پر بھی جنرل چیمبرلین کو پیش قدمی کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ اس کی ساری فوج امبیلہ کی گھاٹی میں محصور تھی۔ مجاہدین پہاڑی مورچوں سے ان پر آگ برسا رہے تھے۔ ۱۸ نومبر کو اپنی بے سروسامانی کے باوجود مجاہدین نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ایک سو چودہ (۱۱۴) افراد کو ہلاک اور زخمی کر دیا۔ دوسرے دن قبائلی سرفروش پھر شہادت کی تمنّا دلوں میں لیے فرنگی لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ اس معرکہ میں

۱۲۸ فرنگی ہلاک ہوئے! وہ تو دجنرل سر نیویل چیمبرلین بھی مرتے مرتے بچا۔۔۔ دوسرے ہی دن اس نے ہیڈ کوارٹرز کو مطلع کر دیا کہ متواتر ایک ماہ سے دن رات ڈیوٹی دے کر لشکر کی ہمت جواب دے چکی ہے۔ اس لیے تازہ دم کمک کا آنا ناگزیر ہو گیا ہے ۔۔۔ صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھ کر انڈین افواج کا کمانڈر اِن چیف خود کلکتہ سے لاہور پہنچا اور ذاتی طور پر محاذِ جنگ کی نگرانی کرنے لگا ۔۔۔ ساری سلطنت کی بہترین فوجیں محاذ امبیلہ پر پہنچ گئیں ۔۔۔ اس کے باوجود انگریز کو حوصلہ نہ ہوا کہ آگے بڑھے۔ مقابلے میں بے سروسامان قبائلی مجاہد تھے، جن کے پاس صرف چند دن کے لیے سوکھی روٹیاں تھیں اور بس۔ ادھر موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ مجاہدین خیموں اور کمبلوں کے بغیر ساری ساری رات کھلے آسمان تلے گزارتے تھے۔ ایسے ایسے خطرناک مورچے بھی تھے جن پر کبھی مجاہدین کا قبضہ ہو جاتا کبھی فرنگیوں کا ۔۔۔ یہ مورچے نہ کے "قتل گاہ" تھے۔۔۔ جہاد جاری رہا لیکن جیسا کہ سول سروس کے رکن ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے تسلیم کیا ہے۔ "جو کام ہماری سنگینوں سے نہ ہو سکا ہماری ڈپلومیسی نے کر دکھایا"۔ کمشنر پشاور نے تجوریوں کے منہ کھول دیے۔ کمزور لوگوں اور قبیلوں کو بے دریغ روپیہ دے کر ساتھ ملا لیا گیا۔ کئی ایک کو اس پر رضامند کیا گیا کہ وہ چپکے سے محاذ کو چھوڑ کر گھروں کو واپس چلے جائیں۔ انگریز کی مایوسی اور بدحواسی کا یہ حال تھا کہ متواتر تباہی کی خبریں سُن سُن کر وائسرائے لارڈ ایلگن بیمار پڑ گیا اور بالآخر دنیا ہی سے چل بسا۔

۲۲ دسمبر ۱۸۶۳ء تک یہ خونیں معرکے جاری رہے۔ اس عرصہ میں بونیر کے زیداللہ خان اور دوسرے چند سرکردہ افراد کو فرنگی نے صلح پر رضامند کر لیا۔ اس صلح نامہ کی رُو سے کچھ انگریز افسر زیداللہ خان کے ہمراہ مجاہدین کے مرکز ملکا

گئے اور چند جھونپڑیوں کو آگ لگا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ یہ فرنگی دستہ اس کارروائی کے فوراً بعد واپس اپنی چھاؤنی میں پہنچ گیا ـــــ غزا میں سینکڑوں مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ تاہم فرنگی لشکر کو بھی بے اندازہ نقصان پہنچا۔ اس کے مدتوں بعد بھی فرنگی کو یہ یارا نہ ہوا کہ سوات، بونیر یا باجوڑہ کا رُخ کرے۔ یہ سرحدی علاقے جس طرح روزِ اول سے آزاد تھے آزاد ہی رہے۔

جہادِ امبیلہ کے روحِ رواں حضرت اخون عبدالغفور صاحب علیہ الرحمۃ تھے۔ جن کی روحانی عظمت کا پھریرا آج بھی لہرا رہا ہے۔ وہ فقیر تھے لیکن انھوں نے شہنشاہوں کے منہ پھیر دیے۔ ان کی برکت اور حسنِ عمل سے سارے قبائل متحد و متفق ہو گئے اور انھوں نے اتنے زبردست دشمن کو عبرتناک سزا دی۔ اہل سوات و بونیر اس وقت بھی ان کی برکات سے متمتع ہوئے اور آج بھی ان کے فیوض سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ ایسے ہی عظیم ہستیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

آن مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

غوثِ سوات حضرت اخون صاحب کا نام نامی عبدالغفور ہے۔ وہ ۱۷۸۴ء میں علاقہ شامیزئے کے گاؤں "جبڑی" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالواحد تھا۔ وہ صافی مہمند قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ شروع ہی سے ان کا رجحان دین کی طرف تھا۔ پرہیزگاری اور تقویٰ میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز تھے، قبائلی علاقوں میں ان دنوں دینی مدرسے بہت کم تھے۔ اس لیے اخون صاحب کبھی ایک جگہ کسی عالم دین سے استفادہ کرتے کبھی دوسرے سے تلاشِ علم

میں وہ پشاور بھی آئے اور اپنے دور کے مشہور عالم دین حافظ محمد عظیم (گنج والوں) کی شاگردی میں چار سال گزارے۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے پشاور کی مشہور روحانی شخصیت میاں غلام محمد عرف حضرت جیؒ سے بھی فیض پایا۔ پھر چمکنی میں حضرت محمد عمرؒ کی زیارت سے ملحقہ مدرسے میں پڑھتے رہے۔ انھوں نے تہکال بالا کے محمد یوسف الکوزئی کے پاس اور زیارت کاکا صاحب میں بھی وقت گزارا۔ دینی علوم کی تکمیل کے بعد باطنی تربیت کے لیے انھوں نے سلسلۂ قادریہ میں حضرت محمد شعیبؒ تورڈھیر کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت اخون صاحب کی استقامت کا یہ عالم تھا کہ متواتر بارہ برس تک دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع چھوٹے سے گاؤں "بیکی" میں چلّہ کشی کرتے رہے۔ اپنے مرشد حضرت محمد شعیبؒ کی وفات پر انھوں نے سیدو شریف سوات میں اقامت اختیار کر لی۔

حضرت اخون صاحب ایک عالم، باعمل اور صوفی باصفا ہی نہ تھے بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے۔ وہ کفر کے خلاف ہر کوشش جہاد میں شرکت کو اپنے لیے فخر تصور کرتے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں افغانستان کے امیر دوست محمد خان نے سکھوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت اخون صاحب کو بھی اس کار خیر میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس پر اخون صاحبؒ اپنے سینکڑوں ارادتمندوں کے ہمراہ شریک جہاد ہوئے۔

حضرت اخون صاحب سوات نے پوری کوشش کی کہ سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی غلط اور غیر اسلامی رسموں کا خاتمہ ہو۔ لوگ متحد اور متفق ہوں اور سچی اسلامی زندگی گزاریں۔ تبلیغ دین کے لیے انھوں نے کئی مساجد اور مدرسے تعمیر کیے۔ لنگر جاری کیا اور وعظ و ارشاد سے لوگوں کے قلوب کو منور کیا۔ ان کی

ساری زندگی مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف رہی۔ انہی کے کہنے پر سیدو شریف میں تمام نواحی علاقوں کے سرکردہ لوگوں کا ایک نمائندہ اجتماع (جرگہ) منعقد ہوا جس میں انہی کی تحریک پر ستھانہ کے نامور بزرگ سید اکبر شاہ کو سوات کی اسلامی مملکت کا بادشاہ منتخب کر لیا گیا اور شرعی قوانین کے مطابق ریاست کا نظم و نسق چلایا جانے لگا۔ خود لوگوں کے اصرار پر حضرت اخون صاحب کو "شیخ الاسلام" کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ واقعہ ۱۸۵۰ء کا ہے۔

۱۸۵۷ء میں سید اکبر شاہ نے وفات پائی تو سید مبارک شاہ کو ان کا جانشین بنایا گیا تاہم ان کا رجحان دین کی بجائے سیاست کی طرف زیادہ تھا اس لیے یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

۱۸۶۳ء میں امبیلہ کے جہاد میں اخون صاحب سوات ہی کے کہنے پر سارے علاقے کے قبائل نے متحد و متفق ہو کر فرنگی سامراج کا مقابلہ کیا اور انگریز کو وہ سبق سکھایا کہ بالآخر اسے صلح کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اس موقع پر انھوں نے ہر طرح کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تحریک مجاہدین اور اس کے قائد مولوی محمد عبداللہ کا ساتھ دیا۔

بعد میں حضرت اخون صاحب ہی کی بصیرت اور حکمت عملی سے سوات اور بونیر کے علاقے انگریز کی دست برد سے محفوظ رہے۔ فرنگی کو اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ امبیلہ میں اس مقام پر جہاں حضرت اخون صاحب کا قیام تھا ایک خوب صورت مسجد تعمیر کر دی گئی ہے جو آج بھی ہمیں جہاد امبیلا کی یاد دلاتی ہے۔

۵ جنوری ۱۸۶۴ء کو انگریزی لشکر واپس پشاور چلا گیا۔ اس لڑائی میں اس کے ایک ہزار کے قریب سپاہی اور افسر ہلاک اور زخمی ہوئے۔ انگریز نے

اپنی اس شفقت کا بدلہ یوں لیا کہ ان تمام ہندوستانی مسلمانوں پر، جو مجاہدین کی مالی امداد کیا کرتے تھے، مقدمات قائم کر دیے۔ خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء میں بہت سے سرکردہ لوگوں کو پھانسی اور عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ اس طرح مجاہدین بے یار و مددگار رہ گئے۔

۲؍اگست ۱۸۶۸ء کو زید اللہ خان نے ایک سواتی سوداگر کو لوٹ لیا۔ حضرت اخون نے اس کی تلافی کے لیے ایک لشکر زید اللہ خان کے مقابلے کو بھیجا۔ قدرت کا انتقام دیکھیے کہ اخون صاحب کے عقیدت مندوں میں سے کسی نے اسی ریوالور سے زید اللہ خان کا خاتمہ کر دیا، جو انگریزوں نے اسے انعام کے طور پر دیا تھا۔

حضرت اخون صاحب سوات نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے سوات و متعلقات کو انگریزوں کے اثر و نفوذ سے آزاد رکھا۔ انگریز کو کوئی ایسا بہانہ مہیا نہ کیا جس کی بناء پر وہ جنگ چھیڑ سکے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ "اخون صاحب ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جو قبائل میں حیرت انگیز رسوخ رکھتی تھی"۔ سید جمال الدین افغانی نے بھی "البیان" کے تتمے میں اخون صاحب کے زہد، ان کی پاکیزگی اخلاق، ان کے شوق جہاد اور حریت پسندی کی بڑی تعریف کی ہے۔ پادری ہیوز (HUGHES) تک نے ان کی کرامات کو تسلیم کیا ہے۔

ان کے اسی اثر و رسوخ اور اسلامی خدمات کا نتیجہ تھا کہ جب سوات میں ایک آزاد قومی اور اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی تو اخون صاحب ہی کے اخلاف کو اس کا سربراہ چنا گیا۔

باہمی تنازعات اور دیگر کے ساتھ معرکوں کے باعث جب سرزمین سوات بدنظمی کا شکار ہو گئی تو تمام قبائل کا ایک مشترکہ جرگہ نیکی خیل کے علاقہ میں کبل کے

مقام پر بلایا گیا، سب قبیلوں نے بالاتفاق نومبر ۱۹۱۸ء میں اخون صاحب سوات کے پوتے میاں گل عبدالودود کو سوات کا بادشاہ منتخب کر لیا۔ میاں گل نے سوات میں ایک مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی اور علاقے میں امن وامان بحال کیا۔ چنانچہ ۳/ مئی ۱۹۲۶ء کو حکومت برطانیہ نے باقاعدہ طور پر ریاست سوات کو تسلیم کر لیا اور میاں گل عبدالودود اس کے پہلے والی قرار پائے۔ ۶۳ سال کی عمر کو پہنچنے پر میاں گل صاحب نے عنانِ حکومت اپنے فرزند میاں گل عبدالحق جہاں زیب کے حوالے کر دی۔ نئے والیٔ سوات نے ریاست کو ہر طرح سے ایک ترقی یافتہ اور جدید ریاست بنا دیا۔ ۲۸/ جولائی ۱۹۶۹ء کو حکومت کے ایک فرمان کے مطابق ریاستیں ختم کر دی گئی ہیں اور سوات کو صوبہ سرحد کا ایک ضلع بنا دیا گیا۔

یہ حضرت اخون صاحب سوات ہی کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ ان کے خلفاء نے بھی اسلامی جہاد کو اپنا دستورِ حیات بنائے رکھا، چنانچہ حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب، سعداللہ خان المعروف سرتور فقیر، منڈاکئی ملا صاحب اور حضرت پیر عبدالوہاب مانکی شریف نے اپنے عظیم مرشد کے مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑا کام کیا اور ان حضرات نے بھی اپنے پیر مرشد کی طرح بڑی شہرت پائی۔

قطب الاقطاب، غوثِ زمان، رئیس المجاہدین حضرت اخون عبدالغفور بابا نے ۲۲/ جنوری ۱۸۷۷ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ فرمایا۔ ان کا مزار اب بھی سیدو شریف میں مرجع خاص وعام ہے۔

حضرت نجم الدّین ہڈہ مُلّا

صوبہ سرحد میں فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کی تحریک میں حضرت نجم الدین عرف ہڈہ ملّا صاحب نے وہ کارنامے انجام دیے جنھیں کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ ویسے بھی ان کی عظمت و رفعت کو سمجھنے کے لیے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ رئیس المجاہدین حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی کے مرشد و مربی تھے۔ ان کے فیضانِ تربیت کی بدولت ان کے ارادت مندوں کی خاصی بڑی تعداد نے جہاد میں عملاً حصہ لیا اور اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

اخونزادہ حضرت نجم الدین افغانستان کے ایک گاؤں ہڈہ کے رہنے والے تھے اور اسی نسبت سے ہڈہ ملّا کہلاتے تھے۔ ان کا تعلّق اپنے علاقہ کے ایک نامور علمی گھرانے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہاں کے جیّد علماء سے پائی۔ جب ہوش سنبھالا تو پشاور شہر چلے آئے۔ ان کے گھرانے کے کچھ لوگ محلہ کاکڑاں میں رہائش پذیر تھے چنانچہ ہڈہ ملّا بھی انھی کے پاس رہنے لگے۔ ذہین نوجوان تھے، تھوڑے ہی عرصہ میں ظاہری علوم کی تکمیل کر لی تاہم باطنی تربیت اور تزکیۂ نفس کے لیے انھیں مرشدِ کامل کی تلاش ہوئی تو وہ سوات چلے گئے اور حضرت اخون صاحب سوات سے سلسلۂ قادریہ بیعت ہو گئے۔ انھوں نے حضرت اخون صاحب سوات کی شانِ جلالی سے بھی حصہ پایا اور شانِ جمالی سے بھی۔ ۱۸۶۳ء میں

وہ پہلی بار امبیلہ کی غزا میں شریک جہاد ہوئے اور اس وقت سے لے کر اپنی وفات (سنہ ۱۹۱۶ء) تک فرنگی کے خلاف ہر قابل ذکر معرکے میں مصروف جہاد رہے۔ حضرت اخون صاحب سوات کے خلفاء میں سے سب سے زیادہ شہرت انہی کے حصے میں آئی۔

اللہ نے ان کی زبان میں وہ تاثیر رکھ دی تھی کہ وعظ کرتے تو اس کا ایک ایک لفظ سامعین کے دلوں میں اترتا جاتا۔ خود اخون صاحب سوات انھیں تبلیغ جہاد کے لیے مختلف مقامات پر بھیجتے۔ وہ جہاں بھی فضائل جہاد بیان کرتے لوگ سروں پر کفن باندھ کر فرنگی جیسے جابر حکمرانوں کے سامنے ڈٹ جاتے۔ خان سعادت خان آف لالپورہ (مہمند) حضرت اخون صاحبؒ کا عقیدت مند تھا۔ ہڈہ ملا صاحب وہاں گئے تو خان نے پانچ سو مجاہد اپنے بیٹے سلطان محمد خان کی سرکردگی میں سامراجیوں کے خلاف جہاد میں شرکت کے لیے بھیجے۔ ان غازیوں نے اپنی پوری قوت سے شبقدر پر حملہ کیا۔ سات غازی شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے اس پر سلطان محمد خان کا چھوٹا بھائی نوروز خان تین ہزار آٹھ سو مہمند مجاہدوں کو لے کر آن پہنچا۔ اس جیش میں کچھ سوار بھی تھے۔ غازیوں نے پورے جوش ایمانی سے انگریز سے ٹکر لی۔ ۲ جنوری ۱۸۶۴ء کو خود ہڈہ ملا صاحب نے دعا کے ساتھ انھیں محاذ پر بھیجا، تاہم اس اثنا میں حضرت اخون صاحب سوات برطانوی حکمرانوں سے صلح کا اعلان کر چکے تھے اس لیے مجاہدین نے بھی لڑائی سے ہاتھ روک لیا۔

میدان جہاد میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت ہڈہ ملا نے تبلیغ اسلام اور اصلاح المسلمین کے سلسلے میں بھی شاندار خدمات انجام دیں۔ انھوں نے جگہ جگہ دینی مدرسے قائم کیے، قوم پر مسلط ذہنی جمود کو توڑا۔ لوگوں

میں نیا جوش اور جذبہ پیدا کیا اور ان میں روحِ جہاد پھونک دی۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے انھوں نے مسلسل کوششوں سے ان فضول رسوم و رواج کا خاتمہ کیا جو اندر ہی اندر قوم کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ آپس کے تنازعات کے حل کے لیے شرعی عدالتیں قائم کیں اور اس طرح ایک نئے اور صحت مند مسلم معاشرہ کی تعمیر میں ہر امکانی کوشش کی۔

۱۸۹۷ء میں یونان کی حمایت میں انگریزوں اور دوسری یورپی طاقتوں نے ترکی پر حملہ کر دیا تو دنیا بھر کے مسلمان تڑپ اٹھے۔ ایسے میں سرحد کے غیور قبائل میں سخت ردِ عمل کا اظہار ہوا۔ چترال سے لے کر وزیرستان تک کے تمام مردانِ مجاہد نے فرنگی سامراج کے خلاف کھلم کھلا اعلانِ جہاد کر دیا۔ اس پر ہندوستان بھر کی فوجیں صوبہ سرحد میں جمع کر دی گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قبائلی علاقوں پر اتنے بڑے پیمانے پر فوج کشی کی گئی۔ اگر اس موقع پر ہڈے ملا صاحب اور ان کے مرید سعد اللہ خان عرف سرتور فقیر سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں نہ اترتے تو فرنگی آسانی سے ان علاقوں پر قبضہ کر کے اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کرتے۔

۲۶/جولائی ۱۸۹۷ء کا گرم دن تھا اور سہ پہر کا وقت، مالاکنڈ کے قلعے پر برطانوی پرچم "یونین جیک" کے سائے میں انگریز افسر کلب میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کوئی تاش اور بلیرڈ سے جی بہلا رہا تھا اور کوئی جام پر جام لنڈھا کر دن بھر کی کوفت مٹا رہا تھا۔ ایسے میں باہر ڈھول اور سُرنا کی آواز سنائی دی، بیرے سے پوچھا گیا۔ "باہر کیا ہے؟" اس نے بتایا۔ "ایک قلندر سبز جھنڈا اٹھائے جا رہا ہے۔ بچے اور نوجوان ساتھ ہیں، سب بآوازِ بلند لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ورد کر رہے ہیں۔ شاید کسی زیارت پر چڑھاوا چڑھانے جا رہے ہوں۔"

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک سنتری نے آکر رپورٹ گزاری۔ "سامنے پہاڑی پر لوگ جمع ہو رہے ہیں۔" یہ باتیں سن کر فرنگی کمانڈر تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا — اس نے سوچا پہلے بھی تو لوگ کئی تقریبات پر اسی طرح ڈھول اور باجے تاشوں کے ساتھ جایا ہی کرتے ہیں۔ پھر خطرے کی کیا بات ہو سکتی ہے —" چنانچہ قلعے کے اندر چہل بازیاں اسی طرح جاری رہیں۔ اتنے میں شام ہو گئی۔ بتیاں روشن ہوتے ہی وہ کھانے کی میز کی طرف بڑھے لیکن ابھی کھانے کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ خطرے کا بگل بجا۔ کھانا وہیں چھوڑ کر وہ اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھے۔ وردیاں پہن لیں اور ہتھیار سنبھال لیے۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ پہاڑی سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں آ آ کر کیمپ میں گرنے لگیں — قلعے میں اس وقت کئی انگریز رجمنٹیں تھیں۔ انھیں لڑائی کا سان گمان بھی نہ تھا — ۱۸۹۳ء کی چترال کی فوجی مہم کے بعد ہر طرف کامل امن و سکون تھا — اس اچانک حملے نے انھیں حیرت زدہ کر دیا — پھر مدمقابل کون تھا — ایک دیوانہ — ایک مست قلندر جسے لوگ "سرتور فقیر" کے نام سے پکارتے تھے اور اس کے ساتھ یہی سو ڈیڑھ سو لڑنے والے — لیکن وہ لوگ بجلی کی سی تیزی سے آئے اور انھوں نے امان درّہ پر قبضہ کر لیا — پھر وہ آگے بڑھے اور مالاکنڈ کی تجارتی سرائے بلکہ انگریزی چھاؤنی کی پریڈ گراؤنڈ تک پہنچ گئے — ساری رات لڑائی ہوتی رہی — ایک ایک مجاہد نے کئی کئی گوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا — جواب میں فرنگی کی توپیں آگ اگلتی رہیں، اُن کی مشین گنوں سے گولیاں بارش کی طرح برستی رہیں۔ روشنی کے گولے پھٹتے تو نظر آتا کہ یوسف زئی سرفروش تلواریں سنبھالے، نعرے لگاتے دشمن کی صفوں میں گھسے جا رہے ہوں۔ وہ شیر کی طرح

چھینتے، انگریز سپاہیوں سے بندوقیں چھین لیتے اور پھر انھیں بندوقوں سے انھیں موت کی نیند سلا دیتے۔ بڑے سے بڑے افسر بلکہ قلعے کا کمانڈر بھی اس اچانک یورش سے حواس باختہ اور سراسیمہ ہو گئے۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی جان بچانے کے لیے سکھ پلٹن کو آگے کر دیا۔ سینکڑوں سکھ جان سے گئے۔ یہ حال دیکھ کر انگریز کمانڈر نے مردان اور درگئی کی چھاؤنیوں کو سگنل دیا اور صاف بتا دیا کہ اگر فوری کمک نہ پہنچی تو مالاکنڈ کی خیر نہیں۔ دو بجے رات یہ پیغام مردان پہنچا تو اسی وقت گائیڈ رجمنٹ کے سکھ سپاہیوں کو کوچ کا حکم دے دیا گیا (کہ فرنگی مسلمان کو مسلمان کے خلاف بھیجنے سے ڈرتا تھا) بلا کی گرمی تھی۔ سپاہی بے ہوش ہو ہو کر گرتے تھے۔ ایک انگریز افسر کا گھوڑا حبس سے تیورا کر گرا اور گرتے ہی ختم ہو گیا۔ گرتے پڑتے دوسرے دن یہ سکھ سپاہی درگئی پہنچے لیکن راہ میں ان کے انیس ۱۹ ساتھی گرمی کی شدت سے ہلاک ہو چکے تھے۔ اسی اثناء میں ایک فوجی ٹرین بھی کمک لے کر درگئی پہنچ گئی۔ دونوں جگہوں کے فوجیوں نے اکٹھے مالاکنڈ کے قلعے کی جانب مارچنگ شروع کر دی۔ سکھ رجمنٹ لفٹننٹ واہان (WAGHAN) کی کمان میں تھی جبکہ نوشہرہ کے امدادی دستے کرنل ریڈ کے تحت۔

اس اثناء میں قلعہ مالاکنڈ سے مجاہدوں پر بار بار حملے کیے گئے۔ رات بھر گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ جس کے نتیجے میں سکھ فوجی بیسیوں لاشیں چھوڑ کر پسپا ہوئے اور قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

ادھر چکدرہ کی فوجی چوکی بھی خطرے میں تھی۔ اس میں صرف دس سپاہی متعین تھے جن کا کام مالاکنڈ کے قلعے سے رابطہ قائم رکھنا اور کسی خطرے کی صورت میں سگنل دینا تھا۔ قبائلی مجاہد چوکی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ دیکھ کر مالاکنڈ

سے کچھ فوج چکدرہ بھیجی گئی جو کسی دور دراز راستے سے دریا کو پار کر کے چھپتی چھپاتی چکدرہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

مالاکنڈ میں تازہ دم فوج کے پہنچتے ہی انگریز نے بھرپور قوت سے مجاہدین پر پے بہ پے حملے کئے لیکن مجاہد جان پر کھیل کر ہر بار انھیں پیچھے ہٹاتے رہے۔ توپوں کی شدید گولہ باری بھی مجاہدین کے حوصلے پست نہ کر سکی اور پورے تین دن رات تک انھوں نے فرنگی کا ناک میں دم کیے رکھا۔

۲۹ جولائی ۱۸۹۷ء کو جمعہ کا دن تھا اور ہجری مہینے کی پہلی تاریخ ——— شہادت کے لیے جمعہ سے بڑھ کر مقدس دن اور کون سا ہو سکتا تھا ——— مجاہدین شہادت کی تمنا سینوں میں لیے بڑھ بڑھ کر دشمن پر حملے کرتے رہے چند ہی گھنٹوں میں انھوں نے سینکڑوں فرنگی سپاہیوں کے علاوہ گائیڈز رسالہ کے لفٹنٹ بالڈون اور لفٹنٹ کس کو بھی ہلاک کر دیا۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی اور لفٹنٹ کرنل آدمز (ADAMS) کے گھوڑے کو لگی۔ گھوڑا وہیں ہلاک ہو گیا اور خود کرنل بھی زخمی ہونے سے بچ نہ سکا۔ صرف ایک حملے میں مجاہدین نے انگریزی رسالہ کے بیس ۲۰ سے زیادہ گھوڑے مار گرائے۔

یکم اگست تک مالاکنڈ کے محصورین کا حال پتلا ہو چکا تھا۔ حالات کی نزاکت کو بھانپ کر راولپنڈی سے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل سر بائینڈن بلڈ خود مالاکنڈ پہنچا اور کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس وقت تک شمالی ہند کی تمام چھاؤنیوں سے ساری توپیں اور دس ہزار سپاہی بھی محاذ پر پہنچ چکے تھے۔ جنرل بلڈ نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ علاقے کا جو شخص بھی اس کے ہاتھ لگتا زندہ رہنے نہ پاتا۔ اپنی بے سروسامانی کے باوجود یوسف زئی رضاکار مورچوں میں ڈٹے رہے۔ حالت یہ تھی کہ خالی ہاتھ مجاہد رائفل بردار گوروں سے گتھم گتھا ہو جاتے

بعض کے ہاتھ میں صرف پتھر ہوتے۔ انہی پتھروں سے وہ دشمنوں پر پل پڑتے۔ پسپائی ان کے نزدیک ایک بزدلانہ کام تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی وہ سینہ تان کر آگے بڑھتے جاتے۔ ان معرکوں میں اور اس کے بعد جنرل بلڈ نے وہ تباہی مچائی کہ تین ہزار کے قریب مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ اس کے مقابلے میں دشمن کا نقصان بھی کچھ کم نہ تھا۔ غزاءِ امبیلہ کے بعد مالاکنڈ اور چکدرہ کا جہاد تاریخِ یوسف زئی کا ایک نمایاں باب ہے۔

حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب سارے قبائل سرحد کے واجب التعظیم بزرگ تھے، لوگ ان کے ایک اشارے پر جان و مال قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ۱۸۹۷ء کے جہاد میں منصوبہ تو یہ تھا کہ مالاکنڈ اور علاقہ مہمند میں بیک وقت فرنگی پر حملہ کیا جائے تاہم مہمند بروقت تیار نہ ہو سکے۔ ستمبر کا مہینہ شروع ہوا تو انگریز جرنیل بائینڈن بلڈ مالاکنڈ کی مہم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اب وہ ہڈہ ملا صاحب سے نمٹنے کے لیے مہمندوں پر حملہ کرنے کے ارادے سے وادی میموند کی طرف بڑھا۔ مقامی آبادی فرنگی لشکر کے آتے ہی اپنے گھر بار خالی کر کے پہاڑی ٹھکانوں کو چلی گئی تھی۔ انگریز جرنیل نے پہنچتے ہی ان کے گھروں کو جلانا شروع کر دیا۔ رات کو قبائلی مجاہدین نے انگریز لشکر پر ہلہ بول دیا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ فرنگی کا لشکر بھاگ نکلا اور نواگئی ہی میں جا کر دم لیا۔

نواگئی پہنچ کر انگریز جرنیل کو خبر ملی کہ ہڈہ ملا صاحب اور ان کے ارادتمند فرنگی لشکر کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آدھی رات کو ہڈہ ملا نے انگریز لشکر پر دھاوا بول دیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی، بہت سے انگریز افسر اور سپاہی مارے گئے۔ ان کے ایک سو کے قریب گھوڑے بھی ہلاک ہو گئے۔ انگریز جرنیل نے خان آف خار کے محفوظ مقام عنایت قلعہ میں اپنے لشکر کو جمع کیا اور دوبارہ

وادی میمو ند کی راہ لی۔

میمو ند غریب لوگ تھے، ان میں سے اکثر کے پاس تلوار کے علاوہ کوئی اسلحہ نہ تھا۔ تاہم انھوں نے رات کو انگریز فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ دست بدست لڑائی ہوئی تو انگریز لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ بھگدڑ مچی کہ سپاہی ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ نصف کے قریب فرنگی فوجی ہلاک ہو گئے جبکہ باقی ماندہ نے ایک پہاڑی نالہ میں پناہ لے کر جان بچائی۔ مجاہدوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب جاری رکھا۔ دوسری رات کو شدید طوفان بادو باراں کی وجہ سے دشمن کے اکثر سپاہی راستہ بھول گئے اور قبائلی مجاہدوں کے نرغے میں آ گئے۔ دن چڑھا تو انگریز کو اپنے لشکریوں کی تلاش کا موقع ملا تو انھیں نو انگریز، چار دیسی افسروں اور ۲۳۶ سپاہیوں کی لاشیں ملیں۔ اس معرکے میں ایک انگریز جرنیل بھی ہلاک ہوا تھا جس کا نام صیغۂ راز میں رکھا گیا۔

۲۰ ستمبر کو ملا ہڈہ صاحب کو اطلاع ملی کہ جنرل ایلس کی کمان میں ایک انگریز لشکر بہت جلد آکر جنرل بلڈ کے لشکر سے ملنے والا ہے۔ بعد میں یہ دونوں لشکر مل کر قبائلی مجاہدوں سے ٹکر لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہڈہ ملا صاحب نے جنرل ایلس کے پہنچنے سے قبل ہی جنرل بلڈ کے لشکر پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ تمام مجاہد پہاڑی چوٹیوں پر جمع ہو گئے، عشاء کی نماز پڑھ کر انھوں نے انگریز لشکر پر ہلہ بول دیا۔ خود ملا ہڈہ صاحب مجاہدوں کی کمان کر رہے تھے، نو بجے رات سے ڈھائی بجے تک میدان کارزار گرم رہا۔ انگریزوں کے توپ خانے نے بے پناہ گولہ باری کی تاہم مجاہدین کے حوصلے برقرار رہے یہاں تک کہ ان کے پاس گولہ بارود کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اس پر مسلمان سرفروشوں نے تلواریں سونت لیں اور دست بدست لڑائی کا آغاز کر دیا۔ اسی اثناء میں

ایک مجاہد کی گولی انگریز جرنیل وڈہاؤس (WODE HOUSE) کو آکر لگی اور وہ تیورا کر گر پڑا۔

ایک بجے کے قریب ہڈہ ملا صاحب کی قیادت میں مہمند اور اتمان خیل مجاہدوں نے آخری بھرپور حملہ کیا۔ اس کے بعد وہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے پہاڑی مورچوں کو لوٹ گئے۔ اسی معرکے میں انگریز کو بے پناہ نقصان ہوا۔ بار برداری کے دو سو جانور مارے گئے اور بہت سے انگریز افسر اور فوجی ہلاک ہو گئے۔ مجاہدین اسلام کی ایک کثیر تعداد بھی داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئی۔

دوسرے دن جنرل بلڈ اور جنرل ایلس کے لشکر ایک دوسرے سے آملے۔ دونوں جرنیل سر جوڑ کر لکڑئی کے ایک خیمہ میں جمع ہوئے اور اپنی اس بے مقصد مہم کے سلسلے میں منصوبے بناتے رہے۔

۲۲ ستمبر کی رات کو پھر فریقین میں زبردست رن پڑا۔ یہ رات بھی انگریز لشکر نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ انگریز کا آخری مقصد یہ تھا کہ ہڈہ ملا صاحب کے مرکز اعلیٰ جروبئی تک پہنچ کر اسے غارت کر دے۔ فرنگی اس خیال میں تھا کہ غازیوں کو کمک اور رسد جروبئی کے ہیڈ کوارٹر ہی سے ملتی ہے چنانچہ راستے کے دیہات کو تباہ کرتے ہوئے اور فصلوں کو آگ لگاتے ہوئے انگریز لشکر تولا کلہ پہنچا۔ جہاں سے تھوڑی دور ایک سادہ سی مسجد تھی اور گھاس پھوس کے چند جھونپڑے۔ یہی مجاہد اعظم حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ انگریزی لشکر کی ایک پارٹی ان جھونپڑیوں کو نذر آتش کرنے کے لیے آگے بڑھی تو اس وقت وہاں صرف چھ سات شمشیر زن مجاہد پہرے پر تھے۔ انھوں نے وہ جوہر دکھائے کہ انگریز لشکر کے اس دستے میں سے ایک

شخص بھی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

مسجد کے پیچھے ایک پہاڑی چٹان تھی۔ دوسری جانب چھوٹی سی بستی، جس میں ایک سنگڑھ (مورچہ) بنا ہوا تھا۔ ان دونوں جگہوں سے مجاہدین نے اس تیزی سے انگریزی لشکر پر گولیاں برسائیں کہ جنرل ایلیس اور اس کے ساتھیوں کو پسپا ہوئے بغیر چارہ نہ رہا۔ جاتے جاتے انگریزی فوج کے سپاہی جھونپڑیوں اور بستیوں کو جلاتے گئے۔ غازیوں نے کوئی ایک میل تک بھگوڑوں کا تعاقب کیا۔ انھوں نے تبھی چین لیا جب انگریز کو جروبئی سے نکال باہر کیا۔

اپنی فوجی کارروائی کی ناکامی کے بعد دونوں انگریز جرنیلوں نے اب سیاسی حربوں سے کام لینا چاہا۔ انھوں نے مہمندوں اور دوسرے نواحی قبیلوں سے صلح کی گفت وشنید شروع کر دی۔ ۱۲/ اکتوبر کو ایک نمائندہ جرگہ عنایت قلعہ میں منعقد ہوا۔ انگریزی حکومت کی جانب سے اس میں جنرل سر بائینڈن بلڈ اور پولیٹیکل افسر میجر ڈینیر نے شرکت کی۔ میجر ڈین کے پولیٹیکل اسسٹنٹ میجر رحیم شاہ نے مہمندوں کے سامنے شرائط صلح پیش کیں۔ مہمندوں نے شرائط پر غور کرنے کے لیے وقت مانگا۔

۲۰/ اکتوبر تک بات چیت جاری رہی۔ اس عرصے میں انگریزی لشکر بزعم خود مہمندوں کو مرعوب کرنے کے لیے علاقہ میں مارچنگ کرکے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بالآخر سالارزئی، شموزئی اور مہمند قوم کی دوسری شاخوں نے صلح کی شرائط منظور کر لیں۔ یہ سب کامیابی اسی جذبۂ جہاد کی بدولت نصیب ہوئی جو حضرت نجم الدین ہڈہ ملّا صاحب نے اپنے ارادت مندوں کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے۔

۱۹۰۱ء میں والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کے بلانے پر ملّا صاحب

اپنے وطن ہڈہ چلے گئے۔ وہاں بہت بڑا دینی مدرسہ قائم کیا۔ مسجد بنائی اور کتب خانہ کی بنیاد رکھی۔ امیر حبیب اللہ نے ان کے لنگر کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

افغانستان اور صوبہ سرحد کے ہزاروں لوگوں نے اس مردِ مجاہد سے فیض تربیت حاصل کیا۔ ان کے خلفاء میں سے سیّد غلام مصطفیٰ اسلام پوری۔ چکنور ملّا صاحب، اخونزادہ صاحب لگاڈ، صوفی عالم گل، حضرت صاحب کابلی۔ معصوم صاحب، میاں صاحب سرکانہ، شیخ دین محمد شکرپورہ اور حاجی صاحب ترنگ زئی نے بڑا نام پایا۔

۱۹۰۲ء کے ماہ رمضان میں حضرت ہڈہ صاحبؒ سخت بیمار پڑ گئے۔ معصوم صاحبؒ ہر وقت ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتے۔ جس رات مسجد میں ختم قرآن پاک کی تقریب تھی، ان کی حالت کمزور ہو گئی۔ نماز عشاء کے بعد معصوم صاحب کو بلایا اور کہا کہ "میرا وقت قریب آ پہنچا ہے، تاہم سحری کھانے سے پہلے کسی سے میری موت کا ذکر نہ کرنا اور مجھے نماز ظہر کے بعد دفن کرنا۔"

پھر فرمایا:۔ میرے پاس سات سو روپے ہیں۔ اس رقم میں سے ایک تہائی خیرات کر دینا، باقی رقم میرا چچازاد بھائی آئے گا، اسے دے دینا۔ مسجد کے کونے میں روپوں کی گیارہ تھیلیاں دفن ہیں۔ وہ امیر حبیب اللہ خان کو دے دیں۔ یہ روپیہ بیت المال کا ہے۔ میں نے اس سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ وہ بھیجتے تھے، چونکہ امیر مملکت تھے اس لیے میں انکار نہ کر سکا۔

اس وصیّت کے بعد انھیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ معصوم صاحب نے

سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ ہڈہ ملّا صاحب غور سے سنتے رہے۔ اسی اثناء میں اُن کی روح قفسِ عنصری سے رخصت ہوگئی۔

انھیں ان کی وصیت کے مطابق ہڈہ ہی میں دفن کیا گیا۔ اس مردِ مجاہد نے ساری عمر ملّت اسلامیہ کی سربلندی کے لیے کام کیا اور شادی تک نہ کی۔

○

سرتور فقیر یا مُلّا مستان

۱۸ر جولائی ۱۸۹۷ء کا دن تھا۔ ایک مست قلندر فقیر "اللہ ہُو" کے نعرے لگاتا جھنڈا اٹھائے لنڈا کیے (سوات) کے نواح میں قریہ قریہ گھوم رہا تھا۔ کچھ لڑکے بالے اس کے ساتھ تھے۔ وہ جہاں جاتا لوگ جمع ہو جاتے۔ وہ لوگوں کو بتاتا فرنگی نے خلافت اسلامیہ ترکیہ پر حملہ کر دیا ہے۔ اب ہر مسلمان پر جہاد واجب ہو چکا ہے۔ اٹھو! اور فرنگی سے اپنا ملک آزاد کراؤ۔" لنڈا کئے سے مُلّا مستان یا سرتور فقیر نے تھانے کا رُخ کیا جو لوئر سوات کا سب سے بڑا قصبہ ہے۔ اب سات آٹھ سو جوان اس کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے تھے۔ انھیں ساتھ لیا اور نو بجے رات اس مرد مجاہد نے مالاکنڈ کے قلعہ پر ہلّہ بول دیا۔ رات بھر لڑائی ہوتی رہی۔ فرنگی افسروں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے سکھوں کو آگے جھونک دیا۔ قبائلی مجاہدوں نے کوارٹر گارڈ پر قبضہ کر کے تمام اسلحہ اور گولہ بارود لوٹ لیا اور فرنگی ہی کی بندوقوں سے ان کا مقابلہ شروع کر دیا۔

سرتور فقیر اجسے انگریز نے دیوانہ یا "MAD MULLAH" کا نام دیا مشہور مجاہد حضرت نجم الدین ہڈہ مُلّا صاحب کا مرید تھا۔ اس کا نام سعد اللہ خان تھا اور وہ بونیر کے موضع ریگا کے خان حمید اللہ کا بیٹا تھا۔ شروع ہی سے وہ اسلام کا دیوانہ تھا۔ اپنی مٹی پر غیروں کا تسلط اسے ہرگز منظور نہ تھا۔ دینی

تعلیم پانے کے بعد وہ اجمیر شریف بھی گیا اور کچھ عرصہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے آستانہ پر قیام کیا۔

سرتور فقیر بچپن ہی سے ایک چابک دست سوار اور ماہر شمشیر آزما تھا۔ بڑا خوش وضع اور خوش خلق انسان تھا، جو ملتا اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ ۱۸ر جولائی کو اس نے انگریز کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور چند ہی دنوں میں ہزاروں لوگ سر دھڑ کی بازی لگائے اس کا ساتھ دینے لگے۔

وہ صرف جہاد کی تبلیغ ہی نہیں کرتا تھا بلکہ خود بھی عملاً اس میں شریک رہتا تھا۔ لوگ اس پر جان چھڑکتے تھے چنانچہ دورانِ جہاد ملّا مستان کی دو انگلیاں دشمن کی تلوار سے کٹ گئیں تو لوگوں نے ان کٹی ہوئی انگلیوں کو نہایت احترام سے دفن کیا اور اسی جگہ نشانی کے طور پر جھنڈا گاڑ دیا۔ لوگ احتراماً وہاں جاتے اور اس طرح اس پاکباز مجاہد سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔

۲۶ر مئی ۱۸۹۷ء کو قلعہ مالاکنڈ پر ملّا مستان اور اس کے سرفروش ساتھیوں کا حملہ ایک یادگار معرکہ تھا۔ اپنی بے سرو سامانی کے باوجود مجاہدین رات بھر دنیا کی اپنے وقت کی سب سے طاقتور فوج سے ٹکر لیتے رہے، انگریزی فوج کے ایک کرنیل، ایک میجر، ایک لفٹنٹ اور پانچ سو اکیس سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک ہزار سے زیادہ برطانوی فوجی زخمی ہوئے جبکہ غازیوں میں سے صرف انیس افراد نے جامِ شہادت نوش کیا۔

اسی طرح ۱۲ر جولائی ۱۸۹۷ء کو قبائلی جانبازوں نے چکدرہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، ورکئی ایک انگریز افسروں اور ایک سو گیارہ سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یوسف زئی مجاہدوں نے سرتور فقیر یا ملّا مستان کی قیادت میں انگریزی لشکر پر پے بہ پے اتنے وار کیے کہ اسے مفلوج کر کے رکھ

دیا۔۔۔ مجبوراً انگریز کو "مالاکنڈ فیلڈ فورسس" کے نام سے نئی فوج بھرتی کرنی پڑی۔ مالاکنڈ میں پولیٹیکل ایجنسی کا قیام انگریز کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھی گئی اور اس ایجنسی کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے براہِ راست برطانوی ہند کی مرکزی حکومت اور مرکزی محکمۂ خارجہ سے وابستہ کر دیا گیا۔ ساتھ ہی انگریز اپنے دو تجربہ کار جرنیلوں جنرل بائنڈن بلڈ اور جنرل ایلس کو ایک ایک ڈویژن فوج اور بھاری توپ خانہ دے کر اس محاذ پر بھیجنے کے لیے مجبور ہو گئے لیکن اس کے باوجود یوسف زئی سرفروشوں کے جوشِ جہاد کے آگے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔

سولہ[۱۶] اور سترہ[۱۷] ستمبر کی درمیانی رات کو مجاہدین نے انگریزی لشکر کو گھیرے میں لے کر سخت نقصان پہنچایا۔ صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ سارا علاقہ انگریزی فوج کے گھوڑوں، خچروں اور فوجیوں کی لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔ صرف اس ایک رات کو نو[۹] انگریز، چار[۴] دیسی افسر اور ایک سو چھتیس[۱۳۶] سپاہی لقمۂ اجل بنے۔ مجاہد انگریز کے فوجیوں سے تمام بندوقیں اور گولہ بارود چھین کر لے گئے۔

بعد میں صلح صفائی کے لیے بات چیت چھڑی تو انگریز نے صرف اس قدر مطالبہ کیا کہ ۱۶ ستمبر کو سرتور فقیر کے مجاہدوں نے جتنی بندوقیں ہمارے سپاہیوں سے چھینی ہیں وہ واپس کر دی جائیں۔ مسٹر چرچل (بعد میں برطانوی وزیرِ اعظم بنے) نے جو اس وقت ایک جنگی نامہ نگار کے طور پر اس موقع پر موجود تھے، اس مطالبے پر یوں طنزیہ اظہارِ خیال کیا ہے:۔

"ان بندوقوں کی بھلا کیا اہمیت تھی؟۔۔۔۔ اگر اہمیت تھی تو اُن افسروں اور جوانوں کی جنھیں ہم اس معرکہ میں گنوا چکے تھے۔۔۔۔ یہ کہاں کی کفایت شعاری تھی کہ بندوقیں واپس لینا ضروری سمجھا گیا۔ یہ محض اپنی ساکھ قائم رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔"

"ایڈنبرا ریویو" نے اپنی جنوری ۱۸۹۸ء کی اشاعت میں انگریزوں کی ناکام اور ناقص سرحدی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے "کہ لاکھوں روپے خرچ کر دینے کے باوجود انگریزوں کو ان علاقوں میں سڑک سے ہٹ کر بات کرنے تک کی جرأت نہ تھی"۔

فی الاصل کسی جنگ میں بھی اسلحہ نہیں بلکہ وہ جوش اور جذبہ کام کرتا ہے جو کسی فوج کے سپاہیوں کے خون کو گرم رکھتا ہے۔ سرتور فقیر، ہڈہ ملا صاحب، حاجی صاحب ترنگ زئی نے مسلمان مجاہدوں کو وہ قوت ایمانی عطا کر دی تھی کہ وہ بڑی سے بڑی فرعونی طاقت سے بھی خائف اور ہراساں نہ ہوتے تھے۔ انگریز مبصرین جنگ نے اپنی رپورٹوں اور تحریروں میں تسلیم کیا ہے کہ سرحدی مسلمانوں سے بڑھ کر حوصلہ مند قوم روئے زمین پر شاید ہی کوئی اور ہو۔ مالاکنڈ کے جہاد کے دوران ایک انگریز گھڑ سوار نے ایک پٹھان پر نیزے سے حملہ کیا۔ وار اس زور کا تھا کہ نیزہ پٹھان مجاہد کے جسم میں دھنس کر رہ گیا۔ انگریز سوار نے زور لگانے پر بھی نیزہ زخمی کے جسم سے نہ نکال سکا تو زخمی پٹھان کو تڑپتا چھوڑ کر چلتا بنا۔ اُس کے پیٹھ پھیرتے ہی بہادر پٹھان خود اٹھا اور اپنے جسم سے نیزہ نکال کر پرے پھینک دیا ——— دیکھتے ہی دیکھتے وہ تلوار سونت کر ایک انگریز پر جھپٹا اور اسے ٹھکانے لگا دیا ——— اتنے میں ایک انگریز افسر نے پستول سے فائر کر کے اس مجاہد کو شہید کر دیا"۔

ان شہیدانِ راہِ وفا کی فہرست بہت طویل ہے جنھوں نے سرتور فقیر اور دوسرے پاکباز دینی رہنماؤں کے پرچم تلے مالاکنڈ، چکدرہ، امان درہ اور دوسرے مقامات پر دادِ شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ حال

بہی ہیں بڑی تحقیق وجستجو کے بعد مولانا محمد اسلام اجملی نے ان سرفروشوں کی مختصر سی فہرست مرتب کی ہے۔ وہ گم نام شہید بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں جنھوں نے صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کے دین کو سربلند رکھنے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، ان کی جزاء صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے۔

تاریخ افاغنہ کے مشہور محقق خان روشن خان کے مطابق سعد اللہ خان عرف سرتور فقیر کا سالِ وفات ۱۳۳۶ھ ہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے چار بیٹیاں اور ایک بیٹا عمر خان چھوڑا (جس کی عمر اُس وقت صرف چار برس تھی) عمر خان نے اپنے نامور باپ کی قبر پر فتح پور (سوات) پر ایک پختہ مزار تعمیر کرا دیا ہے۔

○

جان محمد شہید

جان محمد وہ سرفروش تھا جس نے صوبہ سرحد میں سب سے پہلے ناموس اسلام کی خاطر ہندوؤں کے ہاتھوں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

۹۵ فی صد مسلم آبادی کے اس صوبے میں ۱۹۰۵ء تک کبھی ہندو مسلم فساد ہوا نہ کبھی فرقہ وارانہ کشیدگی دیکھنے میں آئی۔ اس سال پہلی بار متعصب ہندو رہنما لالہ لاجپت رائے نے پشاور کا دورہ کیا تو لوگوں کے ذہنوں کو باہمی نفرت سے مسموم کر دیا۔ تاہم حالات پھر بھی گوارا تھے لیکن اتفاق سے ۱۹۱۰ء ہندوؤں کا ہولی کا تہوار عین بارہ وفات یا عید میلاد النبیؐ کے دن پڑتا تھا۔ اس وقت تک مسلمانان پشاور رحم سے بارہ ربیع الاول کے دنوں کو بارہ وفات کہتے تھے اور اس دوران شادی بیاہ، گانا بجانا یا کوئی خوشی کی تقریب ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس ہندو ہولی کے تہوار پر باجے بجاتے، سوانگ بھرتے، مٹھائی بانٹنے اور خوشیاں مناتے ہیں۔

شام کا وقت تھا، ہندو گانا گاتے، باجے بجاتے، ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے بازار سے جلوس کی صورت میں گزر رہے تھے کہ کچھ مسلمان نوجوانوں نے اس پر اعتراض کیا اور باجے بند کرنے کو کہا۔ پشاور کے ہندو مالدار اور آسودہ حال تھے۔ وہ کسی کی بات کب سنتے تھے۔ انھوں نے ان نوجوانوں پر حملہ کر دیا اور انھیں زخمی کر دیا۔ جان محمد نامی ایک نوجوان کو کاری زخم آئے اور وہ موقع ہی پر فوت ہو گیا۔

رات کو تو مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس زیادتی کا علم نہ ہو سکا۔ تھوڑے بہت

مسلمان موجود تھے۔ وہ شہید کی لاش لے کر اس کے گھر گئے تو بازار کلاں کے ایک ہندو پنساری نے کوئی آوازہ کسا۔ اس پر مشتعل مسلمانوں نے اس کی دکان کو آگ لگا دی تاہم آگ جلد ہی بجھ گئی اور زیادہ نقصان ہونے نہ پایا۔

دوسرے دن ۲۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو جب جان محمد شہید کا جنازہ اٹھایا گیا تو فضا سخت کشیدہ تھی، ان دنوں لنڈی ارباب کے ارباب محمد حسین خان بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ شہر کے کچھ مسلمان گئے اور ان کو شہر لائے تاکہ ہندوؤں کی یہ زیادتی ان کے نوٹس میں لائی جائے۔ اتنے میں شہر میں خطرے کی بو سونگھتے ہوئے انگریز ڈپٹی کمشنر بھی تھانہ کابلی پہنچ چکا تھا۔ ارباب صاحب اور ڈپٹی کمشنر نے دیکھا تو لوگ دوکانوں اور مکانوں کو آگ لگا رہے تھے اور ایک دوسرے پر قاتلانہ حملے کر رہے تھے اس پر ارباب صاحب کے ذہن نے کام کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "آگ کیوں لگاتے ہو؟ آگ لگانے سے کیا ملے گا۔ بہتر ہے دکانیں لوٹ لو" یہ تجویز کام کر گئی۔ لوگ کشت و خون اور آتش زنی کی بجائے لوٹ مار میں لگ گئے۔

دو تین دن بعد ارباب صاحب نے مسلمانوں کا اجلاس بلایا۔ انھیں کہا کہ ہندوؤں نے فی الواقع بہت زیادتی کی ہے، لیکن مسلمان فراخدل ہوتا ہے۔ اب جذبات کو ٹھنڈا ہونا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ لوٹا ہوا مال ان کو واپس کر دو۔" اس پر اکثر لوگوں نے لوٹا ہوا مال تھانے میں لا کر ڈھیر کر دیا اور ہندو دکاندار اپنا اپنا مال اس ڈھیر سے پہچان کر لے گئے۔

اس طرح شہر ایک بہت بڑی تباہی سے بچ گیا۔ تاہم جان محمد کی شہادت رائیگاں نہ گئی۔ اس واقعہ کے بعد ایک مدت تک کسی غیر مسلم کو جرأت نہ ہوئی کہ اسلام یا پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکال سکے۔

بابڑے ملّا صاحبؒ

سلسلۂ قادریہ کے جن بزرگوں نے صوبہ سرحد میں فرنگی سامراج کے خلاف جہاد میں بھرپور حصہ لیا، ان میں بابڑے ملّا صاحب کا نام نامی بہت ہی نمایاں ہے۔

بابڑے ملّا کا اصل نام سیّد امیر جان تھا۔ وہ قوم سالارزئی کے چشم و چراغ تھے، دادی چارمنگ کے ایک گاؤں لبنائی میں ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت نجم الدین ہڈہ ملّا صاحبؒ کے خلیفہ اور ماذون تھے۔ اپنی پاک بازی اور تقویٰ کی بدولت بڑے قابلِ احترام اور ہر دلعزیز تھے۔ عوام میں وہ بابڑے ملّا کے نام سے مشہور رہے۔

انھوں نے اپنے مرشد ہڈے ملّا کی تقلید میں ساری عمر انگریزوں کے خلاف جہاد میں گزار دی۔ مومند اور باجوڑ کی لڑائیوں میں انھوں نے بڑی شجاعت دکھائی۔ جس سے وہ عوام کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔

بابڑے ملّا صاحب ابتداء ہی سے اسلام سے گہری محبت رکھتے تھے۔ ان کے گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور گاؤں تھا جہاں ایک عالمِ دین "ماما صاحب" کا بڑا علمی شہرہ تھا۔ بابڑے ملّا نے ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ بعد میں اسمار اور دوسرے مقامات کے علمائے دین سے بھی کسبِ فیضان کیا۔ آخر

میں دینی علوم کی تکمیل کے بعد کافی عرصہ تک باباڑہ میں سکونت پذیر رہے۔ اسی نسبت سے انھیں "باباڑے ملّا" کہا جانے لگا۔

اس زمانے میں صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب کی روحانیت کا بہت شہرہ تھا۔ جن دنوں ہڈہ ملّا صاحب، جمر قند میں مقیم تھے، وہیں باباڑے ملّا صاحب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت کی، ہڈے ملّا صاحب کا لنگر ان دنوں سارے علاقہ میں مشہور تھا۔ باباڑے ملّا صاحب نے بھی طریقت کی تکمیل کے بعد اپنے مرشد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے باباڑے میں ایک عالی شان مسجد بنوائی۔ دینی مدرسہ قائم کیا اور لنگر جاری کیا۔ مشہور تھا کہ باباڑے ملّا صاحب کے لنگر میں ہر شخص کو گھی اور شہد پیش کیا جاتا تھا۔ وہ بے حد سخی تھے۔ ناداروں اور مسکینوں کی امداد فرماتے اور سارا وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں گزارتے۔ ان کے صاحبزادے بھی تبلیغ دین کے سلسلے میں ان کا ہاتھ بٹاتے۔ ان کے بڑے صاحبزادے کا نام محمد یوسف تھا۔ وہ بھی اپنے نامور باپ کی طرح ایک مشہور عالم دین تھے۔ لوگ احتراماً انھیں "گل صاحب" کہتے تھے۔ انھوں نے ایک گاؤں "گل آباد" بسایا جو آگے چل کر سارے علاقے کا روحانی مرکز بن گیا۔

باباڑے ملّا نے عمر بھر اپنے آپ کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کیے رکھا۔ وہ نہ صرف دوسروں کو جہاد کی ترغیب دیتے بلکہ خود لشکروں کی قیادت کرتے اور خطرناک سے خطرناک مورچے پر خود موجود رہتے۔ جب انگریزی فوجیں مالاکنڈ کی راہ باجوڑ میں داخل ہوئیں تو ماموند اور ناوگئی کے مابین مجاہدوں نے ان پر بڑھ کر حملے کیے۔ اس موقع پر باباڑے ملّا اپنے چند ارادت مندوں کے ساتھ فرنگی کے ایک مورچے میں جا گھسے اور انگریزوں کے ایک فوجی کمانڈر

کو واصل بہ جہنّم کرنے کے بعد بخیریت واپس پہنچ گئے۔ انھوں نے جن معرکوں میں حصہ لیا ان کا لکڑاؤ کا جہاد، الکنڈی کا جہاد اور عقرب ڈاگ کا جہاد بہت مشہور ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بابڑہ ملّا صاحب ہی نے اپنے پیر بھائی حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے مرشد حضرت ہڈہ ملّا صاحب کی جانشینی قبول کرلیں، لیکن اس وقت حاجی صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس کل پچاس رائفلیں تھیں، جونہی جہاد کی تیاری مکمل ہوگئی وہ میدان میں نکل پڑیں گے۔ اس پر بابڑے ملّا صاحب نے حاجی صاحب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ ۱۹۱۵ء کے موسم گرما میں بابڑے ملا صاحب نے انگریزوں کے مورچوں پر حملے شروع کردیے، بابڑے ملّا صاحب اپنے رفیق باجوڑ ملّا کی معیت میں ایک ایک گاؤں میں جاتے اور قبائلی بہادروں کو انگریز کے خلاف جہاد کے لیے آمادہ کرتے۔ چکنور ملّا بھی اس مشن میں ان کا پورا پورا ساتھ دیتے۔ ہزار نو، لالپورہ اور نواحی علاقوں سے ایک ہزار مجاہدین کو ساتھ لے کر بابڑے ملّا نے قلعۂ شبقدر پر دھاوا بول دیا۔

۱۴ر اکتوبر تک ان کے مجاہدین کی تعداد چار ہزار تک جا پہنچی تو انھوں نے بنڈیالئی کے انگریزی کیمپ پر دھاوا بول دیا۔ ۱۷ر اکتوبر تک مجاہدین کی تعداد چھ ہزار ہوگئی —— اس موقع پر بابڑے ملّا نے تین ہزار مجاہدوں کو لے کر علی کندی کی پہاڑیوں کا رخ کیا۔ ۱۸ر اکتوبر کو انگریزوں سے گھمسان کا رن پڑا۔ اس معرکہ میں سرکاری رپورٹ کے مطابق تین انگریز، تیرہ دیسی افسر اور سینکڑوں سپاہی ہلاک ہوئے۔ انہی دنوں ڈیر لیوی نے مجاہدین کے ایک رہنما گوجر ملّا کو شہید کردیا جس کی موت کا انتقام لینے کے لیے مجاہدین نے فرنگی کے سپاہیوں پر

تابڑتوڑ حملے کیے۔

مشہور قومی رہنما مولوی محمد علی قصوری بھی ان دنوں حاجی صاحب ترنگ زئی کی قیادت میں اس جہاد میں شریک تھے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ حاجی صاحب ترنگزئی بابڑے ملا صاحب اور دوسرے مجاہد رہنما بیک وقت گنبد ھاب، مچنی اور شبقدر کے انگریزی قلعوں پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت تک کوئی تیس ۳۰ ہزار مجاہد ان کے ساتھ تھے۔ اب کے انگریزوں نے ہوائی جہازوں سے بھی کام لیا۔ جونہی جہاز گولہ باری کرتے مجاہدین پہاڑی چٹانوں کے پیچھے دبک جاتے۔ جہازوں کے جاتے ہی وہ پھر فرنگی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑتے۔ شبقدر کے قلعہ پر انگریز نے بہتر ۷۲ توپیں نصب کر رکھی تھیں جو بیک وقت گولے پھینکتیں، جس پہاڑی مورچے میں بیٹھے حاجی صاحب ترنگ زئی مجاہدین کی کمان کر رہے تھے، اس جگہ ۷۲ گولے توپوں کے آکر گرتے اور زور سے پھٹتے کہ دل دہل جاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشین گنوں سے گولیوں کی بارش ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب اور ان کے مجاہد ساتھیوں کو کوئی گزند پہنچنے نہ دیا۔ لڑائی کی شدت کا منظر قصوری صاحب نے یوں کھینچا ہے :-

”ان بہتر ۷۲ گھنٹوں میں ہمیں کھانے کو کچھ نہ ملا، پانی کے سوا کوئی چیز ہمارے حلق سے نیچے نہ اتری، تاہم جوش جہاد کا یہ عالم تھا کہ نہ تو ہم میں سے کسی کو نیند نے ستایا نہ تھکن محسوس ہوئی ـــــ آخر تین شبانہ روز کی لڑائی کے بعد انگریزی فوجیں شبقدر کے قلعہ میں پسپا ہو گئیں اور ہمارے سبھی مجاہد خندقوں پر پل پڑے کہ مال غنیمت حاصل کریں ـــــ چنانچہ سینکڑوں بندوقیں اور لاکھوں کارتوس ہمارے ہاتھ آئے۔“

"......جونہی لڑائی ختم ہوئی، دیہاتی عورتیں دَف بجاتیں، گیت گاتیں ہمارے مورچوں پر آ پہنچیں۔ مجھے وہ نظارہ ابھی تک نہیں بھولتا ——— اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ جس قوم کی عورتیں اتنی بہادر اور شیر دل ہوں وہ اپنے مقدر پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے ——— عورتوں نے آکر (مجاہدینِ اسلام کی) نعشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ یہ ہمارے گیارہ شیروں کی لاشیں تھیں جنھوں نے اسلام کے ناموس پر اپنی جانیں قربان کی تھیں، عورتیں یہ دیکھتی تھیں کہ ان میں سے کوئی شخص پیٹھ پر گولی کھا کر تو نہیں مرا۔ کیونکہ پیٹھ پر گولی کھانا اس بات کی علامت سمجھی جاتی ہے کہ وہ بھاگتے ہوئے مارا گیا ہے مگر جب ان عورتوں نے دیکھا کہ سبھی مقتول اللہ کی راہ میں سینوں پر گولیاں کھا کر شہید ہوئے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں ——— ماں اپنے شہید بیٹے کا منہ چومنے لگی۔ بہن اپنے شہید بھائی پر قربان ہونے لگی اور بیوی اپنے شہید شوہر سے گلے ملنے لگی۔ وہ پشتو میں گیت گاتیں کہ جاؤ، تمھیں ہم نے اللہ کے سپرد کیا ——— تم شہید ہو ——— جنّت کی سیر کرو ——— مگر خدارا ہمیں نہ بھولنا۔ خدا سے دعا مانگنا کہ ہم بھی اس کی راہ میں کام آئیں اور تمھارے بھائیوں کو بھی اللہ توفیق دے کہ وہ بھی تمھارے نقشِ قدم پر چلیں۔"

جہاں مسلمان عوام کے جوشِ جہاد کا یہ عالم تھا وہیں مسلمان حکمرانوں اور امراء کی بے حسّی بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اب وہ دن بیت چکے تھے جب تلوار کا مقابلہ تلوار سے تھا، یا انگریز کے سپاہیوں کی بندوقوں کا مقابلہ مجاہدین بندوقوں سے کر رہے تھے۔ اب سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت

انگریزوں کے پاس دُور مار توپیں تھیں۔ ٹینک تھے۔ اور سب سے بڑھ کر ہوائی جہاز تھے جو فضا سے مجاہدوں پر گولیاں برساتے اور مجاہد ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتے۔ اب یہ امر ناگزیر ہو گیا تھا کہ کوئی منظم حکومت مجاہدین کی سرپرستی کرتی اور انھیں جدید اسلحۂ جنگ فراہم کرتی لیکن جن حکومتوں سے مجاہدین کی توقعات وابستہ تھیں، وہ دہری چال چلتی رہیں۔ مجاہدین کو بھی طفل تسلیاں دیتی رہیں اور انگریز کو بھی یقین دلاتی رہیں کہ وہ ان کے مخالفوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہ کریں گی۔

اس جہاد کے دُوران حاجی صاحب ترنگ زئی، بابڑے ملّا اور مجاہدین اس امر کے منتظر رہے کہ امیر کابل اپنے وعدے کے مطابق انھیں اسلحہ دے گا لیکن یہ امید آخر تک پوری نہ ہو سکی۔ بالآخر مجاہدین نے مولوی عبدالرحیم محمد بشیر اور مولوی محمد علی قصوری کو (جن کا دربارِ کابل سے گہرا رابطہ تھا) کابل بھیجا، لیکن ان کو اس سلسلے میں کوئی کامیابی ہونے نہ پائی اور کابلی حکومت حسبِ سابق ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔

اسی طرح جمعیت حزب اللہ کی جانب سے ایک مراسلہ بھی سلطان ترکی کو بھیجا گیا۔ جس پر حاجی صاحب ترنگ زئی کے علاوہ بابڑہ ملّا صاحب کی مہر بھی ثبت تھی لیکن چونکہ افغانستان راستہ دینے پر آمادہ نہ تھا اس لیے ترکی بھی مجاہدین کی امداد کرنے سے قاصر رہا۔

اَور تو اَور خان آف خار اور نواب دیر نے بھی مجاہدین کی امداد و اعانت کرنا تو ایک طرف اُلٹا ان کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے۔ عمرا خان جندول کا مجاہد بیٹا عبدالمتین خان حاجی صاحب ترنگ زئی کا ارادت مند اور حلیف تھا اسے نواب دیر نے انگریز کے اشارے پر گرفتار کر کے قیدی بنا لیا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی

خود ایک جرگہ لے کر گئے اور بڑی مشکل سے عبدالمتین خان کو نواب دیر سے آزاد کرایا۔

امیر حبیب اللہ خان کی وفات پر کابل کی عنانِ حکومت غازی امان اللہ خان کے ہاتھ آئی تو اس نے حاجی صاحب ترنگ زئی، باباڑہ ملا صاحب اور مجاہدین کی کچھ اعانت ضرور کی۔ فروری ۱۹۲۰ء میں حاجی صاحب ترنگزئی کی جلال آباد میں دعوت کی گئی اور مجاہدین کے لیے سات ہزار رائفلوں اور کارتوسوں کی امداد دی گئی۔

ادھر انگریزوں کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ۱۰ر مارچ ۱۹۱۷ء کو ہندوستان کا انگریز وائسرائے خود شبقدر اور علاقہ مہمند میں آیا اور تمام انتظامات کا اپنی آنکھوں سے معائنہ کیا۔

حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب رح ۱۹۰۲ء میں اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے تو سالارزئی، ماموند اور باجوڑ کے قبائل نے باباڑے ملا صاحب ہی کو ان کا جانشین منتخب کیا۔ اس سے بابڑہ ملا صاحب کے اثر و رسوخ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اصلاحِ معاشرہ اور تبلیغِ دین کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک ملک و ملت کے دشمنوں کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ فی الواقع وہ اسلام کی ایک شمشیرِ برہنہ تھے!

فقیر صاحب النگر

صوبہ سرحد میں بیسویں صدی عیسوی میں بیداری کی جو لہر اٹھی وہ اصل میں عالمی اسلامی انقلابی تحریکوں ہی کی ایک کڑی تھی۔ ۱۸۹۵ء میں یورپ کی نصرانی طاقتیں یونان کی حمایت میں خلافت ترکیہ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے ناپاک عزم سے اٹھیں۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹) میں بھی فرنگی کا سارا زور خلافت اسلامیہ کے خاتمہ پر رہا۔ برصغیر اور خصوصاً صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں اس موقع پر فرنگی کے خلاف شدید اشتعال پھیل گیا۔ علمائے اسلام نے بھی عوام کے دلوں کو جذبۂ جہاد سے سرشار کیا۔ اور غلبۂ اسلام کی خاطر جان و مال لٹانے پر تیار رہنے کا درس دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور تحریک مجاہدین نے بھی مسلمان عوام کو نیا عزم اور ولولہ بخشا، خلافت، ہجرت اور ترک موالات کی تحریکوں نے جذبۂ آزادی کو اور تقویت بخشی۔ پہلے پہل سیاسی تحریکیں صرف برصغیر کے بڑے بڑے شہروں تک محدود رہیں، لیکن بعد میں حضرت اخوند صاحب سوات، ہڈہ ملا صاحبؒ، مولانا محمود الحسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد علی جوہر اور حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی جیسے حریت پسندوں نے ان کا دائرہ قبائلی علاقوں تک پھیلا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۰ء کے بعد ہر جگہ قبائلی مجاہدین فرنگی استعمار کی منظم مخالفت کرتے نظر آنے لگے۔

قصہ خوانی پشاور میں ۱۹۳۰ء میں نہتے عوام پر گورا فوج کی فائرنگ نے سارے قبائلی علاقوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ ۱۹۳۱ء، ۳۲ ۱۹اور ۱۹۳۳ء میں علاقہ آزاد مہمند میں انگریزی چوکیوں پر حملوں میں شدت آ گئی۔ انگریز نے زیریں مہمند کے لوگوں پر بڑا زور دیا کہ وہ بالائی مہمند کے غازیوں کی حمایت کرنے سے باز رہیں لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر فرنگی کو طاقت کے بل بوتے پر عوام کو دبانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے بریگیڈیر (بعد میں جنرل) آکنلک کی کمان میں بہت بڑی فوج بالائی مہمند بھیج دی اور اتنا دباؤ ڈالا کہ مہمند غازیوں کو حکومت سے گفت و شنید کرتے ہی بن پڑی۔

مئی ۱۹۳۳ء میں مہمندوں میں امیر امان اللہ خان کی حمایت میں ایک تحریک اٹھی، وجہ یہ تھی کہ مہمند عوام کی اکثریت نادر خان کو غاصب خیال کرتی تھی، چونکہ نادر خان نے امیر امان اللہ ہی کے نام پر بچہ سقہ کے خلاف لڑائی لڑی تھی اس لیے یہ لوگ امان اللہ ہی کو افغانستان کا جائز حکمران سمجھتے تھے۔ وادی چہارہنگ اور کوہستی میں لوگوں نے اعلانیہ اس موقف کی حمایت کی۔ حالت یہ تھی کہ خود انگریز بھی در پردہ نادر خان کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے اور وہ کسی صورت امان اللہ خان کا اقتدار پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک زبردست فوجی مہم بھیج کر امان اللہ کے حامیوں کو دبا دیا۔

۱۹۳۴ء میں ایک بار پھر فقیر صاحب النگرؒ نے علمِ جہاد بلند کیا اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے مہمندوں کی بہت بڑی تعداد کو فرنگی کے خلاف تلوار اٹھانے پر آمادہ کر لیا۔ فرنگی نے انھیں جنگ سے باز رہنے کی وارننگ دی لیکن فقیر صاحب مرعوب ہونے والے شخص نہ تھے۔ انھوں نے مالاکنڈ سے چند میل مغرب میں لوئی اگرہ کے مقام پر غازیوں کا ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا۔

انگریز نے "سوات لیویز" کے فوجی دستوں کو مقابلے میں بھیجا لیکن یہ فوجی دستے فقیر صاحب کو دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے، اس پر فرنگی حکومت نے انتہائی قدم اٹھانا ضروری سمجھا اور فروری ۱۹۳۷ء میں پورے نوشہرہ بریگیڈ کو محاذِ جنگ پر بھیج دیا۔ نوئی آگرہ کا نواحی علاقہ چٹانوں، دروں اور پہاڑی ندی نالوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور سخت دشوار گزار تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑے اور خچر بھی پہاڑوں کی ان نکیلی چوٹیوں پر چڑھ نہ سکتے تھے۔ پھر پانی کی بھی سخت قلت تھی۔ پورے دو ماہ تک انگریزی فوج فقیر صاحب کے فوجی ٹھکانوں تک پہنچنے میں ناکام رہی لیکن اپریل میں بالآخر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ انگریز مؤرخوں نے اعتراف کیا ہے کہ ۵ / اپریل ۱۹۳۷ء کو مجاہدین اسلام نے اپنی بے سرو سامانی کے باوجود برطانوی فوج سے ٹکر لی، وہ تاریخ حرب کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

جنگ کا زور قلعہ بہری کے ارد گرد رہا جس کا دفاع انگریزوں کی ایک رائفل کمپنی، ایک گورکھا پلٹن اور ایک مشین گن پلاٹون کر رہی تھی۔ نماز مغرب سے کچھ پہلے غازیوں نے تیاری کا بگل بجایا۔ بگل کے بجتے ہی مجاہدین ہر طرف سے آکر درّہ غونڈ کے نواح میں جمع ہو گئے، بعد میں انھیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ مشرق کو اور دوسرا مغرب کو چل دیا جبکہ تیسرا دستہ قلعے کے سامنے ڈٹا رہا۔

اندھیرا چھاتے ہی مجاہدین نے ڈھول بجا کر انتہائی جوش و خروش سے فوجی چوکی پر ہلّہ بول دیا۔ انھوں نے قلعے کے ارد گرد بچھی ہوئی خاردار تاروں کی پروا کی نہ وہ دشمن کی مشین گنوں اور ہوائی جہازوں سے خائف ہوئے۔ تلواریں سونتے، نعرے لگاتے وہ جنوبی سمت سے قلعے کے دروازے تک جا پہنچے، دشمن کو للکارا اور دست بدست لڑائی چھیڑ دی۔ یہاں تک کہ گوییوں

کی بوچھاڑ میں بھی وہ آگے بڑھتے رہے اور دشمن کے کئی سپاہیوں سے مشین گنیں چھین لیں۔ فرنگی سپاہی مشین گنوں سے بے دریغ فائرنگ کرتے۔ فائرنگ سے محفوظ رہنے کے لیے غازی تھوڑی دیر کے لیے پسپا ہو جاتے لیکن پھر دوسرے ہی لمحہ قلعے پر چڑھ دوڑتے۔ قلعے کے علاوہ دوسرے پہاڑی مورچوں سے بھی فرنگی سپاہی لوئی گنوں سے آگ برسا رہے تھے، تاہم مجاہدین کے حوصلے خطا نہ ہوئے۔ انھوں نے پلاٹون کمانڈر صوبیدار اور اس کے بہت سے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وائرلیس پر اس تباہی کی خبر ملتے ہی انگریز کمپنی کمانڈر خود اس طرف متوجہ ہوا اور اس نے توپ خانے سے مجاہدین پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس سے تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی، اس وقفے کے بعد مجاہدین نے تازہ دم ہو کر زور و شور سے ایک اور حملہ کیا۔ شمشیر زن غازی اب کے دشمن کے مورچوں تک پہنچنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ صبح کی روشنی نمودار ہونے تک مجاہدوں کے حملے جاری رہے تاہم سورج نکلتے ہی وہ اپنی اپنی پہاڑی کمین گاہوں میں پہنچ گئے۔ اس رات کے حملے نے فرنگی فوج کے اوسان خطا کر دیے۔ اس پر اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر سے فوری کمک طلب کر لی۔

گیارہ اپریل کو ہزاروں فرنگی محاذ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے مجاہدین پر پے در پے حملے کیے پھر بھی انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر انھوں نے شموزئی قبیلے کا جرگہ طلب کر کے صلح کی گفتگو شروع کر دی، تاہم جرگہ کے ارکان بھی فقیر صاحب النگر کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح کافی عرصہ تک ایک فقیر بے نوا نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت برطانیہ کا ناک میں دم کیے رکھا۔

انگریز مصنف آرتھر سوئنسن نے تسلیم کیا ہے کہ

"اگرچہ لوئی آگرہ کی یہ فوجی مہم اتنی بڑی اور نمایاں نہ تھی، تاہم اس کے دوران وہی خوفناک نظارے دیکھنے میں آئے جو امبیلہ کی جنگ میں سرنیول چیمبرلین اور مالاکنڈ کی غزا میں جنرل بائینڈن بلڈ کو دیکھنے پڑے تھے"

سوئنسن کے خیال میں صرف اول درجہ کے بہادر اور اعلیٰ تربیت یافتہ سپاہی ہی ایسے مجاہدوں سے نبرد آزما ہو سکتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں انگریز نے اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لیے پشاور اور نوشہرہ دونوں چھاؤنیوں کی پوری پوری فوج مہمندوں کی سرکوبی کے لیے طلب کر لی۔ اب کے یہ فوج ٹینکوں سے بھی مسلح تھی۔ درّہ نحقی کے قریب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ قبائلی مجاہد مصلحتاً پیچھے ہٹتے گئے۔ انگریز نے اس پسپائی کو اپنی فتح پر محمول کرتے ہوئے ایک گشتی دستہ ان کے تعاقب میں بھیجا، یہ دیکھ کر مجاہدوں نے پہاڑی چٹانوں کے پیچھے مورچے سنبھال لیے۔ جونہی گائیڈ رسالہ ان کے مورچوں کے سامنے سے گزرا مجاہدین بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ان پر جھپٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے گائیڈ کے ۳۵ سپاہیوں کو ہلاک اور ساٹھ کو زخمی کر دیا۔

مجاہدوں کے پاس نہ تو مالی وسائل تھے نہ رسد رسانی کا معقول انتظام، وہ لمبی لڑائیاں لڑنے سے کنّی کتراتے تھے۔ ادھر انگریز کو بھی ان مہمات پر لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ آتا تھا۔ اس بار بھی یہی کچھ ہوا۔ جرگہ بلایا گیا جس میں صلح کی شرائط طے پا گئیں۔

فقیر صاحب النگر کو "سرحدی رابن ہُڈ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پشاور

کا انگریزی اخبار "خیبر میل" اپنی چھ فروری ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں اس دلچسپ شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہے :-

"صوبہ سرحد میں جہاں کہیں بھی کوئی ہنگامہ کھڑا ہو ــــــ جیسا کہ ان دنوں بھی ہے ــــــ اس میں فقیر صاحب السنگر کی پراسرار شخصیت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے ــــــ کوہ سلیمان کا یہ چھ فٹ لمبا مرد قلندر فی الواقع صوبہ سرحد کا "رابن ہڈ" ہے۔ تیس سال سے یہ بے سروسامان درویش اپنے وطن عزیز کے دشمنوں سے برسرپیکار ہے۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتا ہے اور آنکھ جھپکنے میں پہاڑوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ فرنگی افسروں کے دلوں پر ہمیشہ اس کی ہیبت طاری رہتی ہے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اُن کا زہرہ آب آب ہو جاتا ہے۔

فقیر صاحب السنگہ کی فطرت میں قہاری بھی ہے اور شانِ رحیمی بھی ــــــ وہ جہاں ایک اچھا قائد ہے وہیں ایک زبردست لڑاکا بھی ــــــ وہ غریبوں اور ناداروں کا مددگار ہے اور ظالموں کے خون کا پیاسا۔

وہ ایک شُتربان کا بیٹا ہے، اسے نہ تو اپنے حسب و نسب پر غرور ہے اور نہ اقتدار کی خواہش ــــــ ایک وقت تھا جب وہ پشاور شہر کے کوچہ و بازار میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا تھا یا سرکاری افسروں کے ذاتی خادم کی حیثیت سے روزی کماتا تھا ــــــ ایک بار پشاور سے وہ اپنے آبائی گاؤں گیا تو پھر شہر آنے کو اس کا جی نہ چاہا ــــــ اچانک اس نے اپنے اندر فکر و نظر کا ایک انقلاب

محسوس کیا، درویشی اختیار کرلی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کوہ سلیمان کی تنہائیوں میں مصروف عبادت ہو گیا۔ پہلے پہل تو اس نے اپنی رُوحانی استعداد بڑھائی۔ بعد میں وہ اپنی مافوق الفطرت روحانی قوت سے وہ دوسروں کی تقدیریں بھی سنوارنے لگا ــــــ کسی بیمار پہ دَم ڈالتا تو وہ تندرست وتوانا ہو جاتا، کسی مصیبت زدہ کے لیے دعا کرتا تو اس کی مشکل ٹل جاتی۔ رفتہ رفتہ اس کی روحانی شہرت چاروں طرف پھیل گئی اور ہر وقت اس کے گرد پیرواہوں کا ہجوم نظر آنے لگا۔ دن بدن اس کے ارادت مندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ تب اس نے ایک خانقاہ قائم کرلی۔ وہ مریدوں کو سادگی اور سخت کوشی کی تعلیم دیتا۔ وہ خود اور اس کے مریدزمین نے فرش پر سوتے، خانقاہ میں نہ لحاف میسر تھے نہ کمبل ــــــ سردی لگتی تو وہ اپنے آپ کو خشک گھاس سے ڈھانپ لیتے۔ وہ مریدوں کی روحانی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عسکری تربیت بھی کرتا۔ ہر مرید کو نشانہ بازی اور پہاڑی جنگ کے داؤ پیچ سکھائے جاتے۔ وقت گزرنے پر اس نے اپنے مریدوں کو بندوقوں سے مسلح بھی کر دیا ــــــ یہ اسلحہ کہاں سے آیا اور یہ بندوقیں اس کے ہاتھ کیسے لگیں کوئی نہیں بتا سکتا؟

رفتہ رفتہ فقیر صاحب النگرؒ کی شہرت اور عظمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ اردگرد کے خان خوانین اور سرکردہ لوگوں کو بھی ساتھ ملالیا۔ وہ سب کو فرنگی کے خلاف جہاد کی ترغیب دیتا، جو اس کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوتا، فقیر اُن سے جنگ کرتا۔

اس طرح جلد ہی سارا علاقہ اس کے زیر آ گیا اور وہ قبائلی علاقے کا بے تاج بادشاہ سمجھا جانے لگا۔ اس نے بارہا انگریزوں سے لڑائیاں لڑیں اور ہر معرکے میں کامیاب اور سرخرو رہا۔ فرنگی اسے اپنا جانی دشمن سمجھتے تھے لیکن اس کے خلاف کچھ کر نہ سکتے تھے۔"

مُلّا پاوندہ

"محسود وہ بہادر قبیلہ ہے جو اپنی سرزمین پر کسی غیر ملکی سامراجی کا قدم پڑتے نہیں دیکھ سکتا۔" صوبہ سرحد کا سابق گورنر کیرو جس کی عمر کا نصف حصہ یہیں گزرا۔ ان الفاظ میں محسود کی جرأت و شجاعت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ ۱۸۶۰ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک کئی بار فرنگی فوجوں نے محسود کے خلاف لشکر کشی لیکن ایک مرتبہ بھی صحیح معنوں میں انھیں کبھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ۱۸۶۰ء میں تین ہزار محسود ٹانک پر ٹوٹ پڑے تو انگریز نے مشکل سے ان سے جان چھڑائی۔ ۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم سے فارغ ہوتے ہی فرنگی فوجوں نے وزیرستان کا رُخ کیا۔ سارے علاقے کو روند ڈالا اور جگہ جگہ سڑکیں اور چھاؤنیاں بنائیں۔ وزیرستان کے قبائلی رہنماؤں میں جو شہرت اور عزت ملّا پاوندہ کو حاصل ہوئی کسی اور کے نصیب میں نہ آسکی۔

پاوندہ کا مطلب "خانہ بدوش" ہے۔ مُلّا پاوندہ بھی چونکہ ٹوچی کی وادی کی ایک ایک بستی میں جاتے اور لوگوں کو آمادہ جہاد کرتے اس لیے "سیلانی مُلّا" یا پاوندہ مُلّا کے لقب سے مشہور ہوئے کہ ان کے اصل نام کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ مُلّا صاحب کا اصل نام محی الدین تھا۔ اگرچہ بہت بڑے عالم تو نہ تھے تاہم وہ اجبی دینی علم سے بہرہ ور تھے۔ ان میں ایک انقلابی اور عوامی راہنما کی تمام خوبیاں موجود تھیں یہی وجہ ہے کہ اکھڑ وزیر اور محسود بھی ان کی قیادت پر متحد و متفق ہوگئے۔

پاوندہ ملّا طریقت کے اعتبار سے کربوغہ شریف (تیراہ) کے ملّا محمد انور سے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت تھے۔ اسلامی علوم میں ان کے استاذ مولانا حمزاللہ وزیر تھے جو کہ ایک فاضل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ وطن عزیز کی آزادی کے سلسلے میں ایک سرگرم مجاہد بھی تھے۔ ملّا پاوندہ نے ان سے جہاد کی عملی تربیت پائی اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وطن دشمن طاقتوں سے ہمیشہ برسرپیکار رہے۔

انگریز حکمران ملّا پاوندہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ پہلے ہی وزیریوں کی یلغار سے خائف تھے۔ ۱۸۹۴ء میں وانا پر مجاہدین کا حملہ انھیں ابھی بھولا نہ تھا جب دو ہزار وزیر اور محسود جوانوں نے چھاؤنی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ اس واقعہ کے بعد بروس کو اس علاقہ کا پولیٹیکل ایجنٹ بنا کر بھیجا گیا جو کوئٹہ میں سنڈیمن پالیسی کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کر چکا تھا۔ تاہم بروس کو یہ معلوم نہ تھا کہ سرحدی قبائل سے نمٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ بلوچستان میں تمندار اور سردار ہیں، انگریز انھیں کی وساطت سے بلوچ عوام پر تسلط قائم رکھتے تھے لیکن وزیرستان اور دوسرے سرحدی علاقوں میں بڑے بڑے سردار نہیں۔ ان کی جگہ جرگہ کام کرتا ہے اور ہر بالغ قبائلی جرگے کا مساوی رکن ہوتا ہے۔ بروس نے وزیرستان میں بھی "ملکی" نظام قائم کرنا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور یہاں معاملات کی باگ ڈور جمہور کے ہاتھوں میں رہی۔

بروس کے آتے ہی پانچ وزیریوں کے ایک گروہ نے محکمہ تعمیرات عامہ کے ایک انگریز افسر کیلی کو قتل کر دیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ بروس نے علاقہ کے ملکوں پر زور دیا کہ قاتلوں کو جرگہ کے سامنے لا کر ان کے جرم کی سزا دی جائے۔ محسود ملک بات کو مان گئے اور پانچوں غازیوں کو جرگہ میں پیش کیا، جرگہ نے انھیں

سات سات سال کی قید سنا دی۔ جب اس کارروائی کی اطلاع ملّا پاوندہ کو پہنچی تو اسے بڑا دکھ ہوا۔ وہ موروثی ملک تو نہ تھا لیکن بڑا صاحب بصیرت تھا۔ اسے علم تھا کہ فرنگی قانون کے سامنے سر جھکانا آزادی سے محرومی کے مترادف ہوگا۔ اس نے اعلان عام کر دیا کہ اس سزا پر عمل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس کے کہنے پر عوام نے ان ملکوں کے گھروں کا محاصرہ کر لیا جنھوں نے ان پانچ غازیوں کو سزا سنائی تھی۔ ان میں سے تین ملکوں کو قتل کر دیا جبکہ باقی ماندہ دو اپنی جان کے خوف سے رُوپوش ہو گئے۔

ساتھ ہی ملّا پاوندہ نے اپنے معتمد اور داماد ملّا عبدالحکیم کے ذریعے پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر بروس کو خط لکھے کہ پانچوں قبائلیوں کو قید سے رہا کر دیا جائے۔ بروس انہی دنوں وانا پر قبضہ جمانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ ملّا پاوندہ نے اسے متنبہ کیا کہ وہ اس ارادے سے باز آ جائے۔ بروس نے ملّا پاوندہ کے خطوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور بڑا توہین آمیز جواب بھیجا۔ جب بات چیت ناکام ہو گئی تو ملّا پاوندہ کو انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کو اس کی فرعونیت پر سبق سکھانے کی سوجھی۔

۲؍ نومبر ۱۸۹۴ء کو خنک سحر تھی۔ وانا چھاؤنی میں انگریز افسر اور سپاہی ابھی نیند کے مزے لے رہے تھے کہ مجاہدین نے کیمپ پر دھاوا بول دیا۔ حملہ اس برق رفتاری اور رازداری سے کیا گیا کہ انگریز کے اوسان خطا ہو گئے۔ ”پائنیر“ الہ آباد کے مطابق غازیوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی، وہ ڈھول بجاتے، نعرے لگاتے اور فائر کرتے ہوئے کیمپ پر ٹوٹ پڑے۔ فرنگی سپاہی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ غازی ان کے سرہانے پہنچ گئے۔ سب سے پہلے گورکھے اُن کی زد میں آئے جنھیں انھوں نے بے دریغ تہ تیغ کر دیا۔ پھر جو بھی ان کے سامنے آیا بچ نہ سکا۔ ایک سو کے قریب انگریز افسر اور سپاہی موت کے گھاٹ اتار

دیے گئے۔ آناً فاناً یہ کارروائی مکمل کر کے مجاہدین اپنے پہاڑی ٹھکانوں کو واپس لوٹ گئے۔ جنرل ٹرنر اور میجر اوبیلی نے ان کے تعاقب میں فوج بھیجی لیکن وہ فوج کے ہاتھ نہ آسکے۔

جونہی اس لڑائی کی خبر اخباروں میں چھپی، تمام ہندوستانی چھاؤنیوں میں صفِ ماتم بچھ گئی، لندن کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ فوراً ہی ایک فوجی مہم ترتیب دی گئی اور اسے جنرل سر ولیم لوکھارٹ جیسے گرگ باراں دیدہ کی کمان میں وزیرستان بھیجا گیا۔ نومبر کے آخر تک وزیرستان کی ساری چھاؤنیوں میں فوجی ہی فوجی نظر آتے تھے۔ جنرل لوکھارٹ نے ملّا صاحب پاوندہ اور وزیری رہنماؤں کو ایک ماہ کی مہلت دی کہ وہ اپنی غلطی پر اظہارِ افسوس کریں، لیکن محسود چپ رہے۔ بالآخر ۱۵ر دسمبر کو وانا سے فوج کانی گرام کو، جنڈولہ سے مکین کو اور بنّوں سے رزمک کو روانہ ہوئی۔ سخت سردی تھی۔ برفانی ہوائیں چلتی تھیں۔ ہندوستان کے میدانی علاقوں سے آئے ہوئے فوجی اس سردی کے عادی نہ تھے۔ محسود نے اس موقع پر بڑی حکمتِ عملی سے کام لیا۔ انھوں نے فرنگی کی کوئی مزاحمت نہ کی، چنانچہ ۹ر جنوری کو فوج جہاں جہاں سے گئی تھی وہیں واپس پہنچ گئی۔

محسود بڑے زیرک تھے، صلح کی بات چیت چھڑتی تو وہ انگریز کی ہر بات مان لیتے لیکن بعد میں کوئی شرط بھی پوری نہ کرتے۔ اب کے بھی ۲۱ر جنوری کو ان شرائط پر فریقین کے مابین معاہدہ طے پا گیا کہ

۱- لوٹا ہوا سامان واپس کر دیا جائے گا۔

۲- حد بندی کا کام مکمل ہونے تک ملّا پاوندہ کو وزیرستان میں نہ آنے دیا جائے گا۔

۳- پچاس رائفلیں، دو سو توڑے دار بندوقیں، دو تلواریں اور بارہ سو روپیہ نقد بطور جرمانہ انگریز کو ادا کیا جائے گا۔ تاہم ان شرائط کو پورا کرنے کی نوبت

ہی آئے نہ پائی ۔ ۱۸۹۷ء میں چترال سے وزیرستان تک ہر جگہ قبائلی مجاہد انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ اپنی ہی مصیبت میں الجھ گیا۔

دن بدن ملّا پاوندہ کی عظمت و شہرت میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگ اس کی پرکشش شخصیت کے گرد جمع ہوتے گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ سارے وزیرستان کا متفقہ قائد بن گیا۔ ملّا پاوندہ کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ اس کے ایماء پر کبھی ایک جگہ کسی انگریز افسر کو قتل کر دیا جاتا کبھی دوسرے کو۔ کبھی ایک فوجی کیمپ پر شبخون مارا جاتا کبھی دوسرے پر۔ محسود پہاڑوں کے عقاب تھے۔ اپنے شکار کو دیکھتے ہی وہ اس پر جھپٹتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پھر اپنی پہاڑی کمین گاہوں میں پہنچ جاتے۔

۱۹۰۷ء میں وزیری اور محسود قبیلوں کے خلاف انتہائی سخت اقدام کیے۔ ان کا داخلہ سرکاری علاقوں میں بند کر دیا گیا۔ ان کی اقتصادی ناکہ بندی کی گئی تاکہ خوراک اور دوسری ضروریات زندگی ان تک نہ پہنچ سکیں۔ انگریز کمانڈر ٹنوچی نے مکین اور کانی گرام کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے ملّا پاوندہ کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے لیکن ملّا صاحب اس کے ہاتھ نہ لگ سکے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ بحیرۂ عرب کے راستے وزیر، محسود اور دوسرے سرحدی قبائل کو اسلحہ پہنچ رہا ہے۔ انھوں نے اہم ناکوں پر فوجی چوکیاں قائم کر دیں کہ آئندہ ایسا ہونے نہ پائے لیکن ان کی کوئی کوشش بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

۱۹۱۹ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑتے ہی پھر انگریز کو اپنی پڑ گئی تو اس نے "فارورڈ پالیسی" ترک کر کے قبائل سے صلح کا ہاتھ بڑھایا لیکن ملّا پاوندہ اور ان کے رفیق انگریز کے جال میں نہ پھنسے بلکہ محسود نے طاقت جمع کر کے ایک بار پھر انگریز پر فوج کشی کی۔ اس وقت تک ایر فورس قائم ہو چکی تھی۔ انگریز آئے دن

وزیرستان پر حملے کرتے اور غریب قبائلیوں پر بمباری کرتے، اس پر محسود میں اور بھی جوش پھیل گیا۔ انھوں نے حملے کر کے فرنگی کو بے پناہ نقصان پہنچا۔ صرف ایسے ایک معرکے میں مرہٹہ رجمنٹ کے سینکڑوں سپاہی اور پانچ انگریز افسر مارے گئے۔ پنجاب رجمنٹ کی ایک چوکی پر حملہ کر کے غازیوں نے وہاں کے سبھی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ آتار دیا۔ ہوائی حملوں سے قبائلیوں کو بھی نقصان پہنچا لیکن انھیں تسلی تھی کہ صرف ایک محاذ پر انھوں نے انگریز کے ڈھائی سو افسر اور سپاہی ہلاک کر دیے تھے۔ اس موقع پر انگریز نے اپنی سنگینوں کی چھاؤں میں جنڈولہ سے لدھا تک پختہ سڑک تعمیر کر لی اور رزمک کے مقام پر چھاؤنی قائم کر لی۔

۱۹۲۲-۲۳ء میں تمام انگریزی فوجیں وانا سے رزمک چھاؤنی کو منتقل ہو گئیں۔ رزمک ایک مرکزی مقام تھا۔ اس سے انگریزوں کے ہوائی جہاز اڑتے اور جگہ جگہ بمباری کرتے۔ اس طرح مکین کا سارا علاقہ تہس نہس ہو گیا۔ بعد میں محسود نے کچھ نرم پالیسی اختیار کر کے فرنگی سے صلح کر لی۔ اس عرصہ میں وزیرستان گورا سپاہیوں کا قبرستان بن چکا تھا۔

ملا پاوندہ ۱۹۱۳ء تک زندہ رہے۔ بلاشبہ وہ پٹھانوں کے سب سے زیادہ جنگجو اور جنگ آزما قبیلے محسود کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کی وفات پر ان کے بیٹے شاہ فضل دین کو ان کا جانشین منتخب کیا گیا اور ان کے داماد ملا عبدالحکیم کو مشیر مملکت کا درجہ حاصل رہا۔

ملتان خان آفریدی

برِّصغیر پاک و ہند اور وسطی ایشیا کی کوئی پہاڑی گزرگاہ درّہ خیبر سے بڑھ کر تاریخی اور کلیدی اہمیت کی حامل نہیں۔ صدیوں سے بڑے بڑے نامور فاتحین اور قسمت آزما اسی دروازے سے گزر کر برصغیر میں وارد ہوتے رہے۔ سر اولف کیرو کے الفاظ میں "اس خطّے نے اتنے تاریخی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں جو ایشیاء کے کسی ملک بلکہ دنیا کے کسی اور علاقے نے ہرگز نہیں دیکھے" ایسے کلیدی علاقے کے لوگ بڑے مہم باز ہیں، بڑے جوش اور ولولہ کے مالک ہیں وہ پہاڑوں کے وہ عقاب ہیں جو آزاد فضا میں ہر وقت محوِ پرواز رہتے ہیں اور شکار کو دیکھتے ہی فوراً اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔

درہ خیبر آفریدی جنگ آزماؤں کا وطن ہے۔ آفریدی قوم کے آٹھ ذیلی قبیلوں میں سے ایک قبیلہ زخاخیل ہے۔ انگریز کی آمد (۱۸۴۹ء) سے لے کر ذخاخیل من چلے ہمیشہ اس کے خلاف برسرپیکار رہے، جونہی موقع ملتا وہ پشاور چھاؤنی اور نواحی فوجی چوکیوں پر دھاوا بولتے اور جو ہاتھ لگتا لے کر چلتے بنتے۔ انگریز نے بارہا آفریدیوں پر لشکر کشی کی لیکن منہ کی کھائی۔

اپنے محل وقوع کے اعتبار سے خیبر کی بڑی اہمیت ہے، اسی لیے افغانستان کے حکمران بھی اس کی سیاست میں گہری دلچسپی لیتے رہے۔ وہ آفریدی اور

بالخصوص ذخاخیل جانبازوں کو اکثر انگریز کے خلاف اکسلاتے رہتے۔ اس طرح اہل خیبر دو حصوں میں بٹ گئے، اول وہ لوگ جو انگریز سے رابطہ استوار رکھنے کے حامی تھے اور دوسرے وہ جو کابلی حکمرانوں کی شہ پر کام کرتے۔ خواص خان اور چمن خان ذخاخیل مدتوں کابل کے ایما پر انگریز کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ ۱۹۰۴ء میں برطانوی حکومت نے کابلی حکومت سے سخت احتجاج کیا اور اس پر خیبر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا الزام لگایا۔ تاہم اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک آفریدی بار بار سرکاری علاقے پر یلغار کرتے رہے۔ پانچ ایسے گروہ تشکیل دیے گئے جو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ انگریزی علاقے کے دیہات پر ڈاکہ ڈالتے اور آنکھ جھپکنے میں تباہی مچا کر واپس آفریدی علاقہ کو چلے جاتے۔ دادئی، عثمان، ملتان، گلباز اور محمد افضل ان گروہوں کے قائد تھے، وہ نہ صرف انگریزی علاقوں میں دہشت پھیلاتے بلکہ خود آفریدیوں میں سے جو کوئی برطانوی حکومت کا ساتھ دیتا اسے بھی ایسا کرنے کا مزہ چکھاتے۔ سرحدی دیہات کے عوام ہر وقت آفریدی حملوں کے ڈر سے لرزہ براندام رہتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۲۸ جنوری ۱۹۰۸ء کو ساٹھ ستر ذخاخیلوں کے ایک گروہ نے ایک ہندو سیٹھ کے مکان پر ڈاکہ ڈالا اور لاکھوں روپے لوٹ کر چلتے بنے۔ ہندوستان کی حکومت اس پر اتنی پریشان ہوئی کہ ۳۱ جنوری کو کونسل میں بھی اسی سانحہ پر بحث کی گئی، اس کے نتیجے میں فوری طور پر ذخاخیل کے خلاف تادیبی فوجی مہم بھیجی گئی۔ جس کے نتیجہ میں کچھ عرصہ کے لیے تو آفریدی خاموش رہے لیکن پھر انھوں نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔

۱۹۰۸ء میں ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے انگریز کی سرحدی حکمت عملی اور اس کا وقار خاک میں مل گیا۔

رات کا وقت تھا۔ پشاور شہر کے بارہ دروازوں میں سے کوئی بھی کھلا نہ تھا۔

مسلح پولیس پہرہ پرتھی، ایسے میں ذخاخیل مہم باز اپنے سربازوں کو لیے آیا۔ فصیل پر سیڑھیاں لگائیں اور مسجد مہابت خان کی دیوار پھلانگ کر پشاور کے مالدار صرافہ بازار میں داخل ہوگیا۔ پولیس نے ملتان خان کا نام سنا تو ادھر ادھر کونوں کھدروں میں دبک گئی۔ اب میدان صاف تھا۔ ذخاخیلوں نے پورے اطمینان سے سارا مال واسباب سمیٹا اور واپس چل پڑے۔ جاتے جاتے انھوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی۔ ٹیلی فون کے کھمبوں اور دوسری جگہوں پر ان کی گولیوں کے نشانات کافی عرصہ بعد تک دیکھے جاتے رہے۔

ملتان خان کی اس کارروائی پر سارے ایوانِ حکمت میں زلزلہ آگیا۔ لندن کی پارلیمنٹ میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی لیکن اُس ذخاخیل سرفروش کے خلاف کوئی کارروائی کامیاب ہونے نہ پائی۔

ملتان خان ایک بار پھر کسی مہم پر سوڑیزے کے ڈیرہ میں مقیم تھا کہ بھوک نے ستایا۔ اس پر اس نے اپنے ایک رفیق کو کہیں سے کھانا لانے کو کہا۔ کافی دیر تک وہ شخص واپس نہ آیا تو ملتان خان اور اس کے ساتھیوں کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ رفیق عرصہ سے ان کے ساتھ تھا۔ اس لیے اس پر غداری اور مخبری کا خیال بھی کسی کو نہ آتا تھا۔ پھر خیال آیا شاید وہ خفیہ پولیس کے ہاتھ چڑھ گیا ہو۔ ملتان خان اور اس کے ساتھی ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ فوجی دستہ نمودار ہوا۔ اس نے سنگینیں چڑھی ہوئی بندوقیں سنبھال رکھی تھیں۔ آتے ہی سپاہیوں نے چاروں طرف سے ملتان خان اور اس کے سرفروشوں کو گھیرے میں لے لیا۔ انگریز کمانڈر نے بار بار ذخاخیلوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ لیکن ذخاخیل ڈٹے رہے۔ وہ کل سات آٹھ افراد تھے اور دوسری طرف پوری فوجی پلٹن۔ آفریدیوں کے پاس چند بندوقیں تھیں اور تھوڑی سی گولیاں۔ ان کے مدمقابل کے پاس گولہ بارود کی

کمی تھی نہ روپے پیسے اور خوراک کی۔

انگریز کمانڈر نے ایک بار پھر ملتان خان کو للکارا اور اسے ہتھیار ڈالنے کو کہا لیکن ہتھیار ڈالنے کے نام سے ملتان خان واقف نہ تھا۔ فرنگی نے فائرنگ شروع کی تو ملتان خان بھی سنبھلا۔ اس کی پہلی ہی گولی سے ایک انگریز کپتان خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ دوسری گولی سے دوسرا افسر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ انگریز جانتے تھے کہ ملتان خان کے پاس کارتوس محدود تعداد میں تھے۔ اس لیے وہ لڑائی کو طول دیتے رہے۔ ملتان خان نے بھی جوابی فائرنگ کی رفتار کم سے کم کر دی تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت تک حریف کو الجھائے رکھے۔ رفتہ رفتہ ملتان خان اور اس کے ساتھیوں کی بندوقیں خاموش ہو گئیں۔ پھر بھی انگریز ان کے سامنے آنے سے خائف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر آفریدی جانباز نے ایک ایک کارتوس ضرور بچا کر رکھا ہوگا جس سے وہ اپنے آخری حریف کو ٹھنڈا کر سکے، لیکن ایسا نہ تھا، صرف ملتان خان کے پاس ایک کارتوس تھا باقی سب کی بندوقیں خالی پڑی تھیں۔ اب ان کی حیثیت لکڑی کی ایک لاٹھی سے زیادہ نہ تھی۔ متواتر چار گھنٹے تک مقابلہ جاری رہا۔ جب آفریدیوں کی طرف سے مزاحمت دم توڑ گئی تو انگریز ان کی طرف بڑھے۔ جو آفریدی زندہ بچ رہے تھے وہ بندوقیں پھینک کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انگریز کمانڈر کو ملتان خان کی تلاش تھی جو ایک مردہ گھوڑے کی اوٹ میں لیٹا تھا، یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اب بھی وہ نشانہ لے رہا ہو، جب کافی دیر تک اس نے کوئی حرکت نہ کی تو وہ سمجھ گیا کہ ملتان خان موت کی آغوش میں پہنچ چکا ہے۔ اس کی بندوق دیکھی گئی تو واقعی اس میں ایک گولی موجود تھی۔

گورا سپاہی بڑھے اور اس کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر رسیوں سے باندھ

دیا۔ انھیں اس وقت بھی خدشہ تھا کہ کہیں ملتان خان اٹھ کر نہ بیٹھ جائے یا بھاگ نہ نکلے۔ جن آفریدیوں کو زندہ گرفتار کیا گیا تھا ان پر مقدمہ قائم کیا گیا اور ایف سی آر کے تحت انھیں دار پر کھینچ دیا گیا۔

جس کم بخت ساتھی نے انعام و اکرام کے لالچ میں مخبری کی تھی وہ بھی عوام کے غضب سے بچ نہ سکا۔ قبائلی علاقے میں اس کے مکان کو جلا دیا گیا۔ اس پر وہ سرکاری علاقے میں رہنے لگا لیکن جلد ہی ایک آفریدی جانباز نے اسے ڈھونڈھ نکالا اور بندوق کی ایک ہی گولی سے اس کا کام تمام کر دیا۔ یوں وہ غدار اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

ملتان خان کے اس کارنامے پر ہزاروں پشتو اشعار موزوں کیے گئے۔ بچے بوڑھے اور عورتیں سبھی وہ ٹپے الاپتے اور ملتان خان کے جذبہ حریت کو خراج تحسین ادا کرتے۔

سیّد علی عباس بخاری

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے ہی سال پنجاب سے پانچ اضلاع کو الگ کر کے صوبہ سرحد کا قیام عمل میں آیا۔ کہنے کو تو یہ ایک صوبہ تھا لیکن حال یہ تھا کہ نہ یہاں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے سے قوانین رائج تھے نہ کوئی سیاسی مراعات حاصل تھیں۔ فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن کی تلوار ہر سر پہ لٹک رہی تھی۔ اس کالے قانون کے تحت فرنگی جسے چاہتا جیل میں ڈال دیتا۔ نہ کوئی اس کارروائی کے خلاف اپیل کر سکتا نہ وکیل۔ اور تو اور پشاور چھاؤنی کی مال روڈ اور فورٹ روڈ پر دیسی آدمی کا چلنا پھرنا بھی منع تھا۔ نیم فوجی اور نیم سول قسم کے انگریز افسر یہاں تعینات کیے جاتے جن کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ "حکم" کا درجہ رکھتا تھا۔ عجیب شب و روز تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کے الفاظ میں صوبہ سرحد فی الواقع "سرزمین بے آئین" تھی۔ اس وقت اگر انگریز کے رعب کو کسی نے اٹھایا تو ان تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی نے جو انگلستان کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم پا کر نکلے تھے۔ پشاور کے سید علی عباس بخاری بھی انہی باحوصلہ نوجوانوں میں سے ایک تھے۔ کوئی انگریز انھیں ٹیڑھی نظر سے دیکھتا تو لاتوں اور گھونسوں سے اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیتے۔ کوئی حاکم کسی کے حقوق پر کوئی پابندی عائد کرتا تو وہ اس پابندی کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتے۔

کریم پورہ پشاور شہر کا ایک قدیم اور بارونق علاقہ ہے۔ اس کا نام سید کریم شاہ بخاری کے نام پر رکھا گیا جن کا مزار گڑھی سیداں میں مرجع خاص و عام ہے۔ سید علی عباس بخاری اسی بزرگ شخصیت کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد سیّد محمود شاہ بخاری ایک بہت متمول اور بارسوخ سرکاری ٹھیکہ دار تھے۔

سیّد علی عباس بڑے ناز و نعم سے پلے۔ ابتدائی تعلیم پشاور ہی میں حاصل کی۔ بڑے قد کاٹھ کے آدمی تھے۔ بڑے بارعب اور سخت گیر۔ اچھے کھلاڑی بھی تھے اور ذہین طالب علم بھی۔ ابھی سکول ہی میں پڑھ رہے تھے کہ ایک بار والد کے ساتھ راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا۔ والد نے کاروباری سلسلے میں ایک انگریز انجینئر گرین سے ملنا تھا۔ وہ اس کے ہاں گئے تو علی عباس کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ سید محمود شاہ اور انگریز انجینئر تو اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ سید علی عباس اس انگریز انجینئر کے بیٹے سے جو انہی کا ہم عمر تھا کھیل میں لگ گئے۔ کھیل کھیل میں دونوں بچوں میں جھگڑا ہو گیا تو بخاری نے انگریز بچے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اس پر سید محمود شاہ بڑے پریشان ہوئے اور انگریز انجینئر سے معذرت کی۔ مسٹر گرین مسکراتے رہے۔ دونوں بچوں کو بلا کر ان میں صلح کرا دی اور ساتھ ہی سید محمود شاہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے بچے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان ضرور بھیجیں۔ مسٹر گرین کا اندازہ تھا کہ جو لڑکا اس عمر میں کسی انگریز سے خوفزدہ نہیں ہو سکا وہ بڑا ہو کر بہت باحوصلہ اور باصلاحیت انسان بنے گا۔

سیّد محمود شاہ کے ہاں روپیہ پیسہ کی تو کمی نہ تھی۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے مسٹر گرین کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سید علی عباس کو انگلستان کے بیلی کالج میں داخل کرا دیا جہاں صرف چوٹی کے رؤساہی کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ سید علی عباس

بڑے حساس نوجوان تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ انگلستان کے لوگوں کو کتنی سیاسی آزادی حاصل ہے جب کہ اس کے مقابلے میں ہندوستان کے لوگ کس سیاسی اور سماجی گھٹن اور محرومیوں کا شکار ہیں۔ ان کی بے قرار طبیعت کو انگلستان میں بھی چین نہ آیا تو وہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے ۱۹۱۰ء میں وطن لوٹ آئے اور آتے ہی قومی معاملات اور سیاسیات میں دلچسپی لینی شروع کر دی، مخلص اور کھرے انسان تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، سید علی امام اور مظہر الحق جیسے نوجوان قومی کارکنوں سے ان کے گہرے روابط تھے۔

سیّد علی عباس انسانی مساوات کے قائل تھے۔ کوئی کسی کے حقوق غصب کرتا تو وہ تڑپ اٹھتے خصوصاً کوئی انگریز حاکم فرعونیت کا مظاہرہ کرتا تو وہ اسے سبق سکھانے کے لیے تیار رہ جاتے۔

۱۲ر جولائی ۱۹۱۰ء کو وہ ریل کے اول درجے میں سفر کر رہے تھے کہ اسی ڈبے میں سفر کرنے والا ایک انگریز کیپٹن میریٹ ان سے الجھ پڑا۔ بات صرف اتنی تھی کہ انگریز اپنے ساتھ اول درجہ میں کسی ہندوستانی کو سفر کرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بخاری نے اس کپتان کی خوب مرمت کی اور پھر اس کے جرنیل سر گریگ کو بھی تار دے کر اس کی شکایت درج کرا دی، فوجی ہیڈ کوارٹر سے بھی کپتان کو خوب جھاڑ پلائی گئی اور خود جرنیل نے سیّد علی عباس سے معذرت بھی کی۔

روزنامہ "سرحد" پشاور کے فاضل ایڈیٹر اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ دسمبر ۱۹۱۲ء میں بنارس ریلوے اسٹیشن پر بھی ایسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی۔ سید علی عباس اکیلے تھے اور انگریز افسر تین تھے۔ "تُو تُو مَیں مَیں" کے بعد نوبت ہاتھا پائی تک آئی تو سید علی عباس نے تینوں کو خوب مزہ چکھایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان انگریزوں میں سے ایک جنرل باتھ وے تھا دوسرا میجر سٹڈ اور تیسرا کیپٹن ہملٹن ——

۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو بخاری نے پشاور ریلوے سٹیشن پر بھی کیپٹن کارسن اور لفٹننٹ لیوک کی پٹائی کر دی۔ بخاری صاحب ایک تو انہیں اپنے ہاتھوں سے سیدھا کرتے پھر برطانوی حکومت کے ذمہ دار عمائدین بلکہ اپنے پروفیسروں تک کو خط لکھتے کہ یہ ہے انگریز قوم کی تہذیب و شرافت جس پر وہ اتنی نازاں ہے۔

انگلستان کے دوران قیام سید علی عباس مشہور سکالر، مفکر اور قومی رہنما سید امیر علی سے بڑے متاثر ہوئے اور انہی کے کہنے پر مسلم لیگ سے گہری دلچسپی لینے لگے۔ وہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کے بانی ارکان میں سے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں پشاور میں مسلم لیگ کی تنظیم قائم ہوئی تو میاں عبدالعزیز بیرسٹر کو اس کا صدر اور سید علی عباس بخاری کو اس کا جنرل سیکرٹری چنا گیا جب کہ قاضی عبدالولی خاں نائب صدر اور قاضی میر احمد جائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔

یہ وہ دن تھے جب انگریز اور اس کے حلیف طرابلس کے مسلمانوں پر انتہائی ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔ مسلمانوں میں اس وقت انگریز کے خلاف اشتعال اور نفرت اپنے عروج پر تھے، ان کے جذبات میں تلاطم برپا تھا۔ سید علی عباس بخاری نے قاضی عبدالولی سے مل کر جگہ جگہ انگریز کے خلاف احتجاجی جلسوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان جلسوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد کے عوام میں بھی سیاسی بیداری پیدا ہوتی گئی۔ اکثر علی عباس بخاری مسجد بابت خان میں تقریریں کرتے، کچھ جلسے مسجد قاسم علی خان میں بھی ہوئے، یوں پشاور میں منظم سیاسی سرگرمیوں کی بنیاد پڑی۔

بعد میں کابلی دروازے کے باہر (موجودہ خیبر بازار) اسلامیہ کلب ہال کا اہتمام ہوا تو یہ جگہ سیاسی جلسوں کا مرکز بن گئی ـــــ "سرحد اور جد و جہد آزادی" میں سید علی عباس بخاری کی جوشیلی تقریروں کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ ایک بار جذبات میں آئے ہوئے بخاری نے طرابلس کے مظلوم مسلمانوں کے لیے چندے کی اپیل کی۔

ایک غریب عورت کھڑی تقریر سن رہی تھی۔ اس غریب عورت کی جیب میں کوڑی تک نہ تھی لیکن تقریر کے زیرِ اثر اس نے اپنی گود کے بچے ہی کو چندے میں دے دیا۔ بخاری نے اس خاتون کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے بچے کا نیلام شروع کر دیا، کبھی ایک شخص اسے خریدتا کبھی دوسرا بڑھ چڑھ کر بولی دیتا۔ اس طرح کافی رقم جمع ہو گئی۔ سب سے آخر میں شخص نے اسے خریدا تھا اس نے نہ صرف وہ بچہ اس کی ماں کو واپس کر دیا بلکہ اسے اپنا بچہ بنا کر اس کی پرورش کے لیے ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

انہی دنوں سید علی عباس بخاری نے ایک اور غیر معمولی جرأت مندانہ قدم بھی اٹھایا۔ مسلمانانِ صوبہ سرحد تعلیمی میدان میں بھی انتہائی پس ماندہ تھے۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور دوسرے زعماء کی دلی خواہش تھی کہ صوبے میں تعلیم کو فروغ ملے اور جدید تعلیمی ادارے قائم ہوں۔ اس سلسلے میں وہ سر سید احمد خان کی قائم کردہ انجمن آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس سے راہنمائی حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ مسلمانانِ سرحد نے پشاور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد کرنا چاہا تو حکومت نے اجازت نہ دی، بالآخر ۱۹۱۴ء میں یہ اجلاس راولپنڈی میں بلایا گیا جس میں صاحبزادہ عبدالقیوم خان، قاضی ولی خان، سید علی عباس بخاری، قاضی میر احمد خان، بابو غلام حیدر اور دوسرے سرحدی زعماء نے شرکت کی۔

راولپنڈی کے اجلاس میں سید علی عباس اور قاضی ولی خان نے اپنی طرف سے علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ کمال الدین کو پشاور آنے کی دعوت دی۔ اس پر بڑی دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ حکومت سرحدی رہنماؤں کو پشاور آنے کی اجازت دینے پر تیار نہ تھی۔ اور علی عباس، قاضی ولی خان اور دوسرے انتہا پسند نوجوان ہر قیمت پر ان

زعماء کو پشاور لانے پر بضد تھے، بالآخر صاحب زادہ عبدالقیوم خان نے فراست سے کام لیا اور اپنی ضمانت پر حکومت سے انھیں پشاور آنے کی دعوت دی۔ ان رہنماؤں کی پشاور آمد پر ریلوے سٹیشن پر پھر مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ سید علی عباس اور قاضی ولی خاں مہمان رہنماؤں کو اپنے ہاں ٹھہرانے پر بضد تھے جبکہ پروگرام کے مطابق انھیں صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان کے پاس ٹھہرنا تھا۔ اس موقع پر بھی صاحبزادہ مرحوم ہی کی فراست نے صورتِ حال کو بگڑنے سے بچا لیا۔ اور انھوں نے سید علی عباس ہی کی بات مان لی۔

مہمان حضرات تین چار دن تک پشاور میں قیام پذیر رہے، اس دوران دو دفعہ اسلامیہ کلب ہال میں انھوں نے عوام سے خطاب کیا۔ علی برادران نے مسئلہ خلافت اور برطانوی حکومت کی پالیسی کو موضوع تقریر بنایا جبکہ مولانا آزاد نے "جہاد فی سبیل اللہ" پر اور خواجہ کمال الدین نے "تبلیغ اسلام" کے عنوان پر تقریریں کیں۔ اس طرح پشاور میں عام سیاسی جلسوں کا آغاز ہوا۔ ان دنوں اخبارات اور ریڈیو تو تھے نہیں، عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے تمام سیاسی جماعتیں جلسوں ہی سے کام لیا کرتی تھیں۔

۱۹۱۳ء میں ایک اور واقعہ کانپور میں ہوا جس سے برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات سخت مشتعل ہوئے۔ بلدیہ کانپور نے ایک سڑک تعمیر کرنے کے بہانے ایک مسجد کے کچھ حصے کو مسمار کر دیا۔ مسلمانوں نے احتجاجی جلوس نکالا تو حکومت نے گولی چلا دی۔ جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ اس پر ایک ملک گیر تحریک شروع ہو گئی جس کی قیادت کانپور کے بیرسٹر مظہر الحق کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں بھی سید علی عباس بخاری نے رات دن ایک کر دیا۔ جگہ جگہ جاتے اور اپنی پرجوش تقریروں سے مسلمانوں کے جذبۂ ملی کو بیدار کرتے۔ پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور

کیمبل پور (اٹک) سے اچھی خاصی رقم اکٹھی کر کے کانپور میں قائد تحریک بیرسٹر مظہر الحق کو بھیجی۔

تحریک ہجرت میں بھی سید علی عباس بخاری پیش پیش رہے۔ پشاور کا یہ متمول خاندان تھا جس کے سبھی افراد اپنا گھر بار اور مال و متاع چھوڑ کر عازمِ کابل ہو گیا۔ سید علی عباس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو گا وہ سیاہ لباس پہنیں گے۔ مرتے دم تک انھوں نے اس عہد کو نبھایا۔ سید علی عباس کی قربانیوں، سیاسی بصیرت اور علم و دانش کی بناء پر امیر افغانستان غازی امان اللہ خان انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ تاہم "انقلابِ افغانستان" بچہ سقہ اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں انھیں بڑی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سید علی عباس تو اسی جلاوطنی میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ نادر شاہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد یہ گھرانا واپس پشاور آیا۔ سید علی عباس کی ایک بہن ڈاکٹر تھیں اور ایک ممتاز ماہرِ تعلیم، جب کہ خاندان کے دوسرے افراد بھی اپنی خاندانی نجابت اور اور قومی خدمت کی بناء پر عوام میں بڑے قابلِ احترام ہیں۔

○

غازی عبدالرحمٰن بے

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں پشاور شہر میں حاجی غلام صمدانی خان کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کا شمار پشاور کے متمول ترین تاجروں میں ہوتا تھا۔ اونچے پایہ کے گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ انگریز افسروں سے ہر دم واسطہ تھا، تاہم انتہائی دیندار انسان تھے، ان کے آباؤ اجداد میں بڑی نامور روحانی شخصیتیں گزری تھیں، شاید اسی کا اثر تھا کہ دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود خاندان کا ہر فرد "فقر غیور" کی صفت سے متصف تھا۔ وہ خود بھی بڑے فیاض اور سخی تھے۔ دینی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ مسجد قاسم علی خان کی تعمیر و ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے بیٹے بھی قومی خدمت کے جذبے سے سرشار نکلے۔ بڑے صاحبزادے میاں عبدالعزیز بیرسٹر پشاور میں مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالنے والے تھے۔ دوسرے فرزند محمد یحییٰ جان خان اور محمد یونس خان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال قوم پرست ہیں۔ یحییٰ جان خان کانگرس وزارت میں صوبائی وزیر تعلیم بھی رہے۔ فخر افغان خان عبدالغفار خان ان کے بچوں کے نانا ہیں۔ محمد یونس خان دہلی میں ہیں اور کانگرس کے ایک نہایت مخلص کارکن ہیں۔ تاہم جرأت و ایثار میں غازی عبدالرحمٰن بے ان سب سے سبقت لے گئے۔

خان عبدالرحمٰن بڑے شکیل و وجیہہ انسان تھے۔ کشمیری الاصل ہونے کی

دیکھنے میں بڑے سُرخ و سپید، تندرست و توانا اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔
۱۸۸۶ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ بڑے ذہین طالب علم تھے۔ میٹرک کرنے کے
بعد ۱۹۰۶ء میں انھیں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا، ان دنوں تحریک خلافت
کا بڑا چرچا تھا۔ انگریز ترکوں اور طرابلس کے مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔
ایسے میں ہندوستانی مسلمان سب کچھ دیکھتے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔
عبدالرحمٰن خان بھی قومی تحریک سے متاثر ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اُڑ کر ترکیہ
پہنچیں اور اپنے مظلوم مسلمان بھائی بہنوں کی مدد کریں جو فرنگی کے ظلم کی چکی میں
پس رہے تھے۔ ایسے میں ترک زخمیوں اور بیماروں کی خدمت کے لیے تحریک خلافت
کی طرف سے ایک طبی مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ عبدالرحمٰن بے ترکی جانے کے
لیے مضطرب تھے تاہم انھیں معلوم تھا کہ اگر والدین سے اجازت طلب کی گئی تو وہ
یقیناً انکار کر دیں گے۔ اس لیے انھوں نے اپنی ذاتی اشیا اونے پونے بیچ کر
کچھ زادِ راہ مہیا کر لیا اور طبی وفد کے ہمراہ ترکی روانہ ہو گئے۔ طبی وفد کے قائد ڈاکٹر
مختار احمد انصاری تھے اور اس میں پانچ ڈاکٹر اور عبدالرحمٰن خان شامل تھے۔
۱۷ دسمبر ۱۹۱۲ء کو یہ وفد ترکی پہنچا اور پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ ترک
زخمیوں کی خدمت میں لگ گیا۔

طبی وفد تو کچھ مدت کے بعد ہندوستان واپس آ گیا لیکن غازی عبدالرحمٰن
کسی صورت ایک غلام ملک کو واپس آنے پر تیار نہ تھے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا
کہ ترکی ہی میں رہ کر ترک مجاہدوں کے شانہ بشانہ اُس اسلامی مملکت کی تعمیر و ترقی
میں حصہ لیں۔ ترک زعماء بھی ان کے اس اسلامی جذبے اور ان کے پسندیدہ طور طریقوں
سے بڑے متاثر تھے۔ انھوں نے غازی عبدالرحمٰن کی بڑی قدر کی۔ ترکی کے مشہور
مدبّر اور جنگی جہاز "حمیدیہ" کے کمانڈر (بعد میں ترکیہ کے نائب صدر) رؤف پاشا

نے انھیں اپنا بھائی بنا لیا۔ رؤف پاشا ایک لمحہ کے لیے بھی عبدالرحمٰن کی جدائی برداشت نہ کرتے، انھوں نے انھیں اپنے ہی گھر ٹھہرایا اور اپنے گھرانے کا فرد بنا لیا۔ عبدالرحمٰن بڑے فعال انسان تھے۔ ترکی فوج میں بھرتی ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے کرنل کے عہدے تک جا پہنچے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی میں حالات نے ایسی کروٹ لی کہ غازی انور پاشا کی پارٹی ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ اگرچہ عبدالرحمٰن بھی اسی پارٹی کے حامی تھے تاہم وہ ترکی ہی میں مقیم رہے۔ جب مصطفیٰ کمال کی پارٹی ملک میں برسر اقتدار آئی تو اس نے بھی عبدالرحمٰن بیگ کی بڑی قدر و منزلت کی۔ انھیں حکومت میں اہم عہدے دیے یہاں تک کہ انھیں ترکی کی طرف سے افغانستان میں سفیر بنا کر کابل بھیج دیا۔ یہ کسی غیر ترک کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ عبدالرحمٰن کو حکومت ترکیہ نے "بے" کا خطاب بھی دیا۔

کچھ سال تک سفارت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دینے کے بعد عبدالرحمٰن بے ۲۱-۲۲ مئی ۱۹۲۵ء کو اپنے شہر کی ایک تنگ گلی سے گزر رہے تھے کہ کسی ظالم ارمنی نے انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی اس لیے گلی بالکل سنسان تھی، چار گھنٹے بعد انھیں اٹھا کر ہسپتال پہنچایا گیا قابل ترین ڈاکٹر ان کا علاج کرتے رہے تاہم موت نے پیچھا نہ چھوڑا اور بالآخر وہ مردِ مجاہد اور پیکرِ حریت ۲۰ جون ۱۹۲۵ء کو اپنے اللہ کے پاس پہنچ گئے۔

ان کی وفات پر حکومت ترکیہ نے ان کی خدمات کا واضح طور پر اعتراف کیا۔ تعزیت نامہ اخباروں میں شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ اس بہادر انسان نے کئی بار میدانِ جنگ میں انگریزوں کے خلاف دادِ شجاعت دی اور کئی

بار زخمی ہوئے۔

جس وقت غازی عبدالرحمٰن "بے" کی شہادت کی خبر کابل پہنچی، پشاور کے بطلِ جلیل سید علی عباس بھی وہیں مقیم تھے۔ انھوں نے وہاں ان کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں سید علی عباس بخاری کے علاوہ آقائے محمد حسین وزیر معارف افغانستان، امیر المجاہدین مولانا عبدالرحیم محمد بشیر، مولانا مخفی اور دوسرے زعماء نے مرحوم کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا اور مختلف مسلمان ملکوں میں اتحاد و یک جہتی کو فروغ دینے کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا۔ مقررین نے بتایا کہ غازی عبدالرحمٰن بے کو سفیر کے طور پر جو تنخواہ ملتی تھی وہ سب حریت پسندوں کو بطور عطیہ دے دیا کرتے تھے۔ طلباء پر تو وہ خاص طور شفقت کی نظر رکھتے تھے۔

پشاور میں بھی ان کی وفات پر مسجد قاسم علی خان میں مولانا عبدالحکیم پوپلزئی، صدر مجلسِ خلافت کی صدارت میں بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں آغا سید لال بادشاہ، اللہ بخش یوسفی اور مرحوم عبدالرحمٰن کے بڑے بھائی محمد امین نے شاندار الفاظ میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ "سرحد" کے ایڈیٹر جناب اللہ بخش یوسفی نے لکھا ہے کہ :۔

"بعد میں ایک بار رجب رؤف پاشا، جامعہ ملیہ دہلی کی دعوت پر ہندوستان آئے تو غازی عبدالرحمٰن کی ذاتی ڈائری بھی ساتھ لائے۔ اور وہ ڈائری غازی عبدالرحمٰن کے بھائی میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے حوالے کی ــــ یوسفی صاحب کے پوچھنے پر رؤف پاشا نے کہا کہ اگر ارمنی قاتل کو معلوم ہوتا کہ سڑک پر عبدالرحمٰن جا رہا ہے تو وہ کبھی اس پر گولی نہ چلاتا۔ اس ظالم نے اسے میرا ہم شکل دیکھ کر میرے

دھوکے میں شہید کر دیا۔"

رؤف پاشا پشاور بھی آئے اور اسی کمرے میں مقیم رہے جس میں غازی عبدالرحمٰن قیام پشاور کے دوران رہا کرتے تھے۔ وہ غازی عبدالرحمٰن کے بارے میں ہر بات ان کے اہل خانہ سے دریافت کرتے اور اپنے دل کو تسلّی دیتے۔

بعد میں ایک بار ترک خواتین کی قائد خالدہ ادیب خانم بھی پشاور آئیں تو کوہاٹی دروازہ پشاور میں حاجی غلام صمدانی خان کے مکان پر ٹھہریں۔ وہ اس خانوادہ کو قابلِ تبریک سمجھتی تھیں جس میں غازی عبدالرحمٰن جیسا قربانی کا پُتلا اور شمعِ حریت کا پروانہ پیدا ہوا۔

○

قاضی فضل قادر سیاہ پوش

خلافت اور ہجرت وہ تحریکیں تھیں جنھوں نے مسلمانانِ ہند میں بیداری کی روح پھونکی اور انھیں وہ جوش اور جذبہ عطا کیا کہ انھوں نے فرنگی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔ دوسرے علاقوں کی طرح بنّوں کے اہلِ ایمان نے بھی خلافت کے جھنڈے تلے شاندار قربانیاں دیں۔ محمد جان خان بیرسٹر، شیخ حق نواز، ماسٹر میر قلم اور بیسیوں ایسے مجاہد تھے جنھوں نے کھلم کھلا فرنگی سامراج سے ٹکر لی۔ بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں خلافت کچھ کمزور پڑتی دکھائی دی تو اہل بنّوں نے خدائی خدمتگار تحریک اور کانگرس کے پلیٹ فارم سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو قصہ خوانی پشاور میں نہتے مظاہرین پر گولی چلانے سے فرنگی کے خلاف نفرت اور اشتعال میں اور بھی اضافہ ہو گیا، جگہ جگہ سیاسی جلسے ہوتے جس میں دور دراز کے دیہاتی علاقوں کے لوگ بھی شرکت کرتے۔ کارکنوں کے جلوس نکلتے تو عورتیں اور بچیاں ان پر گل پاشی کرتیں۔ فرنگی حکومت پر یہ بات روشن ہو گئی کہ کوئی زبردست طوفان اٹھنے والا ہے۔ انھوں نے دیہاتیوں کا آتشیں اسلحہ ضبط کر لیا۔ انھیں بنّوں شہر میں داخلے سے حکماً روک دیا۔ سرکردہ قومی لیڈروں میں سے خان منقرب خان، محمد سلیم خان،

حاجی محمد اسلم خان، شیخ ماذون صاحب، محمد یعقوب خان، ملک اکبر علی خان، شیخ حق نواز خاں، ماسٹر میر قلم خان، ماسٹر ممتاز خان، قاضی حبیب الرحمان۔ مولوی عبدالرحمن، حاجی آزاد خاں، حاجی میر مختار خان، بیرسٹر محمد جان اور اور دوسروں کو نظر بند کر دیا، لیکن عوامی جذبات کے سیلاب کے سامنے کون بند باندھ سکتا ہے؟ اس پر حکومت نے عوام پر مزید سختی شروع کر دی اور عوام پر تشدد کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔

اگست ۱۹۳۰ء کے آغاز میں ہاتھی خیل وزیریوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا اپنا اسلحہ حکومت کے پاس جمع کرا دیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ لوگ ایسا کرنے سے انکار کریں گے تو حکومت کو تشدد اور مداخلت کا موقع ہاتھ آجائے گا لیکن لوگوں نے پرامن رہنے کا تہیہ کر رکھا تھا اس لیے وہ حکومت کی ہر بات مانتے چلے گئے تاہم سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

ایک دن بنوں شہر کی تمام مساجد میں یہ اعلان ہوا کہ ۲۴ اگست ۱۹۳۰ء کو "سپین تنگی" میں ایک جلسہ عام منعقد ہوگا ـــــ لوگوں سے اس میں شرکت کی اپیل کی گئی۔

'سپین تنگی' بنوں شہر سے بارہ میل دور، بنوں کوہاٹ روڈ پر ایک آباد اور سرسبز قصبہ ہے، جلسہ ظہر کے بعد ہونا تھا، لیکن انگریز ڈپٹی کمشنر کرنل سی یا پچ گڈنی صبح ہی سے پولیس، فوج اور فرانٹیئر کانسٹیبلری کو لے کر وہاں پہنچ چکا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے خواہ مخواہ ایسے کام شروع کر دیے جن سے عوام میں اشتعال کا پھیلنا ناگزیر تھا۔ گاؤں کے سرکردہ رہنما ہیبت خان اور رئیس خان کو پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا۔ کوئی ٹوکنے والا تو تھا نہیں ڈپٹی کمشنر نے بغیر کسی وارنٹ کے لوگوں کی خانہ تلاشی شروع کر دی بلکہ کچھ گھروں کو آگ بھی لگا دی۔ لوگوں نے

اس پر بھی صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ان دنوں اس علاقہ میں ایک عمر رسیدہ، متقی اور پرہیزگار بزرگ قاضی فضل قادر تھے، قاضی صاحب حریت پسند رہنما تھے اور انھوں نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک ہمارا وطنِ عزیز فرنگی کافروں کے تسلط سے آزاد نہیں ہو جاتا وہ سیاہ لباس پہنا کریں گے۔ اپنے سیاہ لباس کی وجہ سے وہ عوام میں "بابا سیاہ پوش" کے نام سے مشہور تھے۔ ۲۴ اگست کا جلسہ انہی قاضی صاحب کی صدارت میں ہونا تھا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر کا یہ ارادہ بھی تھا کہ قاضی فضل قادر اور دو دوسرے سرکردہ رہنماؤں ایوب خان اور میرداد خان کو جلسے سے پہلے ہی گرفتار کرکے نظر بند کردے تاکہ وہ لوگوں سے خطاب نہ کر سکیں۔ تاہم ان رہنماؤں نے ڈپٹی کمشنر کو یقین دلایا کہ جلسہ انتہائی پُرامن ہوگا۔ لہٰذا حکومت کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے یہ بات بھی واضح کی کہ جلسے سے پہلے ان کی گرفتاری کی گئی تو عوام میں اشتعال پیدا ہوگا اور حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے، بہتر ہوگا کہ ڈپٹی کمشنر انھیں جلسے کے بعد گرفتار کرلے لیکن ڈپٹی کمشنر کے دماغ میں جانے کیا بات سمائی ہوئی تھی کہ وہ اپنی ہی من مانی کرنے پر مصر تھا۔

جلسہ حسبِ اعلان شروع ہوا۔ قاضی فضل قادر تقریر کر رہے تھے کہ ۱۳/۶ فرانٹیئر کورس کا انگریز کپتان ایش کرافٹ سٹیج پر آ دھمکا، ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اس نے آتے ہی قاضی صاحب کو داڑھی سے پکڑ لیا اور انھیں سٹیج سے اتارنا چاہا۔ قاضی صاحب نے مزاحمت کی تو اس بدمغز انگریز نے انھیں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ ایک ضعیف العمر شخص آگے بڑھا اور کپتان مذکور کو اس حرکت سے باز رہنے کو کہا تو ایش کرافٹ کے ایک ساتھی نے اسے بھی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ بازار احمد خان کا رہنے والا ایک نوجوان چنداں شاہ اس ظالمانہ کارروائی کو دیکھ کر نہ رہ سکا۔

وہ آگے بڑھا اور لور (درانتی نما خنجر) سے کپتان ایش کرافٹ کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ فوج اور پولیس تو مورچے سنبھالے پہلے ہی اشارے کی منتظر تھی، فائرنگ کا آرڈر ملتے ہی انھوں نے اس کثرت سے نہتے عوام پر گولیاں چلائیں کہ دو سو سے زیادہ شرکاء جلسہ شہید ہو گئے جن میں کافی تعداد ان عورتوں کی بھی تھی جو کچھ دُور کھڑی جلسے کی کاروائی سن رہی تھیں۔ گولی اس اندھا دھند طریقے سے چلائی گئی کہ گاؤں کے مال مویشی بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ چار سو کے قریب بھیڑ بکریاں اور اونٹ ہلاک ہو گئے۔ انتہائی گرمی کے دن تھے۔ زخمی پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑ رہے تھے لیکن کوئی انھیں پانی دینے والا بھی نہ تھا۔ طبّی امداد کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ فائرنگ سے خود انگریزی فوج کے اپنے بارہ سپاہی اور ایک حوالدار بھی مارے گئے۔ بعد میں حکومت نے یہ اعتراف تو کیا کہ اسے زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا تاہم صحیح اعداد و شمار پھر بھی نہ بتائے گئے۔

جب فرنگی حکام نے دل کی بھڑاس نکال لی اور اپنی بربریت کا جی کھول کر مظاہرہ کر لیا تو اندھا دھند پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو سامنے آیا اسے پکڑ لیا گیا۔ یہاں تک کہ گرفتار شدگان میں اندھے اور لولے لنگڑے بھی شامل تھے۔ ستاسی افراد کو گرفتار کر کے جرگہ کے سپرد کر دیا گیا۔ جرگہ کے سربراہ ایک سپیشل مجسٹریٹ تھے۔

قاضی فضل قادر (سیاہ پوش بابا) کی لاش تک ان کے ورثاء کو نہ دی گئی بلکہ فوجیوں نے خود اسے پتوں لے کر جا چوری چھپے جیل کے احاطہ میں دفن کر دیا کسی کو کانوں کان بھی ان کے تجہیز و تکفین کی خبر نہ ہونے دی۔

جرگے کے ارکان نے اپنے سفید فام آقاؤں کی خوشنودی مدنظر رکھتے ہوئے ۳۸ افراد کو سزائے قید سنا دی، ۳۲ کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال قید، چار کو دس دس سال قید اور دو (میر داد خان اور ایوب خان) کو چودہ چودہ سال قید کی سزا دی گئی۔

بعد میں جب عوام نے اس ظلم ناروا کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے واقعہ کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا تو انگریزوں نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس نعمت اللہ کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی کا اصل کام تو "قوانین جرائم سرحد" (ایف۔ سی۔ آر) کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا تھا تاہم ضمناً "ہاتھی خیل فائرنگ" پر بھی غور کیا گیا۔ جسٹس نعمت اللہ کی رائے میں بھی شرکائے جلسہ کسی خطرناک جرم کے مرتکب نہ پائے گئے چنانچہ اس نے اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا کہ

"دیکھا گیا ہے کہ اراکین جرگہ نے تحریری شہادتوں پر کوئی غور نہیں کیا اور اپنے فیصلے کی وجہ اور بنیاد بیان نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں جس سے ثابت ہو کہ ایوب خان میر اعظم، میر صاحب دین اور پیر بدن ملزمان کے پاس اسلحہ تھا۔ ..... اور یہ کہ انھوں نے یہ اسلحہ فوج کے خلاف استعمال کیا"۔

ان مسلمان حریت پسندوں نے تو آزادئ وطن کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کیا لیکن اس سے فائدہ ہندو سیاست دانوں نے اٹھایا۔ فرنگی کے ہاتھوں سرحدی مسلمانوں کے "اس قتل عام" پر عام ہندو خوش تھے کہ مسلمانوں کی طاقت کمزور پڑ رہی ہے، تاہم اس "قربانی" کا سہرا اپنے سر سجانے میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ہندو اخبارات اور لٹریچر میں لوگوں کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی گئی کہ صوبہ سرحد میں یہ تحریک اس لیے چل رہی تھی کہ سرحدی عوام گاندھی جی کی گرفتاری سے طیش میں آگئے تھے۔

ادھر گاندھی ارون مذاکرات کے نتیجے جہاں کانگرسی کارکن تو رہا ہو گئے لیکن جب صوبہ سرحد کے قومی کارکنوں نے گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہو کر دو مطالبات پیش کیے کہ ایک تو کھجوری کا میدان (جس پر ۱۹۳۰ء میں انگریز نے

قبضہ کر لیا تھا) آفریدیوں کو واپس کیا جائے، دوسرے سانحہ ہاتھی خیل (بنّوں) کے قیدیوں کو رہا کیا جائے تو گاندھی جی نے صاف کہہ دیا:۔

"وہ تشدد کے مجرم ہیں۔ میں ان کی سفارش کیسے کر سکتا ہوں؟"

بعد میں جب ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت صوبہ سرحد میں پہلی قانون ساز کونسل کا قیام عمل میں آیا تو بنّوں کے قومی رہنما خان حبیب اللہ خان نے کونسل کے اجلاس میں اس سانحہ کے باقی ماندہ قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا تو سی ایچ گڈنی (جو اس وقت رکن مالیات تھے) کی طرف سے اس مطالبے کی انتہائی مخالفت کی گئی بلکہ کونسل کے رجعت پسند ارکان نے بھی فرنگی افسروں ہی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سپین تنگی میں اس مقام پر جہاں شرکائے جلسہ پر گولی چلائی گئی تھی۔ شہیدوں کی ایک یادگار بنا دی گئی ہے۔ جہاں ہر سال لوگ عقیدت و احترام سے پھول چڑھاتے ہیں۔ شہداء میں سے سرکردہ افراد کے نام یہ ہیں:۔

ترکال خان سکنہ نرجو کلاں، مولوی صمد خان تورگری کلہ، پیاؤ خان سکنہ پٹال خیل، اندر خان سکنہ پٹال خیل، اصل دین سکنہ موسیٰ خیل، شاد امیر سکنہ پٹال خیل، گنج خان سکنہ موانہ کلہ، اسد خان سکنہ موانہ خان، تھانیدار خان سکنہ پٹال خیل، میاں محمد یوسف سکنہ مش خیل اور محمد شیر خان سکنہ شہباز عظمت خیل۔

شیخ دین محمدؒ

اسلام اپنی اشاعت و فروغ کے لیے کسی مادی طاقت کا محتاج نہیں۔ اس کے اصول حقیقت پر مبنی ہیں اور حقیقت اپنے آپ کو منوا ہی لیتی ہے۔ دُور کی بات نہیں، ماضی قریب میں جن رہنماؤں نے اسلامی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر پُرجوش حصّہ لیا، ان میں وہ غیر مسلم بھی شامل ہیں جنھوں نے تھوڑا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا تھا، اپنے خلوص اور جذبۂ صادقہ کی بدولت انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی وہ خدمت انجام دی جو کبھی فراموش نہ ہو سکے گی۔ مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا احمد علی لاہوری، شیخ عبدالمجید سندھی اور پروفیسر شیخ احمد کی عظمت کا کون معترف نہیں۔ یہ سب غیر مسلموں ہی کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ صوبہ سرحد کے مردِ مجاہد شیخ دین محمد علیہ الرحمۃ کا شمار بھی انہی پُرجوش نومسلموں میں ہوتا ہے۔

شیخ دین محمد ضلع پشاور کے ٹپہ داؤدزئی کے گاؤں شنکر پورہ کے ایک ہندو گھرانے میں ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا نام ہری چند تھا اور باپ کا نام گوردیال۔ والدین نے انھیں تحقی سکول میں داخل کرایا۔ ذہین طالب علم تھے۔ اپنے ساتھیوں اور اساتذہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اپنے ایک مسلمان ہم جماعت کے پاس "ہزار مسائل" نام کی کتاب دیکھی۔

قبضہ کرلیا تھا) آفریدیوں کو واپس کیا جائے، دوسرے سانحہ ہاتھی خیل (بنّوں) کے قیدیوں کو رہا کیا جائے تو گاندھی جی نے صاف کہہ دیا:۔

"وہ تشدّد کے مجرم ہیں۔ میں ان کی سفارش کیسے کر سکتا ہوں؟"

بعد میں جب ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت صوبہ سرحد میں پہلی قانون ساز کونسل کا قیام عمل میں آیا تو بنّوں کے قومی رہنما خان حبیب اللہ خان نے کونسل کے اجلاس میں اس سانحہ کے باقی ماندہ قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا تو سی ایچ گڈنی (جو اس وقت رکن مالیات تھے) کی طرف سے اس مطالبے کی انتہائی مخالفت کی گئی بلکہ کونسل کے رجعت پسند ارکان نے بھی فرنگی افسروں ہی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سپین تنگی میں اس مقام پر جہاں شرکائے جلسہ پر گولی چلائی گئی تھی۔ شہیدوں کی ایک یادگار بنا دی گئی ہے۔ جہاں ہر سال لوگ عقیدت و احترام سے پھول چڑھاتے ہیں۔ شہداء میں سے سرکردہ افراد کے نام یہ ہیں:۔

ترکال خان سکنہ نرجو کلاں، مولوی صمد خان تور گری کلہ، پیاؤ خان سکنہ ٹپال خیل، اندر خان سکنہ ٹپال خیل، اصل دین سکنہ موسیٰ خیل، شاہ امیر سکنہ ٹپال خیل، گنج خان سکنہ موازنہ کلہ، اسد خان سکنہ موازخان، تھانیدار خان سکنہ ٹپال خیل، میاں محمد یوسف سکنہ مش خیل اور محمد شیر خان سکنہ شہباز عظمت خیل۔

شیخ دین محمدؒ

اسلام اپنی اشاعت و فروغ کے لیے کسی مادی طاقت کا محتاج نہیں۔ اس کے اصول حقیقت پر مبنی ہیں! اور حقیقت اپنے آپ کو منوا ہی لیتی ہے۔ دُور کی بات نہیں، ماضی قریب میں جن رہنماؤں نے اسلامی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر پُرجوش حصّہ لیا، ان میں وہ غیر مسلم بھی شامل ہیں جنھوں نے تھوڑا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا تھا، اپنے خلوص اور جذبۂ صادقہ کی بدولت انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی وہ خدمت انجام دی جو کبھی فراموش نہ ہو سکے گی۔ مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا احمد علی لاہوری، شیخ عبدالمجید سندھی اور پروفیسر شیخ احمد کی عظمت کا کون معترف نہیں۔ یہ سب غیر مسلموں ہی کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ صوبہ سرحد کے مردِ مجاہد شیخ دین محمد علیہ الرحمۃ کا شمار بھی انہی پُرجوش نو مسلموں میں ہوتا ہے۔

شیخ دین محمد ضلع پشاور کے ٹپہ داؤدزئی کے گاؤں شنکر پورہ کے ایک ہندو گھرانے میں ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا نام ہری چند تھا اور باپ کا نام گوردیال۔ والدین نے انھیں تحقی سکول میں داخل کرایا۔ ذہین طالب علم تھے۔ اپنے ساتھیوں اور اساتذہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اپنے ایک مسلمان ہم جماعت کے پاس "ہزار مسائل" نام کی کتاب دیکھی۔

اسے گھر لے جا کر پڑھا تو ان پر اسلام کی حقیقت روشن ہو گئی۔ اس نے اپنے دوست احمد خان کو بتایا کہ "مَیں اسلام کی حقانیت کا قائل ہوں اور مسلمان ہونا چاہتا ہوں"۔ احمد خان نے بات پر کوئی توجہ نہ دی، اتفاق سے علاقے کے تحصیل دار کا بیٹا ضیاء الدین ہری چند کا ہم جماعت تھا، اس نے صبح سکول آتے ہی کہا "مجھے آج ہری چند کا چہرہ چاند کی طرح روشن دکھائی دیتا ہے۔ جانے کیا بات ہے؟" — اس پر احمد خان نے اسے ہری چند کے ارادے سے آگاہ کیا۔

بات پھیلتے پھیلتے گاؤں کے امام مسجد مولوی محمد امیر تک پہنچی جو حضرت نجم الدین ہڈہ ملّا جیسے مرد مجاہد کا مرید تھا۔ وہ تبرّگا ہری چند کو حضرت ہڈہ ملّا صاحب کے پاس لے گیا جو ان دنوں جڑ وبئی (آزاد مہمند) میں قیام فرما تھے۔ حضرت ملّا صاحب نے ہری چند کو مشرف باسلام کیا، شیخ دین محمد نام رکھا، کچھ دن تک مسجد میں اپنے ساتھ رکھا پھر سلسلۂ عالیہ قادریہ میں اسے بیعت کر کے اپنے مریدوں کے زمرہ میں داخل کیا۔ شیخ دین محمد پر ملّا صاحب ہڈہ کی عظیم شخصیت اور مجاہدانہ کردار کا وہ اثر مرتّب ہوا کہ وہ وہیں رہ پڑا۔

۱۸۹۷ء میں حضرت ہڈے ملّا صاحب نے فرنگی کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا تو بھی شیخ دین محمد سائے کی طرح اپنے مرشدِ گرامی کے ساتھ ساتھ رہے۔ قلعہ شبقدر کا کوئی فوجی افسر مسلمان تھا اس نے غازیوں کو پیغام بھجوایا کہ قلعے پر حملے سے کیا ملے گا؟ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ شبقدر منڈی میں ہندو سکھ سیٹھوں کی دکانیں لوٹ لو، کچھ ہاتھ تو آئے گا"۔ اس پر لوگ لوٹ مار ہی میں لگ گئے۔ صبح سویرے پشاور چھاؤنی سے شبقدر کی فرنگی فوج کو کمک پہنچ گئی، سبحان خوڑ کے پاس سخت لڑائی ہوئی۔ اس معرکہ میں شیخ دین محمد کو گولی لگی تاہم جان بچ گئی۔ غازیوں کے پاس گولہ بارود اور خوراک کا ذخیرہ

ختم ہو گیا تو وہ پیچھے ہٹ کر اپنی پہاڑی کمین گاہوں میں مورچہ بند ہو گئے۔ فرنگیوں نے ہڈہ ملّا صاحب کی گرفتاری کے لیے وہاں بھی فوج بھیجی۔ ملا صاحب اس وقت چمرقند کی مسجد میں یاد اللہ میں مصروف تھے۔ اس وقت ان کے پاس پچاس کے قریب شیخ یا جاں نثار تھے جن میں نو مسلم شیخ دین محمد بھی شامل تھے۔ فرنگی لشکر نے چمرقند کی مسجد کا محاصرہ کر لیا تو سبھی گھبرا گئے اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ تاہم حضرت ہڈہ ملّا کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور اپنے اللہ سے امداد و نصرت طلب کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادل آئے اور اس زور سے ژالہ باری ہوئی کہ اکثر انگریز زخمی ہو گئے اور ان کے گھوڑے مر گئے۔

چمرقند کی غزا کے بعد ہڈہ ملّا صاحب نے شیخ دین محمد کو خرقۂ خلافت عطا کیا اور سلسلۂ قادریہ میں اپنا ماذون مقرر فرمایا۔

امیر عبدالرحمٰن، والیٔ افغانستان ہڈہ ملّا صاحب کا مخالف تھا۔ اس کی وفات پر جب حبیب اللہ خان کابل میں برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے ہڈہ ملّا صاحب پر عائد شدہ پابندیاں ختم کر دیں، جب ہڈہ ملّا صاحب اپنے گاؤں ہڈہ (افغانستان) گئے تو اس وقت بھی شیخ دین محمد اپنے مرشد کے پابرکاب تھے۔

مرشد کی وفات کے بعد وہ پشاور چلے آئے، شکرپورہ میں ڈیرہ لگایا اور اپنے آپ کو تبلیغِ اسلام کے لیے وقف کر دیا، شیخ دین محمد معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط رسوم کی اصلاح پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ بڑے دریا دل انسان تھے اپنے پلّے سے خرچ کر کے مساکین کی شادیاں کرا دیتے تھے، لوگوں کو بیاہ شادی اور ختنوں کی تقریبات پر فضول خرچی سے منع کرتے تھے۔

ان کا بڑا وصف یہ تھا کہ خود بھی راہ خدا میں جہاد میں شرکت کرتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی نے فرنگی کے خلاف جہاد کیا تو شیخ دین محمد نے بھی ان کے شانہ بشانہ اس میں حصہ لیا۔ اس پر انگریزوں کی حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا اور ان کی خانقاہ پر پولیس کی تعزیری چوکی بٹھا دی جو ۱۹۳۵ء تک قائم رہی۔ اس اثنا میں انھوں نے دوبارہ حج کیا۔ کئی مقامات پر مسجدیں تعمیر کرائیں۔ بالآخر یہ مردِ مجاہد ۹ ذوالحجہ ۱۳۶۲ھ کو اپنے اللہ کے پاس جا پہنچا۔ انھیں شکر پورہ ہی میں دفن کیا گیا۔

○

مولانا احمد گُل

مولانا احمد گل کوہاٹ کے محسنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ شمع اسلام کے پروانے تھے اور مسلمانوں کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی خدمت کے میدان میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ مسلمانانِ سرحد میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں ان کی ان کی خدمات کا بڑا حصہ ہے۔ اُن دنوں جب مسلمان بحیثیت قوم تعلیم کے میدان میں بہت پسماندہ تھے۔ مولانا احمد گُل نے شاہ جی وکیل (سید محمد اشرف) اور شیخ عبدالرحمن کے ساتھ مل کر انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے زیرِ انتظام کوہاٹ میں اسلامیہ ہائی سکول اور پبلک ہال تعمیر ہوا۔ ان دنوں صوبے میں کوئی منظم سیاسی جماعت تو نہیں البتہ اسلامیہ ہائی سکول کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ملک کے نامور مسلمان زعماء کو بلایا جاتا جن کی تقریریں مسلمان عوام کے دلوں میں تحریکِ عمل پیدا کرتیں۔ مولانا شبلی نعمانی، خواجہ کمال الدین احمد، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے عظیم قائدین نے انجمن اسلامیہ ہی کی سٹیج سے مسلمانوں سے خطاب کیا۔

طرابلس پر انگریزوں نے فوج کشی کی تو ملک کے دوسرے شہروں کی طرح کوہاٹ میں بھی اس کا شدید ردِ عمل دیکھنے میں آیا۔ ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر انصاری کی تجویز پر علی گڑھ سے ایک وفد کوہاٹ آیا جس کے قائد مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اس وفد کے ایک رکن سردار عبدالرؤف پشاوری نے ترکوں کی حمایت اور انگریز کی مخالفت میں وہ

ان کا بڑا وصف یہ تھا کہ خود بھی راہِ خدا میں جہاد میں شرکت کرتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی نے فرنگی کے خلاف جہاد کیا تو شیخ دین محمد نے بھی ان کے شانہ بشانہ اس میں حصہ لیا۔ اس پر انگریزوں کی حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا اور ان کی خانقاہ پر پولیس کی تعزیری چوکی بٹھا دی جو ۱۹۳۵ء تک قائم رہی۔ اس اثنا میں انھوں نے دو بار حج کیا۔ کئی مقامات پر مسجدیں تعمیر کرائیں۔ بالآخر یہ مردِ مجاہد ۹ ذوالحجہ ۱۳۶۲ھ کو اپنے اللہ کے پاس جا پہنچا۔ انھیں شکر پورہ ہی میں دفن کیا گیا۔

○

مولانا احمد گُل

مولانا احمد گل کوہاٹ کے محسنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ شمع اسلام کے پروانے تھے اور مسلمانوں کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی خدمت کے میدان میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ مسلمانانِ سرحد میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں ان کی ان کی خدمات کا بڑا حصہ ہے۔ اُن دنوں جب مسلمان بحیثیت قوم تعلیم کے میدان میں بہت پسماندہ تھے۔ مولانا احمد گُل نے شاہ جی وکیل (سید محمد اشرف) اور شیخ عبدالرحمٰن کے ساتھ مل کر انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے زیرِ انتظام کوہاٹ میں اسلامیہ ہائی سکول اور پبلک ہال تعمیر ہوا۔ ان دنوں صوبے میں کوئی منظم سیاسی جماعت تو نہیں البتہ اسلامیہ ہائی سکول کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مُلک کے نامور مسلمان زعماء کو بلایا جاتا جن کی تقریریں مسلمان عوام کے دلوں میں تحریکِ عمل پیدا کرتیں۔ مولانا شبلی نعمانی، خواجہ کمال الدین احمد، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے عظیم قائدین نے انجمن اسلامیہ ہی کی سٹیج سے مسلمانوں سے خطاب کیا۔

طرابلس پر انگریزوں نے فوج کشی کی تو مُلک کے دوسرے شہروں کی طرح کوہاٹ میں بھی اس کا شدید ردِّ عمل دیکھنے میں آیا۔ ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر انصاری کی تجویز پر علی گڑھ سے ایک وفد کوہاٹ آیا جس کے قائد مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اس وفد کے ایک رکن سردار عبدالرؤف پشاوری نے ترکوں کی حمایت اور انگریز کی مخالفت میں وہ

معرکۃ الآراء تقریر کی جو بڑے بوڑھوں کو ابھی تک نہیں بھولی۔ ان جلسوں اور مولانا احمد گل جیسے ایثار پیشہ زعماء کی کوششوں کی بدولت نئی نسل حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوئی۔ اسلامیہ ہائی سکول سے نکلے ہوئے طلبا نے کوہاٹ کی سیاست میں اہم کردار انجام دیا۔

۱۹۱۹ء میں امرتسر کے نہتے عوام پر گورا فوج کی فائرنگ سے ملک بھر میں شدید اشتعال پھیل گیا تو کوہاٹ سے رضاکاروں کا ایک دستہ جس میں میاں غلام محمد پراچہ ملتانی، میاں غلام محمد کتی، حافظ رحمت اللہ اور مولانا عبداللطیف شامل تھے، امرتسر گیا۔ ان لوگوں کی واپسی پر کوہاٹ میں مجلس خلافت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ مولانا احمد گل مجلسِ خلافت کے صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے انتہائی جانفشانی سے کام کرتے ہوئے مجلس خلافت کو اتنا منظم کیا کہ انگریز اسے اپنے لیے ایک خطرہ سمجھنے لگے۔ ایک بار ڈپٹی کمشنر نے مولانا احمد گل کو بلایا اور دو شرطیں ان کے سامنے رکھیں۔ یا مجلس خلافت کے کارکن رہو یا انجمن اسلامیہ کے صدر۔ مولانا کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے، ان کا خیال تھا کہ انجمن تو اب چل ہی نکلی ہے، اسے کوئی اور بھی چلا لے گا لیکن مجلس خلافت کو ابھی میری ضرورت ہے، لہذا انھوں نے انجمن اسلامیہ کی صدارت سے استعفیٰ لکھ کر ڈپٹی کمشنر کو پیش کر دیا اور خود کو ہمہ تن مجلس خلافت کے لیے وقف قرار دے دیا۔ رفتہ رفتہ پیر شہنشاہ، خیر محمد جلالی، لالہ ایوب اور دوسرے لوگ بھی مولانا احمد گل کا ساتھ دینے لگے۔ ان حضرات ہی کی کوششوں سے کوہاٹ میں منظم سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

بعد میں ہجرت کی تحریک میں بھی اہل کوہاٹ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اہل کوہاٹ میں سے بہت سے لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر افغانستان کو ہجرت کر گئے۔ ہزاروں روپیہ کی رقم مہاجرین کے لیے اکٹھی کی گئی، لوگ انگریزی عدالتوں میں جانے کی بجائے

اپنے تنازعات جرگوں میں طے کرنے لگے اور اس طرح انگریز کا رعب بالکل اٹھ گیا۔

خلافت اور ہجرت کے بعد ترکِ موالات کی تحریک چل نکلی، قحبہ خانوں، شراب خانوں اور غیر ملکی سامان بیچنے والی دکانوں پر پکیٹنگ شروع ہوئی۔ مولانا احمد گل اور پیر سید کمال اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ وہ باغیانہ تقریریں کرتے اور عوام کو فرنگی حکومت سے عدمِ تعاون کرنے کی ہدایت کرتے۔ ایک بار انھیں گرفتار کرکے ان پر بغاوت پھیلانے کے جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ اشتعال سے بچنے کے لیے مقدمہ کی سماعت ڈھوڈہ ریسٹ ہاؤس میں ہوئی اور دونوں رہنماؤں کو تین تین سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ سزا سنانے کے بعد جب پولیس کی حراست میں انھیں ڈھوڈہ سے کوہاٹ جیل لے جایا جا رہا تھا کہ انھیں دیکھنے کے لیے پندرہ بیس ہزار لوگ جمع ہو گئے اور "حکومت برطانیہ برباد" کے نعرے لگانے لگے۔ دوسرے دن ان راہنماؤں کی گرفتاری کی خبر قبائلی علاقوں اور دیہات میں پہنچی تو پیر سید کمال کے ہزاروں مرید جیل کے باہر جمع ہو گئے اور بلوے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے اس خطرناک صورتِ حال کو بھانپ کر خیر اسی میں سمجھی کہ دونوں راہنماؤں کو رہا کر دیا جائے۔ جب دونوں رہنماؤں کو جیل سے رہا کیا گیا تو لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ یہ کوہاٹ کے عوام کی پہلی سیاسی فتح تھی۔

کچھ عرصہ بعد مولانا احمد گل، پیر سید کمال، غلام محمد پراچہ اور غلام محمد دکنی کو دو دو سال کے لیے زبان بندی کا حکم سنایا گیا لیکن گاڑی اب چل نکلی تھی۔ کوہاٹ کا ہر فرد اب مولانا احمد گل بن چکا تھا۔ اس لیے سیاسی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آنے پائی۔

جب یہ میعاد ختم ہوئی تو ترکِ موالات کے تحت کوہاٹ سے قحبہ خانہ (چکلہ) اٹھانے کی مہم چلائی گئی۔ اس وقت تک میاں فضل شاہ، حاجی سعید شاہ بنوری اور

دوسرے سرکردہ لوگ بھی خلافت کمیٹی کے ممبر بن چکے تھے۔ پکٹنگ شروع ہوئی دو تین دن میں تیس چالیس افراد نے گرفتاری پیش کی۔ پکٹنگ کا سلسلہ کئی ہفتے تک زور شور سے جاری رہا، بالآخر سرکار نے گھٹنے ٹیک دیے۔ چکلہ اٹھا دینے کا اعلان ہوا اور تمام گرفتار کیے جانے والوں کو رہا کر دیا گیا —— یہ اہل کوہاٹ کی دوسری سیاسی فتح تھی۔

تحریک خلافت کے دنوں میں ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا برقرار رہی، یہاں تک کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ہی پنڈال اور ایک ہی شہر میں منعقد ہوتے رہے۔ گاندھی جی اور دوسرے ہندو رہنما مجلس خلافت ہی کے فنڈ پر دورے کیا کرتے اور مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں کام کرنے کو باعث فخر سمجھتے —— لیکن جب ہندو نیتاؤں کا مطلب نکل گیا تو انھوں نے آنکھیں پھیر لیں، ہندو مہاسبھا کھل کر سامنے آ گئی، اس نے "شدھی" اور سنگھٹن کی تحریکیں چلائیں اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں۔

ماہ اگست ۱۹۲۴ء کے آخری دن تھے، سناتن دھرم سبھا کوہاٹ کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوا جس میں باہر سے آئے ہوئے ہندو مقرروں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑی دلآزار تقریریں کیں۔ اشتعال انگیز پمفلٹ تقسیم کیے۔ ہندوؤں کی کئی منڈلیاں "مسلمان کی ہستی مٹانی پڑے گی" قسم کے گیت اور ترانے گاتی رہیں۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے جذبات بے حد مشتعل ہو گئے —— مقامی سناتن دھرم کے سیکرٹری نے بھی دریدہ دہنی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک گستاخانہ نظم پڑھی۔

فضا بڑی کشیدہ تھی کہ یکم ستمبر کو محلہ پراچگان میں حاجی عصمت اللہ کا بیٹا فوت

ہوگیا۔ لوگ جنازے کے لیے جمع تھے کہ منشی لال محمد کھڑے ہوگئے اور ہندوؤں کی ان اشتعال انگیزیوں کی سخت کی۔ جنازے سے فراغت ہوئی تو تمام لوگ ایک جلوس کی صورت میں ڈپٹی کمشنر کوہاٹ کے بنگلہ پر پہنچے اور ہندوؤں کی ان اشتعال انگیزیوں پر شدید احتجاج کیا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے سناتن دھرم سبھا کے سیکرٹری جیون داس کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور مسلمان مطمئن ہوکر واپس گھروں کو چلے گئے۔

جیون داس چند دن تک حوالات میں رہا تو ہندو سکھ لیڈروں نے ضمانت دے کر اسے رہا کرا لیا۔ اس گستاخ کی رہائی تباہی کا پیش خیمہ بن گئی۔ ۸ ستمبر کو اسے کھلے بندوں پھرتے ہوئے دیکھ کر مسلمانوں کا خون کھول اٹھا۔ مسجد حاجی بہادر میں ایک ہنگامی جلسہ منعقد ہوا جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ جیون داس کی ضمانت منسوخ کی جائے اور اس پر مقدمہ چلایا جائے لیکن حکومت چپ سادھے رہی —— اس عرصہ میں ہندوؤں کو اپنے مکانوں پر مورچے بناتے دیکھا گیا —— انھوں نے گولی بارود اور کھانے پینے کا سامان خرید کر گھروں میں ڈال لیا —— اس پر مسلمان سمجھ گئے کہ یہ تیاری کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

دوسرے دن مسجد حاجی بہادر میں پھر جلسہ ہوا۔ مسلمان نوجوانوں کے جذبات سخت مشتعل تھے تاہم میاں فضل شاہ نے تقریر کر کے ان کے غصے کو فرو کیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ ہونے نہ پایا۔

۹ ستمبر ۱۹۲۴ء کو سارے علاقے کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ٹاؤن ہال کے باہر منعقد ہوا۔ مسلمان تقریروں اور نعروں میں مصروف تھے ادر ادھر ہندو سکھ ٹاؤن ہال سے شہر کو جانے والے سارے راستوں کے مکانوں اور بالاخانوں پر مورچے جمائے بیٹھے تھے۔ ان کا ناپاک منصوبہ یہ تھا کہ جونہی مسلمان جلسہ گاہ سے گھروں

کو لوٹیں انھیں بے خبری میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا جائے ۔۔۔ اس جلسے میں ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ سناتن دھرم کے سیکرٹری کی ضمانت منسوخ کر دی جائے گی اور اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد مسلمان مطمئن ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں کو چل پڑے۔

ہندو تو مورچوں میں تیار بیٹھے ہی تھے جونہی مسلمان جلسہ گاہ سے شہر میں داخل ہوئے انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ پہلی گولی غزن خان نامی نوجوان کو لگی اور وہ شہید ہو گیا ۔۔۔ چشم زدن میں ہندو تمام مورچوں سے فائرنگ کرنے لگے اور بے خبر مسلمان زخمی ہو کر گرنے لگے ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ مسلمان شہید اور پندرہ زخمی ہو گئے۔

جب مسلمانوں کے لیے کوئی جائے مفر نہ رہی تو محلہ شنو خیل کے ایک نوجوان اکبر خان نے، جو فوج میں بھی رہ چکا تھا ایک پنساری کی دکان توڑ ڈالی اور وہاں سے مٹی کے تیل کا ایک کنستر لے کر چھڑکا اور آگ لگا دی۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی یہی کام کیا اور چند ہی منٹوں میں سارے بازار سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ادھر پولیس کپتان نے بھی لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے دکانیں لوٹنے کا اشارہ کر دیا جس پر خوب لوٹ مار مچی۔ تاہم اس دوران بھی ہندو مورچوں میں ڈٹے رہے۔

دوسرے دن درہ آدم خیل اور ارد گرد کے دیہات سے لوگ کوہاٹ پہنچنے لگے، انھوں نے شہر کی ناکہ بندی کر لی۔ جو بھی ہندو اس ناکہ بندی کو توڑنے کی کوشش کرتا، گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ اس طرح کافی ہندو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی اثناء میں دو کانیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ فائر بریگیڈ آگ فرو کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ بالآخر فوج نے بہت سی دکانیں گرا دیں تب کہیں

آگ پر قابو پایا جا سکا۔

تیسرے دن مجبور ہو کر ہندوؤں نے صلح کی درخواست کی، جسے مسلمانوں نے منظور کر لیا اور اس طرح فساد رک گیا ـــــ فساد کے ان تین دنوں میں بزرگ خلافتی رہنما مولانا احمد گل کوہاٹ کے "بلے تاج بادشاہ" تھے۔ ان کی تحریری اجازت کے بغیر نہ کوئی شخص باہر سے شہر میں داخل ہو سکتا تھا نہ شہر سے کہیں باہر جا سکتا تھا۔

اس فساد کے نتیجے میں وہ خوف و ہراس پھیلا کہ سولہ ہزار ہندو سکھ کوہاٹ خالی کر گئے اور پورا ایک سال تک راولپنڈی میں مقیم رہے ـــ گاندھی جی نے تارکین وطن سے اپنی ہمدردی ظاہر کرنے کے لیے "مرن بھرت" شروع کر دیا، پنڈت مدن موہن مالویہ نے کروڑوں روپیہ ہندوستان سے جمع کر کے ہندو متاثرین فساد کو دیا۔ بالآخر صاحبزادہ عبدالقیوم خان، نواب سر محمد اکبر خان ہوتی، پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ خوش حال چند خورسند کوہاٹ آئے۔ مسلمانوں کا اجلاس بلایا اور انھیں ہندوؤں سے مصالحت پر راضی کر لیا۔

مولانا احمد گل انتہائی مخلص اور پاکباز انسان تھے۔ نام و نمود کی خواہش ان کے نزدیک تک نہ پھٹکتی تھی، اسلامیہ ہائی سکول کی شاندار عمارت بنانے پر جب حکومت نے تعمیری کاموں میں حصہ لینے والوں کو "خان صاحب" کا خطاب دینا چاہا تو مولانا نے خطاب لینے سے انکار کر دیا۔ مولانا علم و ادب اور شعر و سخن کے رسیا تھے تاہم سیاسی اور قومی مشاغل نے انھیں کبھی اتنی فرصت نہ دی کہ وہ دل جمعی سے مشق سخن کر سکیں۔

سنہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران کوہاٹ پر دشمن نے بمباری کی تو بدقسمتی سے زیادہ نقصان مولانا احمد گل ہی کے عزیز و اقارب ہی کو برداشت

کرنا پڑا ــــــ مسلمانانِ صوبہ سرحد اور بالخصوص اہلِ کوہاٹ پیکرِ ایثار و وفا مولانا احمد گل کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

کتنے جامع الحیثیات بزرگ تھے مولانا عبدالرحیم پوپلزئی ——— عالم بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، سیاسی کارکن بھی، انقلابی رہنما بھی، صاحب مسند و دستار بھی اور صاحب عظمت و کردار بھی ——— بلاشبہ وہ ایک مجتہد العصر انسان تھے۔ بڑے ایثار پیشہ اور با حوصلہ۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ان کی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند ہی میں گزرا ——— ان کی صحت جواب دے گئی لیکن ملک و ملت کی خدمت کے سلسلے میں ان کے پائے استقلال میں لغزش آنے نہ پائی۔ وہ جہاں بھی رہے اور جس حال میں بھی رہے آزادیٔ وطن ان کا نصب العین رہا۔ مسلمان اور کسی کا غلام ہو۔ یہ بات کسی طور بھی انھیں گوارا نہ تھی۔ ان کے اشعار ہیں۔

مذہب نہیں دیتا ہے تعلیم غلامی کی تم سچے مسلماں ہو، آزادی کے پروانو
سختی سے نہ گھبراؤ وہ سامنے منزل ہے کچھ اور بھی تیزی سے بڑھتے جاؤ دیوانو
یہ برق زدہ خرمن تاراج ہوا تو کیا کس چیز سے ڈرتے ہو اے سوختہ سامانو

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی پشاور کے ایک نہایت ممتاز علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا علامہ محمد امین اپنے علم و فضل کی بدولت نہ صرف صوبہ سرحد بلکہ کابل، قندھار اور غزنی تک کے علاقوں میں بڑے احترام سے دیکھے جاتے تھے ان کے والد بزرگوار مولانا عبدالحکیم مفتیٔ سرحد بھی تھے اور جمعیت خلافت پشاور

پشاور کے صدر بھی، پشاور کا ایک محلہ اب بھی ان کے نام پر کوچہ مولانا عبدالحکیم کہلاتا ہے۔ دور و نزدیک دینی معاملات میں ان کا فتویٰ چلتا تھا۔ دن بھر ان کی مسجد میں مختلف علوم کے طلباء کا ہجوم رہتا۔ لوگ دُور دُور سے ان کے علم و فضل کا شہرہ سن کر ان کی شاگردی اختیار کرتے اور فیض پاتے۔ دینی اور سیاسی امور میں اہلِ سرحد اس گھرانے سے رہنمائی حاصل کرتے۔ ۱۸۹۰ء میں اسی نامور گھرانے میں اس انقلابی رہنما نے جنم لیا جن کی ان تھک مساعی اور بے لوث قربانیوں کی یاد لوگوں کے دلوں سے کبھی محو ہونے نہ پائے گی۔ اس حق پرست راہنما کا نام مولانا عبدالرحیم پوپلزئی تھا ــــ مولانا بچپن ہی سے بڑے ذہین بڑے حساس اور بڑے ہونہار تھے۔ انھوں نے اپنے والد محترم اور دوسرے علمائے سرحد سے مروجہ علوم کی درسی کتابیں ختم کیں ــــ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کچھ عرصہ علمائے رامپور کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ پھر ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا جہاں خوش قسمتی سے شیخ الہند علامہ محمود الحسن جیسے مجاہد انسان شیخ المدرس تھے ــــ شیخ الہند نے مولانا عبدالرحیم کی خصوصی تربیت کی، انھیں اپنے اس مجاہد شاگرد پر فخر رہا تو دوسری طرف مولانا عبدالرحیم بھی زندگی بھر اس بات کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتے رہے کہ وہ شیخ الہند جیسے مجاہد استاد کے شاگرد ہیں۔

ان دنوں خلافت اور ہجرت کی تحریکیں زوروں پر تھیں، ہر مسلمان اس امر کا متمنی تھا کہ جیسے بھی ہو فرنگی سامراج سے آزادی حاصل کی جائے۔ اس سلسلے میں جہاں سیاسی طور انگریزی حکومت کے خلاف محاذ قائم کیا گیا وہیں عملی جہاد کے لیے قبائلی علاقہ مہمند میں ایک مرکزِ جہاد بھی قائم کیا گیا۔ شیخ الہند اس تحریکِ جہاد کے سربراہ تھے۔ اور مولانا عبیداللہ سندھی، حاجی صاحب ترنگ زئی، مولانا سیف الرحمن

اور مولانا عبدالرحیم پوپل زئی اس کے سرگرم رہنما ـــــ اس سلسلے میں تحریک حزب اللہ بھی ایک فعال جماعت تھی جو مجاہدین کو اسلحہ اور نقد امداد مہیا کرتی تھی ـــــ حضرت شیخ الہند کے عزائم یہ تھے کہ افغانستان کی راہ ترکیہ کی فوجیں ہندوستان کی طرف پیش قدمی کریں تو قبائلی علاقہ کے مجاہدین بھی ان کا ساتھ دیں اور فرنگی کی غلامی کا جوا اتار کر پھینک دیں۔ اس کی تفصیل یوں طے پائی کہ:

۱۔ قلات اور مکران کے قبائلی مجاہد ترکی فوج کے اشتراک سے کراچی پر حملہ آور ہوں۔

۲۔ غزنی اور قندھار کے مجاہد ترک افسروں کی قیادت میں حیدرآباد کو مسخر کرتے ہوئے کراچی پہنچیں۔

۳۔ ترک اور آفریدی مجاہد مل کر پشاور کی طرف پیش قدمی کریں۔

۴۔ ملاکنڈ اور شبقدر سے یوسف زئی اور مہمند غازی پشاور کا رخ کریں۔

۵۔ وانا۔ کانی گرام اور نواحی علاقوں کے مردانِ مجاہد ڈیرہ اسماعیل پر حملہ کر دیں۔

۶۔ وزیرستان کے مقام میران شاہ کے رضاکار بنوں پر ٹوٹ پڑیں۔

۷۔ تیراہ کے آفریدی قبائلی ترک سپاہیوں سے مل کر کوہاٹ پر دھاوا بول دیں۔

۸۔ اوگی (ہزارہ) کے محاذ سے ایبٹ آباد اور دوسری انگریزی چھاؤنیوں پر پیش قدمی کر کے انہیں تاخت و تاراج کیا جائے۔

اس جہاد کے لیے لوگوں کو ابھارنے کی خاطر مولانا سیف الرحمن، مولانا فضل ربیؒ، مولانا فضل محمود، مولانا عبدالعزیز، مولانا محمد اکبر اور مولانا عبدالرحیم پوپل زئی قریہ قریہ اور بستی بستی جاتے اور لوگوں کے دلوں میں جہاد کی جوت جگاتے۔ مسلمانان سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئی پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ کوئی اصلاحی یا سیاسی تحریک ان کی شمولیت کے بغیر یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ گویا آپ کی حیثیت اس

وقت ایک قائد کی تھی۔

مولانا نہ صرف بلند پایہ عالم دین اور خطیب تھے بلکہ ادب و سخن کی دنیا میں بھی انھیں بلند مقام حاصل تھا۔ مسلمانانِ سرحد میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار "سرفروش" نکالا۔ اس اخبار کا مقصد حکومت کے ظالمانہ احکام کے خلاف آواز اٹھانے کے ساتھ مزدوروں، کسانوں اور مظلوم انسانوں کو خان خوانین اور سرمایہ داروں کے مظالم سے محفوظ رکھنا بھی تھا۔ اس اخبار نے پہلی مرتبہ صوبہ سرحد کے کچلے ہوئے مزارعین، مزدوروں اور محنت کشوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور عوام میں سیاسی بیداری پیدا کی۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اپنے وسیع مطالعہ اور دقیق مشاہدہ کی بناء پر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "دنیا کی سب قوموں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن انگریز قوم ہرگز قابلِ اعتماد نہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر اس جماعت کا ساتھ دیتے تھے جو فرنگی سامراج کی دشمن ہو۔ پہلے پہل آل انڈیا نیشنل کانگرس نے حصولِ آزادی کو اپنا نصب العین بنایا تو مولانا عبدالرحیم نے اس کی حمایت میں آواز اٹھائی، چنانچہ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے پشاور میں کانگرس کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ تاہم بہت جلد مولانا پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کانگرس اصل میں ہندو سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی جماعت ہے نہ کہ غریب عوام کی نمائندہ تنظیم۔ اس پر انھوں نے کانگرس کو چھوڑ کر "نوجوان بھارت سبھا" کے نام سے ایک الگ جماعت قائم کی جو اشتراکی اور انقلابی نظریات کی حامل تھی۔

۱۹۳۰ء میں مولانا عبدالرحیم کو نوجوان بھارت سبھا کا سرپرست منتخب کیا گیا۔ اس جماعت کے منشور میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ملک کا نظام حکومت معاشی اور اقتصادی خوشحالی کا کفیل ہو۔ ہر جگہ عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ ظلم و استبداد

کا خاتمہ ہو تاکہ مظلوم کی حق تلفی ہونے نہ پائے۔

جب حاجی صاحب ترنگ زئی نے آزاد علاقہ مہمند کی طرف ہجرت کی اور فرنگی کے خلاف مسلح جہاد کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا عبدالرحیم حضرت شیخ الہند محمود الحسن اور حاجی صاحب ترنگ زئی کے درمیان رابطہ کا کام دیتے رہتے۔ شیخ الہند کے پیغامات اور عطیات حاجی صاحب تک پہنچانے کی ذمہ داری انھوں نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ چونکہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کے بیشتر علماء اور ائمہ مساجد ان کے اور ان کے والد بزرگوار کے شاگرد تھے اس لیے مولانا عبدالرحیم سے بڑھ کر کوئی شخص اس فریضہ کو خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر فرنگی حکومت نے مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کو اپنے گھر میں نظر بند کر دیا، تاہم کسی نہ کسی طرح سے وہ پولیس کی نظر سے بچتے بچاتے علاقہ آزاد مہمند میں پہنچ گئے۔

فرنگی کا سازشی ذہن ہمیشہ نئے نئے منصوبے بناتا رہتا ہے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں اس نے ایک اور فتنے کو ہوا دی اور افغانستان کے مجاہد پیشہ حکمران غازی امان اللہ خان کے خلاف کفر کے فتووں کا طوفان کھڑا کر دیا۔ زر پرست علماء نے فتوے جاری کر دیے کہ امیر امان اللہ خان اسلام کی بجائے دوسرے طور طریقوں کو رواج دے رہا ہے۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اس موقع پر علماء اور قومی کارکنوں کا ایک وفد لے کر افغانستان گئے کہ حقیقتِ حال سے آگاہی حاصل کریں، وہ آزاد قبائل اور افغانستان کے سرکردہ علماء سے بھی ملے اور حالات کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد پشاور واپس آئے اور امان اللہ خان کے خلاف انگریز کے پروپیگنڈے کا پردہ چاک کر دیا۔ اس طرح لوگوں کے ذہنوں سے غازی امان اللہ خان کے خلاف شکوک و شبہات دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔

صوبہ سرحد کے عوام اب بیدار ہو چکے تھے اور وہ اپنے جائز مطالبات کے حق میں آئے دن مظاہرے کر رہے تھے، اسی سلسلے میں عوام نے سول نافرمانی کا پروگرام بنایا، ہر روز جلوس نکلتے تھے جو بدیسی مال بیچنے والی دکانوں، قحبہ خانوں اور شراب خانوں پر پکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۳۰ء کو حکومت نے بہت سے سرکردہ خلافتی اور کانگرسی رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تاہم کچھ رہنماؤں نے رات کو گرفتاری نہ دی، صبح جب ان رہنماؤں کو بازار کلاں سے گرفتار کر کے کابلی تھانہ لے جایا جا رہا تھا تو عوام کا بہت بڑا ہجوم ان کے ساتھ ہو لیا۔ خلافت کمیٹی کے صدر آغا سید لال بادشاہ بخاری جلوس کے قائد تھے۔ جب یہ جلوس قصہ خوانی میں پہنچا تو گورا فوج نے جو وہاں مورچے سنبھالے ہوئے تھی نہتے عوام پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ سینکڑوں مظاہرین شہید اور زخمی ہوئے اور سخت اشتعال پھیل گیا۔ اسی سلسلے میں مولانا عبدالرحیم کو بھی گرفتار کر کے گجرات سیاسی جیل میں ڈال دیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں گاندھی اردن سمجھوتے کے نتیجہ میں دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ مولانا عبدالرحیم بھی رہا کر دیے گئے لیکن وہ چین سے بیٹھنے والے کہاں تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد انھوں نے ایک جلسہ میں سخت باغیانہ تقریر کی اور فرنگی کے ظالمانہ قوانین اور صوبہ سرحد کے عوام کی سیاسی محرومیوں اور حق تلفیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اس تقریر کی پاداش میں انھیں تین سال تک ہری پور سنٹرل جیل میں قید کر دیا گیا۔

۱۹۳۴ء میں قید سے رہائی پا کر گھر پہنچے تو انھیں پشاور کی میونسپل حدود میں نظربند کر دیا گیا، اب آپ یوں تو پشاور سے باہر نہیں جا سکتے تھے اس لیے آپ نے حکومت کو نوٹس دیا کہ وہ بیت اللہ شریف کے حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پہلے تو حکومت اس پر راضی نہ ہوئی لیکن جب مولانا نے سرکاری قیود توڑنے کی دھمکی دی تو انھیں حج پر جانے کی اجازت مل گئی۔ دو سال تک مولانا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی ایک حق پرست رہنما اور شاہ ولی اللہ کے مسلک کے پیروکار تھے۔ وہ معاشرتی عدل اور مسلمانوں کی اقتصادی خوشحالی کو بھی آزادی کی لازمی شرائط سمجھتے تھے اور ایک ایسے سچے اسلامی معاشرے کے قیام کے داعی تھے جہاں کوئی فرد یا کوئی طبقہ دوسرے کا استحصال نہ کر سکے۔ حج بیت اللہ سے واپس آئے تو انھوں نے پھر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کام شروع کر دیا۔

اس دوران ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ نافذ ہو چکا تھا۔ صوبہ سرحد میں پہلی بار عام انتخابات ہوئے تھے جس کے نتیجے میں پہلے صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے اور پھر کانگرس نے صوبائی وزارت بنائی تھی۔ کانگرس کے دعوے تو یہ تھے کہ وہ مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے حقوق کی محافظ ہے لیکن اب حکومت ملی تو اس نے یہ سارے دعوے بھلا دیے۔ غلہ ڈھیر نزد مردان میں عرصہ دراز سے مزارعین نواب آف طورو کی اراضی پر مزارعین تھے۔ کانگرس نے نواب صاحب کی ایماء پر مزارعین کو زمینوں سے بے دخلی کے نوٹس دے دیے۔ اس پر غریب مزارعین نے تحریک شروع کر دی۔ مولانا عبدالرحیم نے کھل کر مزارعین کا ساتھ دیا۔ انھیں گرفتار کر کے ایک سال قید کی سزا سنا دی، تاہم کسانوں کی غلہ ڈھیر تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کی بڑی رسوائی ہوئی۔

۱۹۳۸ء میں مولانا پوپلزئی قید خانے سے نکلے تو کھل کر مزدوروں، کسانوں اور مزارعین کے حقوق کی جنگ لڑنے لگے۔ ہزارہ میں جاگیردار اور نواب غریب کسانوں کے حقوق پامال کر رہے تھے۔ مولانا نے ان مظلوموں کو منظم کیا اور ۱۹۳۹ء میں

پہلی ہزارہ کسان کانفرنس منعقد کی۔ بالآخر مولانا ان لوگوں کو ان کے جائز حقوق دلوانے میں کامیاب ہو کر رہے۔

۱۹۳۹ء میں فرنگی سامراجیت وزیرستان کے قبائل کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹینکوں اور توپ خانے سے اہل وزیرستان کا محاصرہ کر لیا، قبائل نے اس جارحانہ کارروائی پر مزاحمت کی تو پہلی مرتبہ غریب اور نہتے عوام پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی گئی۔ اس ظالمانہ کارروائی پر مولانا کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ بنوں پہنچے، جلسے منعقد کیے اور وہ دھواں دھار تقریریں کیں کہ انگریز لرز اٹھا۔ اس اعلائے کلمۃ الحق پر مولانا عبدالرحیم پوپل زئی کو پانچ سال کی قید سنائی گئی۔ قید بھی قید بامشقت تھی۔ کہاں ایک ذی احترام مذہبی رہنما اور کہاں چکی اور بیڑی — جب مولانا کی صحت جواب دینے لگی تو تین سال کے بعد انھیں رہا کر دیا گیا لیکن اس حال میں کہ انھیں پلورسی کی شدید بیماری لاحق تھی — اس کے ساتھ ہی دردِ گردہ نے بے حال کیے رکھا بالآخر یہ مردِ مجاہد اور عالم باعمل بدھ۔ ۱۳ مئی ۱۹۴۳ء کو اپنے اللہ سے جا ملا۔

مولانا کی قربانیاں رنگ لائیں، ان کی احتجاجی تقریروں کی گونج لندن کے ایوانوں تک پہنچی اور خود برطانوی پارلیمان میں حزبِ اختلاف کے ارکان نے وزیرستان کے نہتے عوام پر ہوائی جہازوں سے گولیاں برسانے اور بمباری کرنے پر حکومت ہند کی شدید مذمت کی، جس پر انگریز فوجیوں کو یہ ظالمانہ کارروائی بند کرتے ہی بن پڑی۔

"تذکرہ علماء و مشائخ سرحد" کے فاضل مؤلف علامہ سید محمد امیر شاہ قادری کا کہنا ہے کہ جہاں حضرت مولانا عبدالرحیم سیاست کے میدان میں ہر ظلم و جور کے خلاف ایک بہادر اور نڈر انقلابی مجاہد کی طرح سینہ سپر رہتے وہیں علم و عرفان

کی محفلوں میں اُن کے ارشادات دلوں کو نورِ ایمانی بھی بخشتے —— ان کی قیام گاہ (محلہ گاڈی خانہ) پر سارا سارا دن درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ دُور دُور سے آئے ہوئے طلباء ہجوم کیے رہتے۔ کوئی فقہ کی کتابیں پڑھتا، کوئی اصولِ فقہ سے آگہی حاصل کرتا۔ کوئی تصوف کا مطالعہ کرتا کوئی اخلاق کا —— کوئی منطق کا سبق لیتا تو کوئی فلسفہ کا، سارا دن علم و عرفان کا چشمہ جاری رہتا۔ مشکل سے مشکل مسئلہ پر کوئی فتویٰ طلب کرتا تو آپ قلم برداشتہ اس کا جواب لکھ دیتے اور جواب بھی ایسا کہ اس پر بڑے بڑے علماء عش عش کر اٹھتے —— وعظ فرماتے تو حکمت و موعظت کے موتی بکھرتے۔ آپ نے انہی اوصاف کی بناء پر سارے صوبہ سرحد اور ملحقہ قبائلی علاقوں میں انھیں مفتیٔ اعظم تسلیم کیا گیا —— صوبہ سرحد اور افغانستان کی ہر قابلِ ذکر جگہ میں آپ کے شاگرد موجود ہیں۔"

پھر مولانا عبدالرحیم پوپل زئی صرف اہلِ علم ہی نہ تھے اہلِ دل بھی تھے۔ تصوف میں وہ مجاہد کبیر حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب سے فیض یافتہ تھے۔ اسی لیے اپنے مجاہد پیر بھائی حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت متاثر تھے۔

حضرت مولانا پوپل زئی کے شاعرانہ محاسن کے اعتراف میں نامور شاعر جناب خاطر غزنوی کا کہنا ہے کہ "مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت گفتار اور کردار کی ہم آہنگی ہے۔ ان کے کلام میں خلوص اور صداقت ہے۔ حقیقت پسندی ہے، بے باکی اور جرأت ہے۔ اس کے ساتھ انھیں فنّی قدروں اور تقاضوں سے بھی آگہی ہے۔ زبان و بیان دونوں میں ان کی امتیازی شان ہے۔ جدّت اور انفرادیت ہے۔ ان کی شاعری میں پیغام ہے ——

اسی لیے ان کے شعر ذہنوں کو جھنجوڑتے اور متاثر کرتے ہیں۔ وہ صاحبِ طرز شاعر ہیں — اپنے کسی ہمعصر سے ان کا کلام ممیز نظر آتا ہے — مولانا اپنے عہد کے مجتہد تھے — ان کی زندگی کے کئی رخ تھے۔ کبھی عالمِ دین کی حیثیت سے منبر پر جلوہ افروز ہوتے۔ کبھی سیاسی راہنما کے رُوپ میں ظاہر ہوتے۔ کبھی کسی جلسے میں صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں تو کبھی خاکروبوں کے جلوس کی قیادت کر رہے ہیں۔ کبھی ذکر و فکر کا حلقہ ہے تو کبھی قید خانے کی کال کوٹھڑی۔ اتنی گوناگوں صفات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔"

غازی عبدالقیوم شہید

مسلمان ہر قسم کے مصائب برداشت کر سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے مکان کو نذرِ آتش کیا جائے تو خاموش رہ سکتا ہے، اس کی اولاد کو ذبح کیا جائے تو وہ اسے اللہ کی رضا سمجھ کر صدمے کو سہہ لیتا ہے۔ ہر قسم کے تشدد، آلام، بربادی، ویرانی اور تباہی پر چپ رہ سکتا ہے لیکن جب کوئی زبان دراز اس کے آقا و مولا، خاتم النبیین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو وہ ہرگز ہرگز برداشت سے کام نہیں لے سکتا۔

گاندھی جی اور ہندو رہنماؤں نے تحریک خلافت ہی کے سٹیج سے قومی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا۔ یہ لوگ خلافت فنڈ ہی سے رقم وصول کر کے دورے کرتے، جلسوں میں ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے لیکن جب ان کا مطلب پورا ہو گیا تو بزعمِ خود اکثریت میں ہونے کے بل بوتے پر برصغیر کی مسلم اکثریت پر ظلم ڈھانے لگے۔ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکیں شروع کی گئیں اور اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر رکیک حملے شروع کر دیے، اس پر مسلمانوں کا خون جوش میں آیا۔ دہلی میں غازی عبدالرشید جیسے دبلے پتلے لیکن ایمان کے مضبوط مجاہد نے سوامی شردھانند کو ٹھکانے لگا دیا۔ لاہور کے ایک نوجوان عبداللہ نے ایک گستاخِ رسول بھولاناتھ کا صفایا کرنے کی کوشش کی۔ وہ خود تو بچ گیا لیکن

اس کا ملازم سامنے آیا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ــــ اسی طرح غازی علم الدین الدین نے شاتم رسول مہاشہ راجپال کو خون میں نہلا دیا۔ کراچی میں یہ سعادت ہزارہ کے مرد مجاہد غازی عبدالقیوم کی قسمت میں لکھی گئی۔

یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔ کراچی ان دنوں ایک چھوٹا سا بارونق ساحلی شہر تھا۔ صوبہ سرحد اور پنجاب کے اکثر نوجوان محنت مزدوری کر کے رزق حلال کمانے وہاں جایا کرتے تھے۔ انہی ہزاروں میں سے ایک غازی ضلع ہزارہ (حال ایبٹ آباد) کا رہنے والا عبدالقیوم بھی تھا۔ وہ دن بھر وکٹوریہ گاڑی چلاتا اور شام کو اپنے چند محنت کش ساتھیوں کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں پڑ کر سو رہتا۔

وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا تاہم سیاسی اور قومی امور کا گہرا شعور رکھتا تھا۔ دین دار مسلمان تھا۔ نماز روزے کا پابند اور انتہائی کم گو۔ ایک دن اس کی گاڑی میں کچھ سواریاں بیٹھیں اور اسے کچہری جانے کو کہا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے رہے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی ہندو نے کوئی کتاب لکھ کر پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کی ہے۔ عبدالقیوم تو یہ سے سنتا رہا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ کوئی انسان اتنا گرا ہوا بھی ہو سکتا ہے جو فخر نوع انسان، باعثِ تخلیق کون و مکان، پیغمبر آخر الزماں کی شان میں گستاخی کی جرأت کرے، وہ باتیں سن کر دل ہی دل میں کڑھتا رہا ــــ چند دن بعد وہ جمعہ کی نماز ادا کرنے جونا مارکیٹ کی مسجد کو گیا تو مولوی صاحب کا موضوعِ سخن بھی وہی واقعہ تھا۔ اب اس نے ساری بات کی ٹوہ لگائی۔ ایک دوسرے سے بات پوچھی تو معلوم ہوا کہ آریہ سماج، حیدرآباد سندھ کے سیکرٹری نتھورام نے "تاریخِ اسلام" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں سرورِ دو عالمؐ

کی شان میں بڑی دریدہ دہنی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے اس نام نہاد کتاب کی اشاعت پر احتجاج کیا تو حکومت نے نتھورام کو گرفتار کر کے ایک سال قید اور معمولی جرمانے کی سزا دی۔ ملزم نتھورام نے ماتحت عدالت کے اس فیصلے کے خلاف بڑی عدالت میں اپیل کی جس نے اس کی ضمانت منظور کر لی۔ مسلمانوں نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی تھی جہاں دو انگریز جج اس کی سماعت کر رہے تھے۔

عبدالقیوم کو اب اس مقدمے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر سے یہ بھی پتہ چلا لیا کہ آئندہ پیشی کب ہو گی اور آیا نتھورام خود بھی عدالت میں پیش ہو گا یا نہ؟ —— تاہم بظاہر عبدالقیوم خاموش رہا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی سے بھی اس بات کا ذکر تک نہ کیا

پیشی کا دن آیا تو کمرۂ عدالت ماہرین قانون اور عوام سے بھرا ہوا تھا۔ انہی حاضرین میں عبدالقیوم بھی تھا۔ جونہی نتھورام عدالت میں پہنچا غازی عبدالقیوم نے تیز دھار چاقو نکالا اور نتھورام پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں وار گردن پر پڑے جو اتنے کاری تھے کہ نتھورام وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پولیس والے عبدالقیوم کو پکڑنے کے لیے بڑھے تو اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا —— اس پر قتل کا مقدمہ قائم کیا گیا اور سیشن عدالت سے اسے موت کی سزا سنا دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ جب عدالت کے روبرو عبدالقیوم سے قتل کے محرکات کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے بڑی جرأت سے اس امر کا اعلان کیا کہ

"جب تک ایک بھی کلمہ گو مسلمان زندہ ہے اور اس کے سینے میں ایمان افروز دل موجود ہے، وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی

دریدہ دہن اس کے آقا و مولا کی شان میں گستاخی کرے، یا گستاخی کرے تو پھر زندہ رہے! میں اعلان کرتا ہوں کہ میں نے نتھورام کو قتل کیا ہے، اگر میں اب کے رہا ہو گیا تو اس کے بعد بھی ہر اس شخص کے خلاف جو اہانتِ رسُول کا مرتکب ہو۔ یہی کارروائی عمل میں لاؤں گا اور اسے واصلِ جہنم کر کے رہوں گا۔"

بتایا جاتا ہے کہ مقدمے کی سماعت کے دوران جب جج نے اس سے قتل کی وجہ پوچھی تو عبدالقیوم نے کمرۂ عدالت میں لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا (وہ تصویر انگریز شہنشاہ جارج پنجم کی تھی) اور انگریز جج سے کہا اگر تم اپنے دنیوی آقا جارج پنجم کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تو میں اپنے آقا و مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کو کیسے معاف کر سکتا تھا۔"

جس وقت جسٹس وادیا مہتہ اور نوار کارن جیوری (جو سب کے سب غیر مسلم تھے) اپیل کی سماعت کر رہے تھے تو عدالت کے باہر بیس پچیس ہزار مسلمانوں کا ہجوم اللہ اکبر کے نعرے لگا رہا تھا۔ ججوں نے پھانسی کی سزا بحال رکھی۔ تاہم پھانسی دینے کے وقت کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ ایک رات چپکے سے اسے پھانسی دے دی گئی ایسے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔

جس وقت عبدالقیوم شہید کا جنازہ اٹھا، شہر میں فرقہ وارانہ فضا بڑی کشیدہ تھی، ہندو مالدار بھی تھے اور سازشی بھی۔ جونہی جنازہ لے کر لوگ عیدگاہ کی طرف مڑے ہندوؤں کی طرف سے خشت باری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کراچی کی پُرامن فضا میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ آخر کار حالات پر قابو پانے کے لیے فوج طلب کر لی گئی۔

گورا سپاہیوں نے عیدگاہ کی طرف جانے والی ہر اس سڑک پر اندھا دھند فائرنگ کی جس پر اُسے کوئی مسلمان نظر آیا۔

مشہور صحافی اور قومی کارکن اشرف عطا کا کہنا ہے کہ "کراچی کی پوری تاریخ میں ایسا ہولناک ہندو مسلم فساد پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ شہر میں کرفیو لگنے کے باوجود گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دکانوں اور گوداموں کے تالے توڑے جا رہے تھے۔ "ہندو مہاسبھا" اور "مہابیر دل" کے رضاکاروں کی طرف سے مسلمان بستیوں پر منظم حملے ہورہے تھے۔ اکثر بازاروں سے شعلے اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔"

بعد میں سندھ کے مسلمان لیڈروں میں سے سر عبداللہ ھارون اور اور سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنے اپنے بیانات میں فسادات کی مذمت کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ فائرنگ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے اور مسلمانوں کے نقصانات کی تلافی کی جائے۔ یہاں تک کہ بمبئی لیجیسلیٹو کونسل میں بھی (کہ سندھ ان دنوں الگ صوبہ نہ تھا) اس سانحہ پر گرما گرم بحث ہوئی اور مسلمان ارکان نے حکومت پر واضح کر دیا کہ وہ اپنے مذہب، اپنے پیغمبر اور اپنی مذہبی کتب کی توہین ہرگز ہرگز برداشت نہ کریں گے۔

غازی عبدالقیوم کی شہادت رنگ لائی اور ایک عرصہ تک کسی ہندو کو پھر ایسی دریدہ دہنی کی جرأت نہ ہوئی۔

○

حاجی صاحب ترنگزئی

حضرت حاجی صاحب ترنگ زئیؒ بہت بڑے انقلابی رہنما، بہت بڑے مجاہدِ اسلام، بہت بڑے مصلح قوم اور تحریک احیائے اسلام کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ ان کی وسیع النظری، خلوص، ایثار اور جذبۂ جہاد کو دیکھ کر بجا طور کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان حضرت حاجی صاحبؒ ہی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اگر حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کو ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا داعی کہا جا سکتا ہے تو صوبہ سرحد اور آزاد قبائل میں حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی بلا شبہ غلبۂ اسلام کے لیے کام کرنے والی تمام تحریکوں کے قافلہ سالار تھے۔ وہ قوم کے محسن تھے اور قوم ان کی جتنی بھی قدر کرے کم ہے۔

حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی کا اصل نام فضل واحد تھا، وہ ۱۸۵۸ء میں جناب فضل احد کے ہاں پیدا ہوئے، سادات کا یہ گھرانہ عوام میں بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس لڑی میں بہت سے خدا رسیدہ بزرگ گزرے تھے۔ حاجی صاحب کی والدہ ماجدہ حضرت کاکا صاحب کے گھرانے کی ایک عابدہ اور صالحہ خاتون تھیں۔ حاجی صاحب نے ابتداء ہی سے ایسے پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی، ترنگ زئی پشاور کی تحصیل چارسدہ کا مشہور قصبہ ہے۔ ان دنوں یہ دینی علوم کا مرکز تھا۔ یہاں کے علماء میں سیّد ابو محمد

بڑے ممتاز تھے۔ حاجی صاحب نے ابتدائی کتابیں انھیں سے پڑھیں۔ پھر مزید تعلیم کے لیے پشاور کے نواحی گاؤں تہکال پایاں کے مشہور دینی دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ اس مدرسہ کے مہتمم براہ راست تحریک ولی اللٰہی سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے طلباء کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور فکری تربیت بھی کرتے تھے۔ وہ مشہور سرحدی مجاہد حضرت نجم الدین ہڈہ ملّا صاحب سے بیعت بھی تھے۔ لازماً فضل واحد اپنے شیخ الجامعہ کے خیالات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے ملتِ اسلامیہ کی خدمت کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حاجی صاحب ترنگ زئی اپنے وطن واپس گئے۔ اور زمینداری کرنے لگے، تاہم اپنی خاندانی روایات کے مطابق انھوں نے تبلیغ و ارشاد کو بھی اپنا شعار بنایا اور لوگوں کو اسلامی شعار اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ اس اثناء میں وہ دارالعلوم دیوبند بھی گئے۔ وہاں کے سرحدی طلباء نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کا تعارف شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب سے کرایا۔ نوجوان فضل واحد شیخ الہند کے انقلابی نظریات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے گرویدہ ہو گئے۔ شیخ الہند نے بھی اس نوجوان سرحدی عالم دین کی بڑی قدر افزائی کی۔ باہمی تعلقات میں استواری پیدا ہوئی تو ۱۲۹۴ھ میں حج کے ارادے سے جاتے ہوئے وہ فضلِ واحد کو بھی ساتھ لے گئے۔ اس کاروانِ حج کے قافلہ سالار مولانا رشید احمد گنگوہی تھے اور اس میں دوسرے بزرگوں کے علاوہ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی شامل تھے۔ جب یہ قافلہ مکہ معظمہ پہنچا تو فضلِ واحد صاحب کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے دیدار کی نعمت بھی میسّر آئی اور انھوں نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد بھی کی۔

وطن واپسی پر حاجی صاحب ترنگ زئی نے راولپنڈی حضرت بری شاہ لطیفؒ

کے مزار پر بھی حاضری دی، اپنے وطن میں فضل واحد صاحب کو ان کے علم وفضل اور زہد و پارسائی کی بدولت بڑی قدر و منزلت حاصل تھی، اب حج کی سعادت سے مشرف ہونے کے بعد لوگ اور بھی آپ کے گرویدہ ہو گئے اور انھیں حاجی صاحب ترنگ زئی کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ظاہری علوم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ صفائی باطن کی خاطر حاجی صاحب ترنگ زئی نے مشہور مجاہد اور نامور عالم دین حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب کے ہاتھ پر طریقۂ قادریہ میں بیعت کی۔ ہڈہ ملا صاحب حضرت اخون صاحب سوات کے خلیفہ اور ماذون تھے۔ وہ نہ صرف تصوف کے اسرار و رموز سے آگاہ اور دلوں کی بیماری اور کجی کو دور کرنے کا طریقہ جانتے تھے بلکہ فرنگی حکومت کے خلاف جہاد بالسیف میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ بہت سے معرکوں میں انھوں نے فرنگی حکومت کو زبردست نقصان پہنچایا اور بڑا نام پیدا کیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ کی نصرانی طاقتوں نے یونان کو ترکی سے بھڑا دیا اور خلافت اسلامیہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا تو صوبہ سرحد، افغانستان اور ہندوستان ہر جگہ کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات بڑے مجروح ہوئے۔ دنیا بھر میں اس کا ردِ عمل دیکھنے میں آیا۔ برصغیر کے دوسرے مقامات پر جلسوں، جلوسوں اور احتجاجی ہڑتالوں میں تیزی آگئی تو صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں چترال سے وزیرستان تک کے غیور قبائل انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت پر آمادہ آئے۔

۱۸۹۷ء میں ہڈہ ملا صاحب کی قیادت میں مالاکنڈ، چکدرہ اور دوسری چھاؤنیوں پر حملے شروع ہوئے تو حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی نے بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس جہاد میں عملی حصہ لیا۔ مالاکنڈ، بٹ خیلہ، پیر کلی اور چکدرہ

کے محاذوں پر انھوں نے دشمن سے ٹکر لی۔ بعد میں جنگ کے شعلے باجوڑ اور علاقہ مہمند تک پھیل گئے تو بھی حاجی صاحب ترنگ زئی اور ان کے غازیوں نے نہایت پامردی سے فرنگی لشکروں کا مقابلہ کیا۔

اس جہاد کے دوران حاجی صاحبؒ کو ہڈہ ملا صاحب کا فیضانِ صحبت پانے کا موقع ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ عالیہ قادریہ کے بزرگوں نے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ میں تحریک جہاد کو زندہ رکھنے کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ حاجی صاحب بھی ان قربانیوں میں شریک تھے۔ ۱۹۰۲ء میں ہڈہ ملا صاحب جنت کو سدھارے تو حاجی صاحب ترنگ زئی نے ان کے خلیفہ اور ماذون مولانا محمد عالم المعروف صوفی عالم گل کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ صوفی عالم گلؒ نے حاجی صاحب ترنگ زئی کی صلاحیتوں اور جذبۂ اسلامی سے متاثر ہو کر انھیں اپنی تلوار اور اپنی دستار مرحمت فرمائی اور انھیں اپنا خلیفہ مجاز قرار دیا۔

۱۹۰۸ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی دوبارہ حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے، واپسی پر انھوں نے امر بالمعروف کو اپنایا۔ وہ اپنے مریدوں کے ہمراہ قریہ قریہ، بستی بستی جاتے اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات اور شعار کے عین مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے۔ ان دنوں پختون معاشرے میں بہت سی فضول رسمیں مروج تھیں۔ لوگ شادی بیاہ اور ختنے کی رسوم بڑی دھوم دھام سے مناتے۔ ان پر گانے بجانے کا اہتمام کیا جاتا اور اندھا دھند دولت لٹائی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دیہاتی آبادی کی اکثریت ہندو مہاجنوں کی مقروض تھی۔ ہندو سیٹھ سود در سود کا چکر اس انداز میں چلاتے کہ ساری عمر مقروض مسلمان ان کے چنگل سے نہ نکل سکتے تھے۔ حاجی صاحب لوگوں سے عہد لیتے کہ وہ ان فضولیات سے بچیں گے اور اسلامی سادگی اختیار کریں گے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ حاجی صاحب

کے سامنے شادیاں انجام پاتیں۔ وہ مسجد میں بیٹھ کر نکاح پڑھاتے اور انتہائی سادگی سے دلہن کو ڈولی میں بٹھا کر سسرال بھیج دیتے۔

اس کے ساتھ ہی حاجی صاحب لوگوں کو مقدمہ بازی سے بچنے کی نصیحت کرتے، وہ عوام پر زور دیتے کہ اپنے تنازعات اپنے ہی قومی جرگوں میں شرع محمدی کے مطابق طے کریں اور فرنگی کے تھانہ کچہری کے چکر میں نہ پڑیں۔ حاجی صاحب کی کوششوں سے سارے علاقے میں ایک خوشگوار اسلامی ماحول پیدا ہو گیا، لوگ دین سے محبت کرنے لگے اور ان کے دل فرنگی حکمرانوں سے کھٹے ہو گئے۔

عوام میں ذہنی بیداری پیدا کیے بغیر کوئی انقلاب جنم نہیں لے سکتا۔ حاجی صاحب جانتے تھے کہ تعلیم ہی تمام معاشرتی ترقیوں کا زینہ ہے، تاہم ان پر یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ فرنگی کا نظامِ تعلیم صرف غلامانہ ذہن پیدا کرتا ہے، اس لیے انھوں نے اپنے حلقۂ اثر میں آزاد قومی مدرسے قائم کرنے شروع کر دیے۔ ان کی یہ تعلیمی تحریک بڑی کامیاب رہی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پشاور، ہشت نگر اور مردان کے علاقوں میں مختلف مقامات پر پچاس آزاد قومی مدرسے قائم ہو گئے جبکہ گدر ضلع مردان میں ایک مرکزی دار العلوم بھی کام کرنے لگا۔

اگرچہ بظاہر حاجی صاحب کی یہ سرگرمیاں قطعاً غیر سیاسی تھیں تاہم قوم میں ذہنی بیداری پیدا کرنا اور افرادِ قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دینا انگریز کی نگاہ میں کوئی کم جرم نہ تھا۔ ان خدمات کی پاداش میں انھیں گرفتار کیا گیا، ان پر مقدمہ چلایا گیا جب ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملا تو انھیں رہا کر دیا گیا لیکن ان کے رفقاء کو تین تین سال کے لیے قید کر دیا گیا ـــــ قومی خدمت کے سلسلے میں انھیں بڑی کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑا،

تاہم انھوں نے ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

حاجی صاحب ترنگ زئی کا مشن جاری رہا، تعلیمی میدان میں ان کی سرگرمیوں کی بڑی قدر ہوئی۔ ان کے ساتھیوں میں خان عبدالغفار خان، مولانا سیف الرحمٰن (متھرا) مولانا شاہ رسول خان برے گڑھی، مولانا قاری محمد ادریس یا نڈہ ملاحان، قاضی صاحب کرڈوی، مولانا میراجان (زیارت کاکا صاحب) مولوی عبدالعزیز (اتمان زئی) مولانا تاج الدین بی۔ اے (مردان) مولانا شاکر اللہ (اتمان زئی) مولانا قاری عبدالمستعان (اکبر پورہ) اور مولانا سیّد زمان شاہ (لاہور تحصیل صوابی) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت انگریزی نظامِ تعلیم کو ناپسند کرتی تھی اور اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں میں بھیجنے کے لیے تیار نہ ہوتی تھی، تاہم قوم کا ذہین طبقہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتا تھا کہ جدید تعلیم کو اپنائے بغیر آج کے سائنسی دور میں ترقی ناممکن ہے۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے جب ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج پشاور کے قیام کا اہتمام کیا تو عمداً اس کا نام "دارالعلوم اسلامیہ" رکھا اور اس کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے بھی حاجی صاحب ترنگزئی کا انتخاب کیا۔ صاحبزادہ صاحب کا خیال بجا تھا کہ حاجی صاحب کے احترام کے پیشِ نظر کوئی بھی کالج کے قیام کی مخالفت نہ کر سکے گا۔ چیف کمشنر سر روس کیپل کو بھی اس امر کا اعتراف تھا کہ "حاجی صاحب بے حد زیرک اور معتدل مزاج شخص تھے"۔۔۔۔ ایک اور موقع پر روس کیپل نے واضح الفاظ میں کہا: "ان دنوں سرحد اور قبائلی علاقوں میں حاجی صاحب ہی مسلمانوں کے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد اور ہر دلعزیز رہنما ہیں"۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور کالج کی انتظامیہ حاجی ترنگ زئی کو کالج

کا سنگِ بنیاد رکھنے کی دعوت دیتے خائف تھے کہ وہ کہیں انکار ہی نہ کر دیں، اس پر فیصلہ کیا گیا کہ سب سے پہلے کالج کی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا جائے (اس مسجد کے اخراجات پشاور کے مشہور مخیر حاجی کریم بخش سیٹھی نے برداشت کیے تھے) حاجی صاحب مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے سے انکار کیسے کرتے؟ ——

بالآخر ۱۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور سردار محمد اسلم خان نے چونے کا لگن اٹھا رکھا تھا، حاجی صاحب نے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے پہلی اینٹ مقررہ جگہ پر لگائی۔ پھر دوسرے معززین نے بھی ایک ایک اینٹ لگائی اور یوں صوبہ سرحد میں پہلے اسلامیہ کالج کا قیام حاجی صاحب ترنگ زئی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

اصل میں اسلامیہ کالج پشاور کے قیام سے انگریز کا اصل مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دیا جائے کہ ایک ہی تعلیمی مرکز میں جمع ہونے سے مسلمانانِ ہند اتحاد و یک جہتی پیدا ہونے کا امکان تھا، جس سے انگریز بہت خائف تھا۔ فرنگی کا ارادہ یہ تھا کہ اہلِ سرحد دوسرے علاقوں کے مسلمانوں سے الگ تھلگ ہی رہیں۔ حکومت نے اتنے بھاری اخراجات بھی اسی لیے اپنے سر لیے کہ قبائلی نوجوانوں کے ذہنوں میں حسبِ مطلب تبدیلی لائی جائے۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) شروع ہوتے ہی حالات نے کروٹ لی۔ ترکی پر انگریز کا حملہ اصل میں خلافتِ اسلامیہ پر حملہ تھا کہ سلطان ترکی ان دنوں خلیفۃ المسلمین تھا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں میں انگریز کے اس اقدام سے بڑا اضطراب پھیل گیا۔ برصغیر کے مسلمان علماء آگے بڑھے اور انھوں نے "تحریک حزب اللہ" اور "تحریک ریشمی رومال" کے تحت فرنگی کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ ۱۹۱۴ء میں دہلی کی مسجد فتح پوری میں ایک خفیہ اجلاس ہوا، اس کے فیصلے کی رو سے

تحریک حزب اللہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک شعبہ عملی جہاد کا تھا جب کہ دوسرا تبلیغ و اشاعت اسلام کا۔ مولانا محمود الحسن اور دوسرے زعماء کی تجویز پر اس سلسلے میں حاجی صاحب ترنگ زئی کو "امیر المجاہدین" مقرر کیا گیا۔

تحریک حزب اللہ کا منصوبہ تھا کہ ترک فوجیں افغانستان کی راہ قبائلی علاقے کے مختلف مقامات پر پہنچیں اور وہاں سے قبائلی مجاہدین اسلام کے ساتھ مل کر برصغیر کے مختلف شہروں پر حملہ آور ہوں، مقصد یہ تھا کہ جنگ کی صورت حال پیدا ہونے پر انگریز ہندوستان کی فوجیں ترکوں کے خلاف بھجوا نے نہ پائے اور انگریزوں کو ہر محاذ پر نیچا دکھانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ افغانستان کا حکمران امیر حبیب اللہ خان در پردہ انگریز سے معاہدہ کر چکا تھا کہ وہ فرنگی کی کسی مخالف طاقت کو افغانستان میں داخل نہ ہونے دے گا تاہم آخر تک اس نے مجاہدین کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھا کہ وہ سلطان ترکی کا وفادار اور خیر خواہ ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی ہدایت پر مولانا ابو الکلام آزاد پشاور کے دورے پر آئے۔ انھوں نے اس مسئلہ پہ عوام سے خطاب کیا اور انھیں خلافت اسلامیہ کے تحفظ کے لیے میدان جہاد میں نکلنے کی تلقین کی، جس کے نتیجے میں بہت سے مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد بھی کی۔

۱۲ر جون ۱۹۱۵ء کو حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی پشاور آئے اور حکیم محمد اسلم سنجری کے مکان پر تحریک حزب اللہ کے ارکان کو ہدایات دیں۔ ۱۸ر جون کو ترنگ زئی میں ان کی اہلیہ کا چہلم تھا۔ ان کے ارادت مند دور و نزدیک سے تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ دن بھر حاجی صاحبؒ ترنگ زئی مہمانوں کی خدمت میں مصروف رہے۔ ہر کارکن کو ہدایات دیتے رہے۔ انھیں کسی ذریعہ

سے پتہ چل گیا کہ حکومتِ سرحد کی طرف سے ان کے وارنٹ گرفتاری ۱۵ر جون کو جاری ہو چکے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی گرفتاری کی صورت میں تحریکِ جہاد ناکام ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے آدھی رات کو جب سب لوگ سو رہے تھے وہ اپنے صاحبزادوں اور چند انتہائی مخلص ساتھیوں کے ہمراہ ترنگ زئی سے نکل کر علاقہ آزاد مہمند کو روانہ ہو گئے۔

صبح جب حکومت کو خبر ملی کہ حاجی صاحب ترنگ زئی قبائلی علاقہ کو ہجرت کر گئے ہیں تو سبھی افسر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک نہایت ذمہ دار حاکم نے خبر سنی تو کہا:

"حاجی صاحب ترنگ زئی کا ہمارے ہاتھ سے نکل جانا ہندوستان میں ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے۔"

آزاد قبائلی علاقے میں پہنچتے ہی حاجی صاحب ترنگ زئی نے چمرقند کے مجاہدین سے مل کر نواحی علاقوں میں انگریزوں کی فوجی چوکیوں پر چھاپے مارنے کا سلسلہ تیز تر کر دیا۔ مجاہدین کے امیر نعمت اللہ ان چھاپوں میں حاجی صاحب کے شانہ بشانہ رہتے۔ اگست ۱۹۱۵ء میں انھوں نے رستم ضلع مردان کے انگریزی کیمپ پر شبخون مارا جس کے نتیجے میں بہت سے انگریز افسر ہلاک اور زخمی ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انھیں سو کہ ڈولیوں میں ڈال کر علاج کے لیے مردان بھیجا گیا۔

رستم کیمپ پر بار بار کے چھاپوں میں بقول مولانا غلام رسول انگریزوں کے چھ سو آدمی قتل اور زخمی ہوئے۔

انگریز کو اب احساس ہوا کہ حاجی صاحب کا ترنگ زئی میں رہنا حکومت کے لیے زیادہ نقصان دہ نہیں تھا لیکن قبائلی علاقے میں ان کا پہنچ جانا اور تحریکِ جہاد

کی قیادت کرنا ان کے لیے خطرے کا باعث ہوگا تو انھوں نے پشاور کے سرکردہ خوانین کا ایک وفد حاجی صاحب کو واپس لانے کے لیے علاقہ مہمند میں بھیجا لیکن حاجی صاحب نے نہ واپس آنا تھا نہ آئے اور خلافِ حکومت سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ اس پر روس کیپل اور اس کے ساتھیوں کو بڑی پشیمانی ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۵ء کے آخر میں حاجی صاحب نے لوگوں سے جہاد میں شمولیت کی اپیل کی، اس پر نہ صرف ضلع پشاور اور قبائلی علاقے کے مجاہد ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے بلکہ افغانستان سے بھی بہت سے لوگ ان کے پاس پہنچ گئے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں حاجی صاحبؒ کے غازی باجوڑ اور مہمند میں جمع ہوئے تو انگریز نے خطرے کو بھانپ کر قلعہ شبقدر کے ارد گرد حفاظتی تدابیر سخت کر دیں۔ مچنی کے پُل سے ابازئی کے پل تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حفاظتی برج تعمیر کیے۔ سترہ میل لمبی سرحد پر خار دار فولادی تار لگا کر اس میں برقی رَو چھوڑ دی کہ کوئی قریب آنے کی جرأت نہ کرے لیکن جذبۂ جہاد نہ کبھی دبا ہے نہ دبے گا۔ حاجی صاحب نے کسی خطرے کو خاطر میں نہ لا کر چھ ہزار مجاہدوں کے ساتھ قلعہ شبقدر پر حملہ کر دیا۔ فرنگیوں کو اتنی جرأت تو نہ ہوئی کہ غازیوں کے اس لشکر کو روکتے البتہ جواب میں انھوں نے ہوائی جہازوں سے سخت بمباری کی اور رسالہ اور توپ خانہ سامنے لائے، مجاہدوں نے جان پر کھیل کر انگریزی لشکر کا مقابلہ کیا اور قریب قریب ان کے سارے رسالہ کو تہس نہس کر دیا۔ غازیوں میں سے دوا جان خوگا خیل، جان خان، غلام جان، شیر علی خان، سید میراں، میاں خان اور حضرت خان عیسٰی خیل نے کمال شجاعت کا مظاہرہ کیا اور سب نے لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کیا۔ دوا جان کا نام تو مہمندوں کی تاریخ میں ضرب المثل بن کر رہ گیا۔ اس نے تاک کر ایک انگریز افسر پر حملہ کیا اور اسے گھوڑے سے گرا

دیا لیکن انگریز افسر نے مرتے مرتے ریوالور نکالا اور دواجان پر فائر کر دیا۔ دونوں ایک ہی جگہ گرے اور جان دے دی۔

۱۹۲۳ء میں انگریز نے ایک بار پھر علاقہ مہمند پر فوج کشی کی لیکن اس دفعہ جنگ نے طوالت اختیار نہ کی اور جلد ہی فریقین میں ایک معاہدہ طے پا گیا۔

حاجی صاحب ترنگ زئی پہلے عارضی طور پر ادھر ادھر قیام پذیر رہے، سوات، دیر، بونیر کے سرکردہ لوگ مصلحت بین تھے اس لیے انگریز کے منہ آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بالآخر انھوں نے متعلقہ قبائل سے تحریری معاہدہ لے کر سور کمر (سرخ پہاڑ) نامی ایک مقام کو اپنی مستقل رہائش کے لیے پسند کیا۔ اس مقام پر ایک عرصہ سے گڈ ملّا نامی درویش ایک وسیع مسجد بنا رہا تھا، لوگ مسجد کو دیکھتے اور تعجب کرتے کہ یہاں تو عیدین اور جمعہ پر بھی دس بارہ سے زیادہ آدمی جمع نہیں ہوتے۔ یہاں اتنی وسیع مسجد کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر گڈ ملّا مسکرا کر کہتے۔ "اس مسجد کو اللہ تعالیٰ ایک عظیم انسان عطا کرے گا جس کی وجہ سے نمازیوں کا اس قدر ہجوم ہوگا کہ یہ مسجد بھی ناکافی ہوگی۔" بعد میں گڈ ملّا صاحب کے الفاظ بجا ثابت ہو کر رہے۔

بتایا جاتا ہے کہ حاجی صاحبؒ نے سور کمر کو "غازی آباد" کا نام دے کر سکونت اختیار کی تو وہاں پانی کی بڑی قلت تھی۔ ایک چھوٹا سا چشمہ تھا جس کے پانی سے دس پندرہ افراد بھی بمشکل تمام وضو کر سکتے تھے۔ ایک دن علی الصبح، حاجی صاحب نمازیوں کو ساتھ لے کر وہاں گئے اور گڑگڑا کر اللہ سے دعا کرتے رہے۔ اللہ نے اس چشمہ کو اتنی برکت دی کہ اب اس پر چار پن چکیاں کام کر رہی ہیں اور تین چار مربع میل زمین اس پانی سے سیراب ہو رہی ہے۔

۱۹۲۶ء میں انگریز نے علاقہ مہمند میں سڑکوں کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تاکہ وقت پڑنے پر ان سے فوجی نقل و حرکت میں آسانی ہو، اس پر ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں پھر غزاء

کا موقع آیا۔ انتہائی طاقتور ہونے کے باوجود انگریز حاجی صاحب کے لشکر کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے۔ ان معرکوں میں مشہور مجاہد فقیر صاحب النگار نے بھی بطلِ جلیل حاجی صاحب ترنگ زئی کا ساتھ دیا۔

۱۹۲۸ء میں کسی عارضہ کی وجہ سے حضرت حاجی صاحب کی ٹانگ میں کوئی تکلیف پیدا ہو گئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تاہم وہ چارپائی پر بیٹھ جاتے اور لوگ انہیں اٹھا کر لے جاتے۔ اس معذوری کے باوجود وہ ہر معرکہ میں پہنچتے اور مجاہدین کی قیادت کرتے۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ہجرت کے دوران بھی حاجی صاحب ترنگ زئی کی کوششیں بڑی بارآور ثابت ہوئیں۔ جو لوگ انگریزوں کے مظالم سے تنگ آ جاتے یا جن پر بلاوجہ مقدمے قائم کر دیے جاتے وہ حاجی آباد میں حضرت حاجی صاحب کے پاس چلے جاتے اور امن و سلامتی سے رہتے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان قبائلی مجاہدین کے لیے نقدی اور اسلحہ کی صورت میں جو کچھ بھیجتے وہ بھی حاجی صاحب ہی کی وساطت سے غازیوں کو ملتا۔ گویا حاجی صاحب کی قیامگاہ مجاہدینِ آزادی کا مرکزِ اعلیٰ بھی تھی اور رابطہ کا ایک ذریعہ بھی۔

۱۹۳۰ء میں جب صوبہ سرحد میں تحریک آزادی نے زور پکڑا اور اسے کچلنے کے لیے فرنگی استبدادیت نے نہتے لوگوں پر قصہ خوانی بازار پشاور میں بلا اشتعال اور بے دریغ فائرنگ کی تو قبائلی مجاہدین جوش میں آ گئے۔ مئی ۱۹۳۰ء میں اتمان خیل کا ایک لشکر پہاڑیوں سے اتر کر ہشت نگر کے قصبہ تنگی تک آ پہنچا تو انگریز کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ ہوائی جہازوں سے ان پر بمباری کرے اور غازیوں کی پیش قدمی کو روکے، تاہم مجاہدین نے پیچھے ہٹنے کی بجائے چینددے خوڑ کے ارد گرد مورچے قائم کر لیے اور کافی دنوں تک سرکاری

علاقوں پر شبخون مارنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

جب تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں فرنگی حکومت نے ہشت نگر کے لوگوں کو اندھا دھند گرفتار کرنا شروع کیا تو حاجی صاحب ترنگ زئی اس ظالمانہ کارروائی پر بڑے برہم ہوئے اور انھوں نے مہمندوں کو اذنِ جہاد دے دیا۔ حاجی صاحب کے صاحبزادے حضرت بادشاہ گل صاحب کی کمان میں ہزاروں فدائیوں نے ہشت نگر کا رُخ کیا تو برطانوی اقتدار کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا۔ فوراً ہی فرنگی ہوائی جہازوں نے علاقہ مہمند پر پروازیں شروع کر دیں تاکہ لوگ مرعوب ہو کر منتشر ہو جائیں۔ حلیم زئی کی سرزمین پر اس مضمون کے اشتہار پھینکے گئے کہ جو لوگ حاجی صاحب ترنگ زئی یا رضاکاروں کا ساتھ دیں گے ان کے دیہات پر بمباری کی جائے گی۔ ان دھمکیوں کے باوجود مجاہدین کی پیش قدمی جاری رہی تو سرکاری ہوائی جہازوں نے وادیٔ گندھاب پر بے پناہ بمباری کی۔ یہاں تک کہ مجاہدین کے خوراک کے ذخیرے اور اسلحہ کے گودام بھی تباہ ہو گئے۔

ایک طرف تو انگریز ان فوجی کارروائیوں میں مصروف رہا اور دوسری طرف سیاسی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے زیریں مہمند کے سات سربرآوردہ ملکوں کا وفد (جرگہ) حضرت بادشاہ گل کے پاس بھیجا کہ وہ اس نازک سیاسی موقع پر انگریز کی مخالفت سے باز رہیں۔ ان سب کارروائیوں کے باوجود مہمند مجاہد ۱۳ر جون ۱۹۳۰ء تک مورچوں میں ڈٹے رہے، تاہم ہوائی جہازوں کی مسلسل گولہ باری سے انھیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

فرنگی کی وحشیانہ بمباری سے بھی حاجی صاحب ترنگ زئی کے غازیوں کے حوصلے پست نہ ہوئے اور وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک وقفے وقفے سے سرکاری علاقوں اور فوجی ٹھکانوں پر چھاپے مارتے رہے۔ فریقین میں متعدد جھڑپیں ہوئیں

تاہم چونکہ زیریں مہمند کے قبائل انگریز سے صلح کر چکے تھے، اس لیے مہمند لشکر شبقدر تک نہ پہنچ سکا۔ بالآخر ۱۹۳۵ء میں انگریز نے مہمند مجاہدوں کے خلاف ایک بڑے حملے کا منصوبہ بنایا جس میں تین بریگیڈ فوج حصہ لے رہی تھی اور جس کی کمان میجر جنرل میسپرٹ (MUSPRAT) کی غیر حاضری میں بریگیڈیر (بعد میں کمانڈر ان چیف) آکنلک کے ہاتھ میں تھی۔ اس مہم کے دوران سب سے قابلِ ذکر معرکہ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۵ء کو ہوا۔ اس دن انگریز کی تین بریگیڈ فوج نے درہ نخقی کا محاصرہ توڑنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مہمند چونکہ چھوٹا سا قبیلہ ہے اس کی نفری اتنی نہ تھی کہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکے تاہم انھوں نے ہمت اور عزیمت کا وہ ثبوت دیا جس کی مثال حالیہ حربی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔

پچھلے دنوں میجر جنرل گاف ہملٹن پاکستان آیا تو وہ خاص طور پر علاقہ مہمند کے ان مقامات کو دیکھنے گیا جہاں ۱۹۳۵ء کے اس معرکہ میں ان کی ٹکر مہمند غازیوں سے ہوئی تھی۔ ہملٹن ان دنوں فرانٹیر فورس رجمنٹ کا سیکنڈ لفٹنٹ تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ مہمند مجاہد ایک جگہ گھات لگائے بیٹھے تھے جہاں سے انھوں نے ایسے ٹھیک نشانے لگائے کہ ایک رات میں ۳۵ گورا سپاہی ہلاک اور ساٹھ سے زیادہ زخمی ہو گئے۔ ہملٹن کو اس جنگ میں سلطنت برطانیہ میں شجاعت کا دوسرا بڑا انعام ڈی۔ ایس۔ او دیا گیا تھا۔

انگریز نے اس معرکہ میں ہوائی جہازوں سے بھی کام لیا اور بمباری کر کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیے۔ یہاں تک کہ جن تالابوں سے مجاہدین پانی پیا کرتے تھے ان پر بھی بم پھینکے گئے۔ اس کے باوجود مہمند غازیوں کے جوش و خروش میں کمی نہ آئی۔ حضرت حاجی صاحب معذوری کے باوجود پالکی میں خود محاذِ جنگ پر جاتے تو

انھیں دیکھ کر غازیوں کے حوصلے بہت بڑھ جاتے۔ ۱۹۳۵ء میں مہمندوں نے گائیڈز کے ایک دستے کا صفایا کر دیا۔ خصوصیت سے عثمان خیل قبیلہ نے اس جنگ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ عیسٰی خیل کا ایک سرفروش مغل خان ایک بہت بڑے انگریز افسر کا سر کاٹ لایا۔ مہمندوں کی اس پامردی کو دیکھ کر انگریز بوکھلا اٹھے اور انھوں نے آدمی بھیج کر صلح کی بات چیت کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ صوبہ سرحد کے گورنر نے بھی جرگہ کے ذریعے اختلافات طے کرنے کو بہتر سمجھا۔ بالآخر گندہاب کے مقام پر ایک بہت بڑا نمائندہ جرگہ منعقد ہوا جس میں مہمند قوم کے قریب قریب سبھی سرکردہ معززین نے شرکت کی۔ طویل بات چیت کے بعد آخر کار صلح کی شرائط طے پا گئیں اور فریقین نے اس دستخط کر دیے۔

یہ حاجی فضل واحد صاحب ترنگ زئی کا آخری جہاد تھا۔

انگریز مؤرخ آرتھر سونسن (S. WINSON) نے تسلیم کیا ہے کہ انگریز کو اس مہم سے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا بلکہ مہم میں حصہ لینے والے فوجی افسر بھی حیران تھے کہ یہ منصوبہ کس مقصد کے لیے اور کیوں بنایا گیا؟ — سینکڑوں انگریز افسر اور فوجی برطانوی حکومت کی انا کی صلیب پر چڑھ گئے اور بات جہاں تھی وہیں رہی! — وہ بہرحال یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتا ہے کہ بہرحال سپاہی کا کام تو حکم کی بجا آوری ہے اسے دلائل سے کیا واسطہ؟

ان واقعات سے حضرت حاجی صاحب کے وقار اور ہر دلعزیزی میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو اللہ کا ہو جائے اللہ ضرور اس کی مدد کرتا ہے ۱۹۳۶ء میں حاجی صاحب بیمار پڑھ گئے۔ بیماری نے طول پکڑا تاہم آخر تک وہ عوام سے ملتے ملاتے رہے۔ بالآخر ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو اکیاسی سال کی عمر میں وہ اپنے اللہ کے پاس پہنچ گئے۔

حاجی صاحب نے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے حضرت بادشاہ گل صاحب ان کے جانشین قرار پائے۔

حضرت حاجی صاحب ترنگزئی ایک جامع الحیثیات شخص تھے۔ وہ اسلام کے ہمہ جہتی اور ہمہ گیر احیاء کے داعی تھے۔ وہ علومِ اسلامی کی اشاعت کے علمبردار، معاشرتی اور دینی مصلح، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شیدائی، طریقت و معرفت کے مخزن، مردِ میدانِ جہاد اور سلسلۂ عالیہ قادریہ کے عظیم راہ نما تھے۔ ان کی زندگی سادہ اور پاکیزہ تھی اور وہ اپنے ارادت مندوں کو بھی سادہ، صالح اور باعمل مسلمان کے طور پر زندگی بسر کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔

پاکستان حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی جیسے بزرگانِ ملت کی خوابوں کی تعبیر ہے۔ تحریک پاکستان بھی احیائے اسلام کی داعی تھی۔ اس لیے حاجی صاحب کے عظیم گھرانے اس تحریک کے مقاصد سے کامل یک جہتی کا مظاہرہ کیا۔ حاجی صاحب کے فرزند اور جانشین حضرت بادشاہ گل صوبہ سرحد مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اپریل ۱۹۴۸ء میں قائداعظم محمد علی جناح صوبہ سرحد کے دورے پر آئے تو جناح پارک پشاور کے مرکزی جلسے میں ان کو سپاسنامہ پیش کرنے کا شرف بھی بادشاہ گل صاحب ہی کے حصے میں آیا۔

○

سنڈاکے مُلّا صاحب

وہ فقیر تھا لیکن حکمران بھی اس کے سامنے آتے ہوئے ڈرتے تھے ــــ گدائے گوشہ نشین تھا لیکن "بادشاہ گر" تھا. جسے چاہتا تخت پر بٹھاتا تب جسے چاہتا کرسی سے گرا دیتا ــــ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے سرزمین یوسف زئی میں "ہائی کمانڈ" کا مقام حاصل ہو گیا ۔ لوگ اسے "سنڈاکے ملّاں" کے نام سے جانتے تھے جبکہ اپنی ابتدائی زندگی میں قیام پشاور کے دوران اسے "کوہستانی ملّا" بھی کہا جاتا تھا ۔

سنڈاکے مُلّا صاحب کا اصل نام احمد جان تھا ۔ وہ کوہستان سوات میں دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں سنڈاکے میں پیدا ہوئے ۔ لڑکپن ہی میں اپنے دوسرے ہم عمروں کے ہمراہ تحصیل علم کی خاطر پشاور میں آئے اور تہکال بالا میں رہنے لگے ۔ پشاور کے محلہ ترھ کے مشہور عالم دین مولانا محمد اسرائیل سے ابتدائی دینی کتابیں پڑھیں ۔ طالب علمی ہی کے دوران حجاز مقدس چلے گئے ، وہاں کسی بزرگ نے انھیں "قصیدہ بُردہ" پڑھنے کی اجازت فرمائی ۔ عابد شب زندہ دار تھے اور چلّہ کشی ان کا معمول ۔ بارہ برس تک مدینہ منورہ میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی ۔ ہر سال حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی مشرف ہوتے رہے ۔ پشاور واپس آئے تو قصیدہ بردہ کے عامل کامل تھے ۔

پیشانی سے روشن مستقبل کے آثار ہویدا تھے۔ آتے ہی دوبارہ اپنے استاد مولانا محمد اسرائیل سے سبق پڑھنے لگے۔ مولانا بھی اس جوہر قابل پر دوسرے شاگردوں کی نسبت زیادہ توجہ دینے لگے۔ فقہ کی کتابیں ختم ہوئیں تو سنڈا کئے ملّا افغانستان چلے گئے اور ہڈہ میں حضرت استاد پائندہ محمد سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی۔ اپنے پیر کے حکم پر وہاں بھی چلّہ کشی کرتے رہے۔ پھر اجازت ملنے پر دوبارہ پشاور کا رُخ کیا اور تہکال بالا میں قیام پذیر ہوئے۔ اب ان کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ وہ شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ لوگ دھڑا دھڑ آتے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے، کبھی کبھی وہ ہشت نگر میں حاجی صاحب ترنگ زئی کے ہاں بھی حاضری دیتے —— تہکال بالا میں انھوں نے اپنا مدرسہ جاری کیا اور لنگر کھولا تو اور بھی زیادہ مخلوق ان سے فیض یاب ہونے لگی۔ سینکڑوں نادار اور محتاج ان کے لنگر سے پیٹ بھرتے۔ انگریز حکمرانوں کو ان کی یہ ہر دلعزیزی کھٹکنے لگی، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ سنڈا کے ملّا صاحب کے پاس ان "شاہ خرچیوں" کے لیے دولت کہاں سے آتی ہے، حکومت نے ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگا دی۔ انہی دنوں ایک اور بزرگ "پکلیٹے باباجی" جن کا اصل نام محمد طاہر تھا، تہکال کی مسجد آکا زوہیں آ کر اُترے۔ وہ اعوان شریف (ضلع گجرات) کے مشہور رہنمائے طریقت قاضی سلطان محمود قادری کے خلیفۂ مجاز تھے سنڈا کئے ملّاں بھی وہاں آتے جاتے اور وعظ و نصیحت سے لوگوں کو دین کے سچے راستے پر لانے کی کوشش کرتے۔

جب حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی نے جگہ جگہ آزاد قومی مدرسے قائم کیے تو ان کی تقلید میں سنڈا کئے ملّا نے بھی تہکال میں ایک اسلامی مدرسے کا اہتمام کیا۔ یہ مدرسے اصل میں عوام میں قومی اور سیاسی بیداری پھیلانے کے

مراکز تھے اور ان کے ذریعے طلب، اور عوام کو اسلامی جہاد پر آمادہ کیا جاتا تھا — بالآخر انگریز نے سنڈاکئے مُلّا کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے تاہم انھیں قبل از وقت حکومت کے اس اقدام علم ہوگیا اور وہ سوات کو نکل گئے۔

سوات ان دنوں سخت افراتفری کے دور سے گزر رہا تھا، ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے لوگوں سے اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرپیکار تھا۔ ۱۸۹۵ء میں چترال کی مہم کے دوران دیر کے نواب شریف خان نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا حالانکہ عوام کی تمام تر ہمدردیاں مشہور غازی عمرا خان جندول کے ساتھ تھیں، نواب صاحب دیر، سوات کے اندرونی معاملات میں بھی دخل اندازی کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اہل سوات کو آپس میں لڑا کر سرزمین سوات پر بھی قابض ہوجائیں۔ نواب محمد شریف خان کی وفات پر ان کے بیٹے اورنگ زیب خان نواب بنے تو انھوں نے بھی اپنے والد کی پالیسی پر عمل کیا۔ سنڈاکئے مُلّا سے اپنے ہم وطنوں (اہل سوات) کی یہ ابتری دیکھی نہ گئی۔ وہ آگے بڑھے، عوام کو اکٹھا کیا اور مارچ ۱۹۰۲ء میں نواب دیر کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ سنڈاکئے مُلّا اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور سوات سے نواب دیر کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ ۱۹۰۵ء میں اہل باجوڑ نے بھی سنڈاکئے مُلّا کی مثال کا اتباع کرتے ہوئے نواب دیر سے گلو خلاصی کرالی۔

اس طرح سوات کو بیرونی مداخلت سے نجات دلا کر سنڈاکئے مُلّا نے سارے علاقے میں امن و امان قائم کیا۔ وہ خود اقتدار کے بھوکے نہ تھے، اس لیے علاقے کے تمام معززین کا اجلاس بلایا اور باہمی صلاح مشورہ سے ستھانہ کے مشہور مجاہد گھرانے کے ایک مدبر سید عبدالجبار شاہ کو سوات کا بادشاہ مقرر

کر دیا، سید عبدالجبار کے دادا سید اکبر شاہ تو مدتی پہلے بھی سوات کے بادشاہ رہ چکے تھے۔ سید عبدالجبار نے بھی فراست سے کام لیا۔ باہمی مشورت سے سوات کے لیے "نظام نامہ" مقرر کیا۔ علاقے کی حفاظت کے لیے تنخواہ دار اور تربیت یافتہ فوج رکھی۔ وصولیٔ عشر کے لیے کارندے مقرر کیے، باہمی تنازعات کے فیصلے شریعتِ اسلامی کی رُو سے ہونے لگے۔ اس عرصے میں سنڈاکی ملّا کو سوات میں "شیخ الاسلام" کی حیثیت حاصل تھی، سارے علاقے میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا کر کے دُنیا بھر کے مسلمانوں کو اُخوّت کے سلسلہ سے منسلک کر دیا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل اکٹھے دھڑکتے ہیں، کہیں بھی کسی مسلمان پر ظلم ہو دوسرا مسلمان تڑپ اٹھتا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں انگریزوں نے ترکیہ کے مسلمانوں پر بلا وجہ حملہ کر دیا تو برِصغیر کے مسلمانوں نے شدید ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا۔ علماء نے انگریز کی ملازمت حرام قرار دے دی۔ جہاد کے فتوے جاری ہو گئے۔ اسی سلسلے میں سوات اور مالاکنڈ کے قبائل نے بھی انگریز کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ مالاکنڈ اور دوسری انگریزی چھاؤنیوں پر حملے کیے جانے لگے۔ سید عبدالجبار شاہ خود بھی مورچوں میں مجاہدین کے ساتھ موجود ہوتے۔ ایک بار کسی نے مخبری کر دی کہ سید صاحب فلاں مورچے میں ہیں۔ اس پر انگریزی توپوں نے اس مورچے پر اندھا دھند گولہ باری کی۔ اگر اس گولہ باری سے بہت نقصان ہوا لیکن سید عبدالجبار شاہ بال بال بچ گئے۔ گولے ان کے دائیں بائیں گرتے رہے لیکن انھیں کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔

روس کیپل ان دنوں صوبہ سرحد کا چیف کمشنر تھا۔ وہ خود صورتِ حال کا جائزہ لینے مالاکنڈ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر سید عبدالجبار شاہ نے اسی

خوش اسلوبی سے کام کیا تو سارے قبائل اسی کے اشارے عمل کرنے لگیں گے اور متحد ہو کر انگریزوں کے لیے مشکلات پیدا کر دیں گے۔ چنانچہ سر روس کیپل نے سازشوں کا جال بچھایا۔ کمزور قبیلوں کو ساتھ ملایا۔ مطلب پرست علماء کے ذریعے اس بات کو ہوا دی کہ سید عبدالجبار شاہ قادیانی عقائد کا مالک ہے اسی اخون صاحب سوات کے پوتے میاں گل عبدالودود کو بھی عبدالجبار شاہ کے مقابل لا کر کھڑا کیا گیا —— دونوں میں کئی جھڑپیں ہوئیں۔ بالآخر سنڈاکئے ملا صاحب نے ستمبر ۱۹۱۷ء کو سوات کا تمام قبائل کا ایک نمائندہ جرگہ بلایا اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے سید عبدالجبار شاہ کی جگہ میاں گل عبدالودود کو سوات کا بادشاہ بنا دیا۔

جب میاں گل عبدالودود نے پوری طرح اقتدار سنبھال لیا تو انگریزی حکومت سے سوات کے الحاق کے لیے خط و کتابت شروع کر دی۔ اس پر برطانوی حکومت نے مارچ ۱۹۲۶ء میں میاں گل عبدالودود کو ریاست سوات کا باقاعدہ حکمران تسلیم کر لیا۔

سنڈاکئے ملا اب تک تو میاں گل عبدالودود کا ساتھ دے رہے تھے لیکن انگریزی حکومت سے الحاق پر ان سے ناراض ہو گئے، کیونکہ وہ کسی قیمت پر بھی فرنگی سے تعاون پر آمادہ نہ تھے —— آخر کار انھوں نے سوات کو "دارالحرب" قرار دے دیا اور ہمیشہ کے لیے وہاں سے نکل کر سالارزئی کے علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے ایک بار پھر سارے قبائل کا جرگہ بلایا۔ اب کے ایک اور روحانی شخصیت بابڑہ ملا نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اب کے سنڈاکئے ملا نے تحریک مجاہدین کے حامدین اور اتمان خیل قبیلہ کے صلاح مشورہ سے خان آف خار کو "امیر جہاد" مقرر کیا، تاہم انگریز کے خلاف عملی جہاد کا آغاز

کرنے سے پیشتر ہی موت کا پیغام آن پہنچا اور مسنڈا کئے ملّا اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انھیں پائندہ خیل کے علاقہ میں دفن کیا گیا۔

کیا اولوالعزم انسان تھے۔ ساری عمر جہاد فی سبیل اللہ اور خدمتِ اسلام میں گزار دی — ایسے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

عمرا خان جنڈول

کوئی پچیس[۲۵] برس ہوئے برطانیہ کی فرمانروا ملکہ الزبتھ پاکستان کے دورے پر آئی تو مردان بھی گئی تاکہ ان انگریز افسروں اور سپاہیوں کو خراج عقیدت پیش کر سکے جنھوں نے برصغیر میں برطانوی اقتدار کے قیام اور استحکام کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں — مردان میں انگریزوں کی تعمیر کردہ ایک یادگار ہے جسے ۱۸۹۲ء میں اُن گورا سپاہیوں کے احترام میں بنایا گیا تھا جنھوں نے ۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو کابل ریذیڈنسی کے دفاع میں جانوں کا نذرانہ پیش کیا — ان "وفادار" فوجیوں کے نام اس یادگار پر کندہ ہیں۔

اس عمارت کے دائیں جانب کچھ سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی ہیں، ان کی ایک دیوار میں ایک چوبی تختہ نصب ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مشہور سرحدی جانباز عمرا خان جنڈول کے قلعہ منڈا کے بیرونی دروازے کا ایک ٹکڑا ہے۔ عمرا خان کو انگریز اہل قلم "سرحدی نپولین" کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس کے نام تک سے خائف رہتے تھے۔

عمرا خان وادیٔ جنڈول (جو دریائے پنجکوڑہ سے میدان کے علاقہ تک آٹھ میل لمبی اور چار پانچ میل چوڑی ہے) کے ایک معزز اور سرفروش یوسف زئی گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے دادا فیض طلب خان ۱۸۶۳ء

میں اپنے سینکڑوں ساتھیوں کے ساتھ امبیلہ کے جہاد میں شریک ہوئے تھے، عمرا خان کے والد کا نام عباس خان تھا۔ عباس خان مستی خیل کے مرتے ہی اس کے تینوں بیٹوں محمد زمان خان، عمرا خان اور محمد شاہ خان کے مابین جائیداد کی تقسیم پر جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دستور کے مطابق بڑا بھائی زمان خان باپ کا جانشین بنا تو اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو علاقے سے نکال دیا جس پر وہ دونوں باجوڑ میں جلا وطنی اور کس مپرسی کی زندگی گزارنے لگے۔ کوئی ذریعہ آمدن تو تھا نہیں۔ فاقوں پر فاقے آنے لگے۔ عمرا خان خود تو برداشت سے کام لیتا رہا لیکن اس سے چھوٹے بھائی کا یہ حال دیکھا نہ گیا۔ ایک دن وہ اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے اٹھا اور بھائی سے کہا: "میں جاتا ہوں یا تو کل صبح تک اس ذلّت آمیز زندگی کو باعزت زندگی میں تبدیل کر کے رہوں گا یا پھر تم جب تک زندہ رہو گے میری موت پر آنسو بہاتے رہو گے"۔

یہ کہہ کر عمرا خاں راتوں رات قلعہ باڑوہ میں پہنچا اور کسی ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا —— وہ محمد زمان خان کی ٹوہ میں رہا۔ چوتھے دن اسے وہ گزرتا دکھائی دیا تو اس نے بندوق سے فائر کر کے اسے وہیں ہلاک کر دیا۔ لوگ دوڑے، وہ عمرا خان کو پکڑ کر قتل کرنے ہی والے تھے کہ اس کی ماں قرآن اٹھائے دوڑتی ہوئی آئی اور نہایت لجاجت سے بولی: "اب میرا بڑا بیٹا تو زندہ ہونے سے رہا۔ عمرا خان کو جان سے مار کر کیا ہمارا سارا خاندان ختم کرنا چاہتے ہو؟" ماں کی منّت سماجت سے عمرا خان کی جان بچ گئی۔ اس طرح عمرا خان جندول کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی محمد شاہ خان کو بھی اپنے پاس بُلا لیا۔

عمرا خان شجاع و غیور تو تھا ہی بڑا مدبر اور زیرک انسان بھی تھا۔ اس کے ارادے شروع ہی سے بہت بلند تھے۔ برسر اقتدار آنے سے پہلے اسے حج بیت اللہ پر جانے کا موقع بھی ملا، مکہ معظّمہ میں اس کی ملاقات نامور عالم دین اور مجاہد مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی ہوئی تھی اور وہ ان سے بڑا متاثر تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اقتدار سنبھالتے ہی اس نے اپنے ہاں اسلامی قوانین نافذ کیے اور فرنگی کے خلاف تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

نواب دِیر ان دنوں اپنے علاقے کا سب سے طاقت ور حکمران تھا، عمرا خان کا اقتدار اس کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ نواب کی فوجوں نے کئی جگہ عمرا خان سے لڑائیاں لڑیں۔ ان دنوں سوات کے میاں گل اور نواب دیر کے مابین ٹھنی ہوئی تھی۔ عمرا خان نے موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھایا اور میاں گل کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ عمرا خان نے ریاست دِیر کے کئی علاقے بھی جندول کے ساتھ ملا لیے۔

عمرا خان کی روز افزوں طاقت سے افغانستان کی حکومت بھی پریشان رہنے لگی، اب حالت یہ ہو گئی کہ نواب دِیر، امیر افغانستان اور فرنگی تینوں عمرا خان کا زور توڑنے کے دَرپے تھے تاہم عمرا خان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اس نے اپنے سپاہیوں اور سواروں کو منظم کیا، انھیں جدید طریق جنگ سے آگاہ کیا۔ جگہ جگہ مضبوط قلعے تعمیر کیے اور اپنے مجاہدوں کو جدید اسلحہ سے لیس کیا۔ ۱۸۹۰ء تک اس کی طاقت اتنی بڑھی کہ دِیر کے نواب شریف خان کو اپنا علاقہ چھوڑ کر سوات میں پناہ لینی پڑی۔

بتایا جاتا ہے کہ عمرا خان نے بمبئی کی ایک انگریز یا سکاچ فرم سے اسلحہ سپلائی کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ یہ فرم اسے جدید بندوقیں اور توپیں فراہم

کرتی تھی۔ برطانوی حکومت کو پتہ چلا تو اس فرم کے پیچھے لگ گئی لیکن وہ لوگ بھی کافی ہوشیار تھے انھوں نے فوراً اپنا کاروبار ہندوستان سے مصر کو منتقل کر دیا۔

عمرا خان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ انگریز سے ٹکراؤ نہ ہو، تاہم ہمسایہ ریاست چترال میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ عمرا خان کو میدان میں کودتے ہی بن پڑی۔ ہوا یہ کہ چترال کا حکمران خاندان خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ اس پر مہتر چترال امان الملک کا ایک نوجوان لڑکا امیر الملک عمرا خان آف جندول کے پاس پناہ کا طالب ہوا — اپنے باپ کی وفات پر وہ واپس چترال گیا تو اس کا بھائی نظام الملک برسر اقتدار آ چکا تھا۔ امیر الملک نے چترال پہنچتے ہی اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور جون ۱۸۹۵ء میں حکومت سنبھال لی — انگریز جانتے تھے کہ امیر الملک عمرا خان کا دوست ہے، اس لیے وہ اس کی حکومت کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ ہوئے، انھوں نے بہت سی فوج جمع کر لی، عمرا خان حالات کا جائزہ لینے چترال پہنچا تو مہتر چترال نے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی بجائے باہر نکل کر عمرا خان سے لڑائی چھیڑ دی لیکن منہ کی کھائی — اب تو عمرا خان کی مزید دھاک بیٹھ گئی — عمرا خان نے دروش پر بھی قبضہ کر لیا — اب عمرا خان نے امیر الملک کی جگہ اس کے چچا شیر افضل کو مہتر بنا دیا اور اس سے وعدہ لیا کہ بوقت ضرورت وہ انگریز کے خلاف عمرا خان کی ہر طرح مدد کرے گا۔

انگریز کو خدشہ تھا کہ عمرا خان کا لشکر نہایت منظم ہے اور وہ خود بھی عوام میں بہت ہردلعزیز ہے، اس لیے اگر ایک بار چترال میں اس کے قدم مضبوط ہو گئے تو اس سے نمٹنا مشکل ہو جائے گا، چنانچہ انھوں نے شیر افضل کو مہتر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی عمرا خان کو بھی خبردار کیا کہ وہ اپنا لشکر چترال سے

نکال لے —— بالآخر لڑائی ناگزیر ہوگئی۔ قبائلی سرفروشوں نے ایک ہی جست میں چودہ نمبر سکھ رجمنٹ کا صفایا کر دیا اور اس کے انگریز افسروں کو قیدی بنا لیا۔ انگریز قیدیوں کو عمرا خان کے پاس درویش بھیج دیا گیا جہاں اس نے اُن سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ اور کہا کہ اگر چترال جانا چاہتے ہو تو چترال چلے جائیں اور اگر اس کے ساتھ جندول جانا چاہتے ہوں تو جندول چلے جائیں۔ دونوں انگریز افسروں (لفٹننٹ کرنل فولر اور لفٹننٹ کرنل ایڈورڈز) نے رہائی کے بعد بھی عمرا خان کی مہمان نوازی اور حسن سلوک کی بڑی تعریف کی۔

ہر چند حاجی عمرا خان انگریزوں سے ٹکر لینے سے بچتا رہا لیکن انگریز کو یہ خوف لاحق تھا کہ اگر عمرا خان کا زور نہ توڑا گیا تو صوبہ سرحد کے سبھی قبائلی علاقے ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اس لیے انھوں نے سر رابرٹ لو (LOW) کی کمان میں ایک بہت بڑا لشکر اور توپ خانہ چترال روانہ کیا۔ یہ لشکرِ جرار یکم اپریل ۱۸۹۵ء کو پشاور سے چلا، ۳/ اپریل کو مالاکنڈ کے نواح میں یوسف زئی سرفروشوں نے انتہائی بے سروسامانی کے باوجود اس لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سات اپریل تک دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا لشکر جرار اور توپ خانہ درّہ مالاکنڈ کو پار نہ کر سکا۔

دریائے سوات کے کنارے حاجی عمرا خان کا بھائی اپنے چار ہزار جانبازوں کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ جونہی توپوں کے گولے برستے مجاہد مجبوراً ادھر ادھر ہو جاتے لیکن دوسرے ہی لمحے پھر شیر کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔

چکدرہ کے مقام پر انگریزوں نے دریا پر عارضی پُل بنا لیا۔ دریا پار کر کے رامورہ کے قریب انھیں "سرحدی نپولین" حاجی عمرا خان کا قلعہ نظر آیا تو انھوں نے توپوں کے منہ کھول دیئے تاہم قلعہ کو نقصان نہ پہنچا سکے اور بالآخر تھک ہار

کر آگے بڑھ گئے - انگریزی لشکر آگے بڑھا تو دریائے جندول کے دونوں کناروں پر اسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

اس معرکہ میں گائیڈز رجمنٹ کا آفیسر کمانڈنگ لفٹننٹ کرنل بیٹی BATTYE اور اس کے بہت سے ساتھی لقمۂ اجل بنے۔ یوسف زئی مجاہدوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جس شخص کو تلوار میسر نہ ہوتی وہ لاٹھی یا پتھر لے کر ہی دشمن پر ٹوٹ پڑتا جس مجاہد کے پاس گولیاں ختم ہو جاتیں وہ دست بدست لڑائی شروع کر دیتا اور لڑتے لڑتے جان دے دیتا۔ میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنا تو ان کی روایات میں داخل ہی نہ تھا۔ اس معرکے میں شریک ہونے والے ایک انگریز افسر کیپٹن ینگ ہسبنڈ نے لکھا ہے:

"یورپی سپاہیوں کے مقابلے میں مقامی لوگوں میں بے پناہ قوتِ برداشت تھی۔ زخمی ہوتے تو خود ہی پٹی باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور اور پھر لڑائی شروع کر دیتے۔"

سرحدی غازیوں کی شجاعت و حمیّت کا ایک چشم دید واقعہ وہ یوں بیان کرتا ہے:

"ایک قبائلی جوان سرخ ہلالی پرچم اٹھائے اپنے ساتھیوں سمیت نعرے لگاتا ہوا گورا فوج کے ایک دستے پر حملہ آور ہوا ——— گورا سپاہیوں کی تعداد ان کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ تاہم غازیوں نے اس کثرتِ تعداد کی کوئی پرواہ نہ کی ——— ایک ایک مجاہد انتہائی بہادری سے لڑتا اور شہید ہوتا رہا ——— آخر میں ان کا سردار میدان میں اترا اور انتہائی بے جگری سے لڑتا ہوا جامِ شہادت نوش کر گیا۔"

ایک دوسرے مجاہد کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ وہ اپنے بہادر ساتھیوں کی ہمت بڑھانے کے لیے ایک اونچی چٹان پر کھڑا ڈھول بجا رہا تھا۔ وہ جگہ گولیوں کی عین زد میں تھی۔ گولی سنسناتی ہوئی آتی، اسے لگتی تو وہ تھوڑی دیر کے لیے ڈھول بجانے سے رک جاتا لیکن زخم پر پٹی باندھنے کے بعد پھر ڈھول بجانے لگتا۔ کئی گولیاں اسے لگیں لیکن اس کی ہمت میں فرق نہ آیا۔ بالآخر ایک گولی اسے دل کے قریب لگی تو وہ کئی سو فٹ گہری گھاٹی میں گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ تاہم آخر تک ڈھول اس کے گلے میں پڑا رہا اور ہاتھ اسی طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے، گویا اب بھی ڈھول بجا کر غازیوں کا خون گرما رہا ہو۔ اللہ اللہ یہ ہے رقصِ بسمل اور یہ ہے شوقِ شہادت!

خود عمرا خان جندول چترال میں برسرِ پیکار رہا۔ اس نے قلعۂ چترال کا محاصرہ کر لیا۔ جب محصورین کی حالت نازک ہو گئی تو انھوں نے قلعۂ مستوج سے امداد طلب کی۔ وہاں سے لفٹنٹ گرڈن کی قیادت میں کمک بھیجی گئی تو غازیوں نے رستے ہی میں اُسے روک لیا۔ گلگت کے راستے بھی گورا فوج چترال کی طرف بڑھی یہاں تک کہ مارچ تک چترال میں انگریزی فوج کی نفری چھ سو تک پہنچ گئی۔ ۳۰ مارچ سے ۱۹ اپریل تک چترال میں ساٹھ انگریز مارے گئے۔

جب پشاور سے آنے والے ہزاروں سپاہیوں اور توپ خانہ نے جندول کے علاقے پر زبردست دباؤ ڈالا تو عمرا خان کو مجبوراً چترال کی بجائے ادھر کا رخ کرنا پڑا۔ عمرا خان کے چترال سے نکلتے ہی مہتر شیر افضل نے حوصلہ ہار دیا۔ افغانستان کی حکومت آخر تک شیر افضل کو یقین دلاتی رہی کہ اس کی امداد کے لیے دس ہزار سپاہی خیبر کی راہ اور دس ہزار مہمندوں کے علاقے کے راستے

بھیجے جا رہے ہیں لیکن یہ محض ایک چال تھی۔

حاجی عمرا خان جنڈول پہنچا تو دونوں انگریز افسر (جنھیں اس نے قیدی بنا تھا) بھی اس کے ہمراہ تھے، اس نے انھیں اپنی جانب سے خط دے کر انگریزی حکومت سے گفت و شنید کے لیے بھیجا لیکن انگریزوں نے آنکھیں پھیر لیں۔

عمرا خان جہاں انتہائی دلیر اور بہادر تھا وہیں سیاسی داؤ پیچ بھی خوب جانتا تھا ـــــ اس نے بظاہر صلح کی بات چیت جاری رکھی لیکن ساتھ ہی راتوں رات خفیہ طریق سے اپنا خزانہ اور اسلحہ افغانستان کی طرف بھیج دیا، بعد میں اپنے بیوی بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیا۔ آخر تک اس نے انتہائی رازداری سے کام لیا اور بڑا پرسکون اور مطمئن دکھائی دیتا رہا۔

۱۷ اپریل کو اس نے منڈا کے قلعے میں اپنے سرکردہ ساتھیوں کو صلاح مشورے کے لیے بلایا۔ ہر ایک سے جنگ کی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ آخر میں ایک مدلل تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ مزید فوج کے بغیر اب انگریز سے مقابلہ ممکن نہیں رہا۔ مزید فوج صرف افغانستان ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ راتوں رات سفر کر کے اسمار میں افغان سپہ سالار سے ملاقات کرے گا اور وہاں سے افغان فوج لا کر انگریز سے دو دو ہاتھ کرے گا۔"

یہ کہہ کر دوستوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور عازمِ افغانستان ہو گیا، صرف دو تین قابلِ اعتماد دوست اس کے ساتھ تھے ـــــ وہ ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا ـــــ وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔

حاجی عمرا خان کی روانگی کے دوسرے ہی دن انگریز کی فوجیں قلعہ منڈا پر حملہ آور ہوئیں تو کمانڈر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک شخص بھی مزاحمت

کرنے والا نہ تھا۔ قلعے کا بڑا دروازہ کھلا پڑا تھا اور فرش پر کچھ فالتو سامان اور کاغذات بکھرے پڑے تھے ——— انھیں کاغذات میں وہ رسیدیں بھی تھیں جو حاجی عمرا خان کو اسلحہ سپلائی کرنے والی سکاٹ لینڈ کی فرم نے جاری کی تھیں ——— جب اور کچھ نہ مل سکا تو اپنی فتح کی نشانی کے طور پر وہ عمرا خان کے قلعہ کے صدر دروازہ کے منقّش اور خوب صورت چوبی کواڑ ہی اٹھا کر لے گئے، یہ کواڑ اب بھی مردان چھاؤنی کے گائیڈز میس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

حاجی عمرا خان بلاشبہ اپنے دَور کا سب سے عظیم قبائلی رہنما تھا!

○

غازی عبدالرشید شہید

پشاور کی صدیقی برادری نہ صرف شہر کے تجارتی اور معاشرتی حلقوں میں نمایاں حیثیت کی مالک ہے بلکہ قومی خدمت اور سیاست کے میدان میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہی ہے، اس خانوادہ کے میاں بشیر احمد صدیقی (قائد تحریکِ خاکساراں) قربانی اور ایثار کے پُتلے تھے تو ان کے بھائی میاں غلام حسین خلافت اور مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور راہنما، وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ بڑے تو بڑے اس گھرانے کے نوجوان بھی جوش وخروش میں کسی سے پیچھے نہ تھے، میاں غلام حسین کے نوجوان فرزند عبدالرشید تو سبھی سے بازی لے گئے اور عین عالمِ شباب میں مرتبۂ شہادت کو پہنچ گئے۔

غازی عبدالرشید پشاور کے سب سے بڑے شفاخانہ، لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں کمپونڈر کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان دنوں ہسپتال کا سربراہ میجر کولڈسٹریم نامی ایک جابر انگریز تھا جو بلحاظ عہدہ پشاور سنٹرل جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔ کولڈسٹریم بڑا سنگدل انسان تھا، وہ مسلمانوں اور بالخصوص تحریک میں حصہ لینے والوں کا جانی دشمن تھا۔ ۱۹۳۰ء میں قصہ خوانی فائرنگ اور اس کے بعد تحریکِ حریت کے دوران کافی سیاسی کارکن، بیمار یا زخمی ہو کر لیڈی ریڈنگ

ہسپتال لائے جاتے تو کولڈ سٹریم انھیں بالکل نظر انداز کر دیتا۔ یہاں تک کہ زیادہ جوشیلے اور سرگرم سیاسی کارکن علاج کی خاطر ہسپتال لائے جاتے تو علاج کرنے کی جگہ وہ انھیں زہر کا ٹیکہ لگا کر ختم کر دیتا۔ غازی عبدالرشید کولڈ سٹریم کی ان کارستانیوں سے پوری طرح باخبر تھا۔

۱۹۳۳ء میں ایک بار مشہور قومی رہنما عاشق بادشاہ کو جیل سے علاج کی خاطر لیڈی ریڈنگ ہسپتال منتقل کیا گیا۔ وہ کافی دیر تک ہنیڈی سائڈ وارڈ کے برآمدے میں پڑے رہے لیکن ہسپتال کے عملہ نے کوئی توجہ نہ دی، بات پیر بخش خان ایڈووکیٹ تک پہنچی جو ان دنوں لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہونے کی حیثیت سے جیل کے غیر سرکاری وزیٹر بھی تھے۔ وہ ہسپتال آئے اور اور سید عاشق بادشاہ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں کولڈ سٹریم اُدھر آنکلا اور پیر بخش خان پر برس پڑا کہ وہ کیوں ایک سیاسی قیدی سے باتیں کر رہے ہیں؟ پیر بخش خان نے بتایا کہ وہ عوام کے منتخب نمائندے اور جیل کے غیر سرکاری وزیٹر ہونے کی حیثیت سے قیدی کی مزاج پرسی کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ کولڈ سٹریم گرم مزاج تو تھا ہی، کہنے لگا: "دور ہو جاؤ۔ میری اجازت کے بغیر کوئی ہسپتال میں سیاسی قیدی سے بات کرنے کا مجاز نہیں"۔ پیر بخش خان نے اسے کہا۔ سیاسی قیدی بہر حال انسان ہے اور اس کی تکلیف کو رفع کرنا ہم سب کا انسانی فرض ہے"۔ معاملہ اس وقت تو رفع دفع ہو گیا تاہم عبدالرشید اس واقعہ سے بڑا متاثر ہوا اور کولڈ سٹریم کے رویہ سے دل برداشتہ ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد ایک اور سیاسی قیدی بیماری کی حالت میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال لایا گیا۔ حسبِ عادت کولڈ سٹریم اسے بھی زہر کا انجکشن لگا کر موت

کے گھاٹ اُتارنا چاہتا تھا۔ جونہی وہ مریض کو ٹیکہ لگانے کے لیے جھکا عبدالرشید نے چھری سے اس پے در پے تین وار کیے اور اسے مردار کر دیا۔ عبدالرشید کے اس مجاہدانہ کارنامے کی دھوم گئی ـــــ اسے گرفتار کر کے نامعلوم جگہ لے جایا گیا۔

سرسری سماعت کے بعد اسے سزائے موت سنا دی گئی۔ موت سے قبل اسے بڑی اذیتیں دی گئیں کہ وہ اپنے بیان میں پیر بخش خان، عبدالرب نشتر اور غلام غوث صحرائی کے اس جرم میں ملوّث ہونے کا بھی ذکر کرے تاہم دھان پان جسم لیکن فولادی عزم کے مالک عبدالرشید نے کہا تو یہی کہا کہ کولڈ سٹریم کو میں نے قتل کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ وہ انتہائی متعصب اور سنگدل تھا۔" شہر کے ایک طوائف زادہ کو جو کسی وکیل کے پاس منشی تھا، سرکاری گواہ بنا کر پیش کیا گیا، اس نے بیان دیا کہ "میں نے اپنی آنکھوں سے عبدالرشید کو پیر بخش خان کے بالاخانہ سے اترتے دیکھا ہے۔ اور یہ کہ عبدالرشید کا غلام غوث صحرائی کے پاس بھی اٹھنا بیٹھنا ہے۔"

اتفاق سے وقوعہ کے دن پیر بخش خان ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے اور یہ بات ریکارڈ پر تھی اس لیے ان کے خلاف، تو کچھ نہ کیا جا سکا البتہ غلام غوث صحرائی کو اعانتِ جرم کی بناء پر ایک سال قید کی سزا سنا دی گئی۔

انگریز کی سنگ دلی ملاحظہ ہو کہ پھانسی دینے کے بعد غازی عبدالرشید کی میّت بھی ورثاء کو نہ دی گئی بلکہ اسے راتوں رات ہی انتہائی رازداری سے جیل کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا ـــــ تاہم شہید عبدالرشید کو اس کے اجرِ آخرت سے کون محروم کر سکتا ہے۔ اس نے ناموسِ اسلام

کی خاطر ایک دشمن اسلام، سنگ دل اور جابر حاکم کو ختم کر کے حق و
انصاف کا بول بالا کر دیا۔

کتنا عظیم تھا عبدالرشید شہید؟

○

"سیلچی"

وہ ایک مہم باز اور جنگجو تھا جس کا نام سنتے ہی بڑے بڑے بہادر انگریزوں اور غیر مسلموں کا زہرہ آب ہو جاتا تھا۔ سب لوگ اسے "سیلچی" کہتے کہتے تھے اور کوئی اس کے اصل نام سے بھی واقف نہ تھا۔ وہ "رابن ہڈ" کی کی طرح آتا، جو ہاتھ لگتا لے کر چلتا بنتا اور فرنگی فوج اور انتظامیہ منہ دیکھتے رہ جاتی۔

سیلچی کی داستان دلچسپ بھی ہے اور رنگین بھی ـــــ بنوں چھاونی کے نواح میں وزیریوں کا ایک قبیلہ کابل خیل آباد ہے۔ علاقہ کابل خیل کے ایک پہاڑی درے میں گمتی کے مقام پر ایک برج بنا ہوا ہے جو ایک وزیری مہم جو اور شمشیر آزما کا مسکن تھا۔ وزیرستان کے اس رابن ہڈ کو "سیلچی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر بنوں شہر پر چھاپے مارتا۔ بنوں ان دنوں بڑے بڑے ہندو سیٹھوں کا مسکن تھا اور صوبہ سرحد کا بنارس کہلاتا تھا۔ ہندو بنوں کی معاشی، معاشرتی اور علمی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ اتنے دلیر اور سرتیز تھے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مکان پر مورچے بنا رکھے تھے، جونہی مسلمان سر اٹھاتے وہ مورچہ بند ہو کر بیٹھ جاتے اور مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے۔ لیکن ان سبھی حفاظتی انتظامات کے باوجود سیلچی اور اس کے ساتھی دن دہاڑے

دندناتے آتے اور ہندو سیٹھوں کو لوٹ کر چلتے بنتے۔ پولیس منہ دیکھتے رہ جاتی، کبھی کبھی حملہ آوروں کے خلاف فوجی مہم بھیجی جاتی تو اسے بھی کوئی کامیابی نہ ہوتی ـــــ بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ بنّوں چھاؤنی کے بنگلوں میں انگریز افسروں کے گھوڑے اور سامان بھی سیلچی کے ہاتھوں محفوظ نہ تھا، سبھی حیران تھے کہ کیا کریں۔

۱۸۹۷ء میں انگریز اور اس کے اتحادیوں نے ترکی اور دوسرے مسلمانوں کو نشانۂ عتاب بنایا تو سادے سرحدی مسلمان بڑے برافروختہ ہوئے۔ اب کے انگریز افسروں نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ دی۔ ایک اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ جیسے بھی ہو سیلچی کے بُرج اور گمتی کے قلعہ کو مسمار کرنے میں کوئی دیر نہ کی جائے۔ چنانچہ اسی وقت سکھ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل ٹنوچی اور اس کے ایجوٹنٹ میجر وائٹ کو فوج دے کر اس مہم پر بھیجا گیا۔ اس لشکر میں چھ سو افسر اور سپاہی شامل تھے اور ان کے ہمراہ توپ خانہ بھی تھا۔ دوسری طرف سیلچی کے پاس گنے چنے آٹھ دس آدمی تھے۔ اپنے ان جاں نثار ساتھیوں اور بیوی بچوں کے ہمراہ وہ اپنے برج میں مزے سے زندگی گزار رہا تھا۔

سیلچی کے خلاف اس مہم کے سلسلے میں بڑی رازداری سے کام لیا گیا۔ انگریزی فوج چپکے سے رات کے دو بجے بنّوں چھاؤنی سے نکلی اور صبح نو بجے تک اس نے گمتی بُرج کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیٹیکل افسر مسٹر ڈانلڈ بھی فوجی دستے کے ہمراہ تھا۔ گمتی پہنچنے پر غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ قلعے کے دروازے کی طرف بڑھا اور صلح کا جھنڈا بلند کیا۔ اس پر سیلچی اس سے مذاکرات کرنے پر رضامند ہوگیا۔ انگریز افسر نے سیلچی کو ہتھیار ڈال دینے کو کہا جس کے جواب میں سیلچی نے کہا کہ اگر انگریز اسے اور اس کے ساتھیوں کو

ہتھکڑیاں نہ لگائے اور اس کے بُرج اور قلعہ کو مسمار نہ کرنے کا وعدہ کرے تو وہ اپنے آپ کو اُس کے حوالے کرنے کو تیار تھا۔ انگریز طاقت کے نشہ میں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چھ سات سو فوجیوں اور توپوں کے سامنے سات آٹھ آدمیوں کی بساط ہی کیا ہے؟ ـــــ چنانچہ پولیٹیکل افسر نے سیلجی کی کوئی شرط ماننے سے انکار کر دیا اور توپوں سے بُرج اور قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے باوجود سیلجی اور اس کے جانباز ساتھی مقابلے پر ڈٹے رہے۔ رفتہ رفتہ فوج گھیرا تنگ کرتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ قلعہ کی دیوار تک جا پہنچی ـــــ انگریز افسر نے ایک بار پھر سیلجی کو ہتھیار ڈالنے کو کہا لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوا کہ ہار ماننا اس کی فطرت ہی میں نہ تھا۔

اس اثناء میں فرنگی کی توپوں کی گولہ باری سے قلعہ کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ یہ حال دیکھ کر سیلجی نے فصیل سے سر نکالا اور دو انگریز توپچیوں کو موت کی نیند سلا دیا ـــــ تھوڑی دیر بعد کرنل ٹنوچی اور ڈانلڈ یہ دیکھنے کے لیے آگے بڑھے کہ آیا ان شگافوں سے فوج کا قلعے میں داخل ہونا ممکن ہے کہ نہیں ـــــ اتنے میں ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی، کرنل کے سینے میں پیوست ہو گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا ـــــ اپنے کمانڈنگ آفیسر کے مرتے ہی اکثر سپاہی دل چھوڑ بیٹھے لیکن افسروں نے انھیں سمجھایا اور پسپائی کی ذلّت سے بچنے کے لیے وہ پھر مقابلے پر ڈٹ گئے ـــــ اپنے کرنل کی موت کا بدلہ لینے کے لیے انجینیرز کا لفٹنٹ براؤن دوڑتا ہوا آگے بڑھا اور بارود کی سرنگ لگا کر قلعے کو اڑا دینے کی کوشش کی۔ پہلے پہل تو اسے کامیابی نہ ہوئی لیکن بعد میں توپ کا ایک گولہ لگنے سے دیوار میں کافی بڑا شگاف پڑ گیا ـــــ اس پر فرنگی سپاہی دوڑتے ہوئے آگے

بڑھے کہ شگاف سے قلعے میں داخل ہو جائیں لیکن وزیری بدستور گولیاں برساتے رہے جن سے باڈی گارڈز کا ایک سکھ افسر زخمی ہو کر ایسا گرا کہ پھر اُٹھ نہ سکا۔

کہا جاتا ہے کہ اس معرکہ میں وائٹٹ نے اپنے کرنل کی موت کا انتقام لینے کی قسم کھائی تھی لیکن کرنل کی موت کا بدلہ لیتے لیتے وہ خود اپنی ہی جان گنوا بیٹھا، وہ قلعے میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک وزیری نے گولی مار کر اسے ختم کر دیا۔

بھلا توپوں کی مسلسل گولہ باری کے آگے قلعے کی کچی دیواریں کب تک ٹھہرتیں، ایک ایک کر کے ساری دیواریں گر گئیں تو ساری انگریزی فوج ان بچارے چھ وزیریوں پر ٹوٹ پڑی تاہم وہ جانباز بھی آخر تک ڈٹے رہے اور لڑتے لڑتے ایک ایک کر کے جاں بحق ہو گئے۔

مقابلہ ختم ہوا تو سناٹا چھا گیا — اب سیلچی کی لاش کی ڈھنڈیا پڑی — کچھ دیر بعد دیکھا گیا کہ اس کی لاش ایک دیوار کے ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ سیلچی کو نکالا گیا تو بھی اس حال میں کہ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور بندوق کو اس نے مضبوطی سے تھامے ہوا تھا۔ بمشکل دو آدمیوں نے اس کے ہاتھ سے بندوق الگ کی۔

اس وزیری جانباز کی ماں اور بیوی بھی اسی قلعے میں مقیم تھیں۔ اس قیامت خیز لڑائی میں انھوں نے بڑے صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔

بتایا جاتا ہے کہ جس دن بنوں سے فوج گمٹی برج کو مسمار کرنے جا رہی تھی تو اتفاق سے امرت سر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں نہتے انسانوں پر گولی چلانے والا سنگدل انگریز جرنیل مائیکل اوڈائر (O'DYER) بھی بنوں میں موجود تھا۔ وہ بھی تماشائی کے طور پر حملہ آور لشکر کے ساتھ گمٹی گیا ہوا تھا۔ اسی اوڈائر کا بیان ہے کہ سیلچی کی بیوی سے بڑھ کر خوبرو، باوقار اور وضعدار عورت

مجھے دنیا بھر میں کہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا —— بعد میں ان دونوں خواتین کو ان کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ جب ڈانلڈ نے سیلچی کی شرائط منظور نہ کیں اور جنگ ناگزیر ہو گئی تو سیلچی رائفل ہاتھ میں لیے سیدھا اپنی والدہ کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ یہ معرکہ اس کی زندگی کا آخری معرکہ ثابت ہوگا۔ اس پر ماں نے اسے گلے لگایا، دعا دی اور خوشی خوشی رخصت کیا —— ہوا بھی یہی کہ تھوڑی دیر بعد سیلچی دادِ شجاعت دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

کہنے کو تو انگریزی لشکر نے مٹی اور گارے سے بنا ہوا چھوٹا سا برج پیوند زمین کر دیا اور بظاہر اس بات کو اپنی بہت بڑی کامیابی قرار دیا تاہم انھیں اس کی کچھ کم قیمت ادا نہ کرنی پڑی۔ یہ برج انھیں کس قیمت پر پڑا؟ —— اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک کرنل، ایک ایجوٹنٹ، ایک لفٹنٹ کئی دیسی افسر اور بیسیوں سپاہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور انگریز بہادر پر یہ روشن ہو گیا کہ ایسی قوم سے پنجہ لڑانا جس کا ہر فرد موت کو ایک کھیل سمجھتا ہو، خالہ جی کا گھر نہیں —— چنانچہ اس واقعہ کے کئی سال بعد تک انگریزوں کو وزیرستان کی طرف رُخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

○

مولانا عبدالرحیم محمد بشیر شہید

سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد کا آغاز اگرچہ وسطی ہند سے ہوا تاہم اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی اصل جولان گاہ صوبہ سرحد ہی کی سرزمین تھی، اس تحریک نے عوام کے دلوں کو نیا ولولہ اور حوصلہ دیا۔ انھیں جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور مسلمان کو ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر تیار کیا۔

سیّد احمد بریلوی اور دوسرے اکابرِ تحریک مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ ہزارہ کے مقام پر جامِ شہادت نوش کر گئے تاہم وہ اتنی منظم تحریک چھوڑ گئے جس کی سرگرمیاں اس کے سوا سو (۱۲۵) سال بعد بھی بدستور جاری رہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف امیر المجاہدین تحریکِ جہاد کی قیادت کرتے رہے اور ایک پل کے لیے بھی انھوں نے فرنگی حکمرانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

مولانا عبدالرحیم کو بھی "امیر المجاہدین" کی حیثیت سے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ صوبہ سرحد میں وہ "محمد بشیر" کے فرضی نام سے پہچانے جاتے تھے۔ مجاہدین کا قاعدہ تھا کہ وہ اکثر سرحد کے قبائلی علاقہ میں پہنچنے پر اپنا نام بدل لیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحیم یہاں مولانا محمد بشیر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

مولانا کے والد رحیم بخش ایک بہت بڑے عالم باعمل تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، مولانا عبدالرحیم نے دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور میں کچھ عرصہ تک کتاب فروشی کا کام شروع کیا ــــ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ترک مسلمانوں کو

روئے زمین سے مٹانے کا تہیہ کر چکا تھا اور مسلمانان ہند تحریکِ خلافت کے سٹیج سے فرنگی کے خلاف اس پر صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔ مولانا عبدالرحیم اس موقع پر خاموش تماشائی نہ رہ سکے اور گھر بار، بیوی بچے، کام روزگار چھوڑ کر آزاد علاقہ میں مجاہدین کے مرکز ستھانہ میں پہنچ گئے جہاں کچھ عرصہ تک انھوں نے مناسب عسکری تربیت حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں جب مسلمان مجاہدوں نے رستم (مردان) کے فوجی کیمپ پر شبخون مارا تو مولانا عبدالرحیم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر مولانا عبدالرحیم شبیر احمد کو "امیر المجاہدین" بنا دیا گیا۔ مجاہدین کا منصوبہ یہ تھا کہ انگریز کو سرحد کے قبائلی علاقے میں لڑائیوں میں الجھائے رکھا جائے تاکہ وہ ترکوں کے خلاف پوری طاقت سے لڑائی جاری نہ رکھ سکیں۔

اس مقصد کے لیے مولانا عبدالرحیم نے مختلف قبائلی علاقوں کے دورے بھی کیے اور اسی امر کے پیش نظر وہ امیر افغانستان حبیب اللہ خان کے پاس بھی گئے اور اس پر زور دیا کہ وہ تُرک مجاہدوں سے یک جہتی کا اظہار کرتے ہوئے انگریز کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا جائے لیکن امیر کابل ٹال مٹول سے کام لیتے رہے، انگریز مولانا عبدالرحیم کی ان سرگرمیوں سے بے حد خائف تھے۔ انھوں نے بہت سے مُخبران کے پیچھے لگا رکھے تھے۔ بالآخر ایک مخبر نے یکم رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ کو مولانا عبدالرحیم کو اس وقت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جب وہ اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔

یوں امیر المجاہدین مولانا عبدالرحیم محمد شبیر خونیں کفن پہنے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

○

حاجی جان محمد

تحریکِ ہجرت اور تحریکِ خلافت کے دورِ عروج میں پشاور ایک اسلامی مملکت کے دارالحکومت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ملک بھر سے شمع اسلام کے پروانے اپنا گھر بار، مال و دولت اور عزیز و اقارب چھوڑ کر آتے اور کابل کی طرف ہجرت کر جاتے۔ نمک منڈی میں خیموں کی قطاریں نصب تھیں اور اہلِ پشاور برِصغیر سے آنے والے مسلمانوں کی راہ میں دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ یوں تو ہجرت اور خلافت کا ہر رکن خلوص و ایثار کا پتلا تھا تاہم ان دنوں حاجی جان محمد کا نام ہر زبان پر تھا۔ وہ قومی تحریکوں کے رُوحِ رواں تھے، جو آتا راہِ خدا میں لٹا دیتے۔

۲۰ جون ۱۹۲۰ء کو سندھ کے بیرسٹر جان محمد جونیجو ایک سپیشل ریل گاڑی میں عازمینِ ہجرت کو لے کر پشاور پہنچے تو حاجی جان محمد کی قیادت میں ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ان دنوں میاں جعفر شاہ ہجرت کمیٹی کے صدر، مولوی عبدالغفور سیکرٹری اور حاجی جان محمد خزانچی تھے۔ قومی کاموں کے لیے جتنی رقم درکار ہوتی حاجی جان محمد کسی نہ کسی طرح مہیا کرتے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اسلامیہ کلب، خیبر بازار کا تحفظ تھا۔ اسلامیہ کلب کے قیام کا پس منظر یہ تھا کہ مسلمانانِ پشاور کے بچوں کی تعلیم کے لیے کوئی انتظام نہ تھا، یا تو ان دنوں مشنری سکول تھے

یا ہندوؤں کے تعلیمی ادارے۔ اس پر چند مسلمان زعماء آگے بڑھے اور انھوں نے انجمن حمایت الاسلام پشاور کی داغ بیل ڈالی، محلہ خداداد کا اسلامیہ سکول اسی انجمن کی نگرانی میں چلتا تھا۔ انجمن حمایت اسلام نے موجودہ خیبر بازار میں اراضی لے کر اسلامیہ کلب تعمیر کی اور اس کے ساتھ دکانیں بنائیں تاکہ ان کی آمدنی سکول پر خرچ کی جا سکے لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اسلامیہ کلب کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ہی انجمن مقروض اور زیر بار ہو گئی اور کلب کی عمارت کو رہن رکھنا پڑا، رفتہ رفتہ سود کی رقم اتنی بڑھ گئی کہ اسلامیہ کلب کے واگزار کرانے کا امکان نہ رہا۔ مسلمانانِ پشاور پریشان تھے کہ اگر پشاور کا یہ اکلوتا اسلامیہ سکول بھی ختم ہو گیا تو ان کے بچوں کی تعلیم کا کیا بنے گا ـــــ ایسے میں حاجی جان محمد آگے بڑھے اور انھوں نے اپنی جائیداد بیچ کر اور کچھ رہن رکھ کر اسلامیہ کلب کو واگزار کرا لیا۔ تاہم حاجی صاحب نے انجمن حمایت اسلام کو اس امر کا پابند کیا کہ بیس سال تک اس املاک کا نہ کرایہ وہ قرض کی رقم میں مجرا کرتے رہیں گے۔ حاجی صاحب کی فراخدلی دیکھیے کہ بیس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی انھوں نے اسلامیہ کلب اور ملحقہ دکانیں انجمن حمایت الاسلام کو واپس کر دیں۔

عرصہ دراز تک اس اسلامیہ کلب (جہاں ان دنوں یونیورسٹی بک ایجنسی اور مکتبۂ سرحد قائم ہے) بلڈنگ میں اسلامیہ پرائمری سکول کام کرتا رہا۔ یہیں مجلس خلافت اور مسلم لیگ کے ابتدائی جلسے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ بعد میں جب صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور دوسرے مسلمان زعماء کی کوششوں سے اسلامیہ ہائی سکول (موجودہ ۳ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول) پشاور کی عمارت مکمل ہو گئی تو اسلامیہ کلب بلڈنگ اسلامیہ کالج اور پشاور

یونیورسٹی کی تحویل میں دے دی گئی ہے۔ چنانچہ اب اس املاک کا انتظام و انصرام پشاور یونیورسٹی ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

حاجی جان محمد جب تک زندہ رہے، اسلامی اور قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ان کی دریا دلی اور فیاضی دوسرے متمول مسلمانوں کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ نہ عہدے کے بھوکے تھے نہ شہرت کے طالب بعد میں جب مجلس خلافت کی صدارت سید مقبول شاہ اور خان عبدالغفار خان کو ملی تو بھی حاجی جان محمد اُن سے بھرپور تعاون کرتے رہے اور انھوں نے کبھی مجلس خلافت کو مالی مشکلات کا شکار نہ ہونے دیا۔

○

میر دست خان آفریدی

"جان بیٹا خلافت پہ دے دو! بولی اماں محمد علی کی ——" چھوٹا بڑا ہر مسلمان جب یہ ترانہ الاپتا تو اس کا خون جوش مارنے لگتا۔ اسلامی حمیت کی رگ پھڑکتی اور وہ چاہتا کہ اسے پر لگ جائیں۔ وہ ترکی پہنچے اور ترک فوج میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کرے ——!

حقیقت یہی ہے کہ خلافت اور ہجرت ہی وہ انقلابی تحریکیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں آزادی کا جذبہ ابھارا اور محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وہ شیر دل راہنما تھے جنھوں نے انگریز کا تمام رعب خاک میں ملا دیا ——

خلافت ہی کے اجلاس میں پہلی بار اعلان کیا گیا کہ انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا اور اس سے تعاون کرنا معیوب فعل ہے۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں لوگوں نے ملازمتوں سے استعفے دے دیے۔ سرکاری خطابات واپس کر دیے۔ اور غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ شروع کر دیا۔ عوام کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازم بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ صوبیدار میر دست خان آفریدی بھی ایک ایسے ہی ایثار پیشہ سرفروش تھے۔

صوبے دار میر دست خان ان ہزاروں مسلمان سپاہیوں میں سے تھے

جنھوں نے جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء) میں انگریزوں کی فوج میں شامل ہو کر بہادری کے شاندار کارنامے انجام دیے۔ ۲۶/اپریل ۱۹۱۵ء کو وائی پریس (YPRES) کے محاذ پر ایک جونیئر افسر کے طور پر اس نے بے مثل بہادری کا مظاہرہ کیا۔ اس لڑائی میں جب سبھی انگریز افسر ایک ایک کر کے مارے گئے تو میر دست خان نے خود کمان سنبھال لی۔ اس نے منتشر سپاہیوں کو پھر سے جمع کیا اور دشمن سے اس وقت تک برسرپیکار رہا جب تک اسے واپسی کا حکم نہ مل گیا۔ اسی اثناء میں وہ آٹھ انگریز اور دیسی زخمی اور نیم جان افسروں کو اٹھا کر محفوظ مقام تک لے گیا حالانکہ دشمن اس وقت ان پر شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ بعد میں اس بے مثل بہادرانہ کارنامے پر میر دست کو صوبیدار بنا دیا گیا اور اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے "وکٹوریہ کراس" عطا کیا گیا جو سلطنتِ برطانیہ میں بہادری کا اعلیٰ ترین تمغہ تھا۔

اس کی یہاں تک عزت افزائی کی گئی کہ شہنشاہِ انگلستان نے اسے لندن بلایا۔ اسے شاہی محل میں ٹھہرایا گیا۔ اس کے اعزاز میں بڑی بڑی ضیافتیں ترتیب دی گئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں اس کی رنگین تصویریں چھاپ کر صوبہ سرحد کی حکومت کو بھیجی گئیں اور ہدایت کی گئی کہ ہر سکول، کالج اور ہر سرکاری دفتر میں میر دست خان کی تصویر نمایاں جگہ پر آویزاں کی جائے۔

کسی دیسی سپاہی کے لیے یہ اعزاز اور یہ قدر افزائی انتہائی باعثِ فخر بات تھی تاہم بعد میں جب میر دست خان اور اس کی پلٹن کو (جس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی) ترکوں سے لڑنے کو کہا گیا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ میر دست (بعض کتابوں میں اسے میر مست بھی لکھا گیا ہے) ہوشیار نکلا وہ انگریزی لشکر سے روپوش ہو کر جرمنی چلا گیا جہاں بقول اللہ بخش یوسفی اسے ایک

سرحدی ہندو پٹھان رام چند مل گیا۔ موضع یار حسین تحصیل صوابی ضلع مردان کے رہنے والے اس ہندو نے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر دلی میں بم پھینکا تھا) اور اب مفرور ہو کر جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ جرمنی سے ہوتا ہوا آفریدی سرفروش میر دست خان ترکیہ پہنچا جہاں خلیفۃ المسلمین نے اسے شرف ملاقات بخشا اور جب اس نے اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا تو سلطان المعظم نے اپنے ہاتھ سے اسے ایک مرصّع ترکی علم عطا کیا۔

واضح رہے کہ جن مُسلمان سپاہیوں نے اپنے ہم مذہبوں (ترکوں) سے لڑنے سے انکار کیا تھا، انھیں پہلے تو انگریز نے توپ دم کرنا چاہا لیکن جنگ کی نازک صورت حال میں اس سے پھیلنے والے متوقع اشتعال سے بچنے کے لیے انھیں وطن واپس بھیجنے کے بہانے بحری جہازوں پر سوار کیا گیا اور راستے میں انھیں سمندر میں پھینک کر ہلاک کر دیا گیا۔

جب ۱۹۱۶ء میں صوبیدار میر دست افغانستان کے راستے تیراہ پہنچا تو اس نے باغ کے مقام پر آفریدیوں کے ایک بہت بڑے اجتماع میں خلیفۃ المسلمین کا وہ عَلَم لہرایا اور خلافت کی تحریک شروع کر دی۔ بتایا جاتا ہے کہ ان دنوں امان اللہ خان کے بھائی نصر اللہ خان بھی قبائلیوں کی پشت پناہی کر رہے تھے اور ترکوں کا ایک کرنل خیرات بے اور ایک ڈرل انسٹرکٹر عابدین بھی تیراہ آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے خلافت کے رضاکار بھرتی کیے اور انھیں عسکری تربیت دی۔ ان رضاکاروں میں اکثریت ان محسود اور آفریدی جانبازوں کی تھی جو فرنگی کی ملازمت ٹھکرا چکے تھے۔

اس پر سر روس کیپل نے افغان حکومت سے شدید احتجاج کیا اور اسے فرنگی کی مخالفت کرنے سے روکنے کے لیے خط لکھے۔ افغان حکومت ان دنوں

خود مالی مشکلات سے دوچار تھی، اس لیے وعدے کے مطابق ان مجاہدین خلافت کی نہ تو مالی امداد کرسکی نہ انھیں اسلحہ مہیّا کرسکی ہے جس پر وادئ خیبر میں تحریک خلافت نسبتاً سرد پڑ گئی۔ بعد میں انگریز کے اکسانے پر قبائلی لوگوں نے ترک قاصدوں کو اپنے علاقے سے نکال دیا۔ البتہ علاقہ مہمند میں حاجی صاحب ترنگ زئی کی قیادت میں فرنگی حکومت کی مخالفت جاری رہی۔

بہرحال صوبے دار میر دست (یا میر مست) نے اپنی مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھیں، بعد میں ۱۹۳۰ء میں جب قصہ خوانی بازار پشاور میں نہتے عوام کے جلوس پر گورا فوج نے بے دریغ فائرنگ کی تو تیراہ اور دوسرے علاقوں کے مسلمان بھی مشتعل ہو گئے۔ ۱۱ر مئی کو مداخیل اور خداخیل وزیریوں نے دتّا خیل کی فوجی چوکی پر حملہ کرکے انگریز کو بڑا نقصان پہنچایا۔ بالآخر انگریز کو ہوائی جہاز بھیج کر ان علاقوں پر بمباری کرنی پڑی۔ ۱۴ر مئی کو بنوں سے ایک پورا بریگیڈ دتّا خیل بھیجا گیا تب کہیں جاکر قبائلی مجاہدین منتشر ہوئے۔

آفریدیوں نے ۲ر مئی کو باغ کے مرکزی مقام پر ایک بہت بڑا جرگہ بلایا اور انگریز کے خلاف جہاد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر معمّر لوگ تو مصلحت سے کام لینے کے حامی تھے تاہم نوجوان طبقہ کے جذبات قصّہ خوانی فائرنگ کی وجہ سے بڑے مشتعل تھے۔ جون ۱۹۳۰ء کے آغاز میں سات ہزار مسلّح آفریدیوں کا لشکر پشاور کی طرف بڑھا تو انگریز کے ہوائی جہاز حرکت میں آ گئے تاہم آفریدی لشکر باڑہ اور دوسرے راستوں سے بچتا بچاتا سوڑیزئی اور زنڈئی خوڑہ کے نواح میں پہنچ گیا۔ ۹ر اگست ۱۹۳۰ء کو آفریدی لشکر نے شہر کے ریلوے سٹیشن کے پاس خوراک کے فوجی ذخیرہ (لکڑی گودام) پر ہلّہ بول دیا۔ گودام کے آہنی گیٹ توڑ دیے گئے۔ گودام میں متعیّنہ گارڈز کو بے دست و پا

بنا دیا گیا۔ یہاں بھی انگریز نے ہوائی جہازوں اور آرمرڈ کاروں کی مدد سے مجاہدین کو منتشر کیا ورنہ وہ سارے شہر پر قابض ہو جاتے۔

اس مرتبہ بھی تحریک جہاد کی باگ دوڑ میر دست خان آفریدی اور رضاکاران خلافت کے ہاتھ میں تھی۔ دو اکتوبر ۱۹۳۰ء کو چیف کمشنر نے مصالحت کی غرض سے آفریدی جرگہ بلایا تو رضاکارانِ خلافت نے جرگہ ممبروں کے گھروں کا محاصرہ کر لیا تاکہ وہ اس جرگہ میں شامل نہ ہو سکیں۔ اس طرح یہ جرگہ کامیاب نہ ہونے پایا۔

فرنگی نے ان حملوں کا الزام لگا کر آفریدی علاقہ کھجوری پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں گاندھی اردن سمجھوتہ کے تحت تمام گرفتار شدہ لوگوں کو رہا کر دیا گیا۔ خان عبدالغفار خان بھی وطن واپس آ گئے تاہم کھجوری کا میدان بدستور فرنگی کے تسلط میں رہا۔ گاندھی جی کو اس میدان کی واپسی کے لیے کہا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آفریدی تو تشدد کے ملزم ہیں، میں تشدد میں ملوث لوگوں کی سفارش کیسے کر سکتا ہوں؟

مولانا محمد عرفان مانسہروی

صوبہ سرحد کے حریت پسندوں کو دبانے کے لیے فرنگی حکومت عجیب وغریب حربوں کا سہارا لیتی تھی۔ قوانین جرائم سرحد (ایف۔سی۔آر) ایسا ہی ظالمانہ قانون تھا حکومت اس قانون کے تحت جسے چاہتی جیل میں بند کر دیتی۔ نہ اس کے خلاف کوئی اپیل تھی نہ کوئی دلیل سنی جاتی۔ تحریکِ خلافت نے ہزارہ میں جڑیں پکڑیں تو وہاں کے مولانا محمد اسحٰق اور محمد عرفان کو جلاوطنی کا حکم سنا دیا گیا۔ چودہ پندرہ برس تک یہ دونوں معزز اور محترم علما دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم کے دورِ وزارت میں یہ پابندی ختم ہوئی تو دونوں رہنماؤں نے صوبہ سرحد آنے سے انکار کر دیا۔ محمد اسحاق نے زندگی کے باقی ماندہ دن راولپنڈی میں گزارے تو مولانا محمد عرفان بمبئی کے دفتر مرکزی خلافت کمیٹی ہی کے کسی کونے میں پڑے رہتے اور وہیں پر ۱۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) کے دل میں مولانا محمد عرفان کی اتنی قدر تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کی جدائی پسند نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر شیر بہادر خاں مؤلف "تاریخ ہزارہ" کا کہنا ہے کہ مولانا محمد عرفان مانسہرہ کے علماء میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ۲۰-۱۹۱۹ء میں انھوں نے تحریک خلافت کے جھنڈے تلے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ اردو زبان کے فصیح و بلیغ اور پرجوش مقرر تھے۔ بولنے پر آتے تو گھنٹوں بولتے ہی جاتے۔ ان کا ایک ایک لفظ

دلوں میں اترتا جاتا تھا، لوگ پہروں بیٹھے ان کی تقریر سنتے۔ ان کا پورا نام ابوالمعارف محمد عرفان تھا۔ ذات کے تنولی تھے اور موضع پھوال تحصیل مانسہرہ ان کا وطن تھا۔

ابتدائی تعلیم اپنے ہاں کے دینی مدرسوں میں حاصل کرنے کے بعد ہندوستان گئے اور ملک بھر کے نامور علماء سے فیض پایا۔ فارغ التحصیل ہونے پر دہلی، بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے خلافت اسلامیہ کی بحالی کے لیے تحریک شروع کی تو مولانا محمد عرفان نے دینی فریضہ سمجھ کر اس جہاد میں حصہ لیا۔ وہ اکثر اوقات دوروں میں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ رہتے۔ مولانا جوہر بھی ان کی بڑی قدر کرتے۔ دونوں کا دن رات کا ساتھ تھا۔ کئی بار جیل گئے۔ بہت ہی مستقل مزاج انسان تھے۔

صوبہ سرحد کی حکومت نے انھیں جلاوطن کیا تو مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے انھیں اپنے پاس بلالیا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو مکہ مکرمہ میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس ہوا تو اس میں سلطان عبدالعزیز بن سعود کی دعوت پر مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد شعیب کے علاوہ مولانا محمد عرفان نے بھی شرکت کی۔ وہ علی برادران کے اتنے معتمد تھے کہ انھوں نے مرکزی جمعیت خلافت کا دفتر مولانا محمد عرفان ہی کے سپرد کر دیا اور وہی مدتوں اس کا دفتری کام انجام دیتے رہے۔

۱۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو صبح دس بجے کے قریب بمبئی کے اسی دفتر میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ موت آئی بھی تو اسی راہ میں جو ان کا پسندیدہ راستہ تھا۔

○

چمنئی خان

وہ ایک رئیس ابن رئیس تھا۔ نیک سیرت اور نیک دل نوجوان تھا، لیکن حالات نے اسے قاتل اور مفرور بنا دیا ـــ اس نے تہیّہ کر لیا کہ ملک و ملّت کے ہر دشمن کے خلاف جہاد کرے اور ہر غاصب اور استحصالی قوت سے ٹکرلے۔ چمنئی خان کی داستان دلچسپ بھی ہے اور رنگین بھی۔

یہ ۱۸۹۲ء کی بات ہے۔ ضلع پشاور کے مشہور قصبہ بٹگرام کے رئیس سکندر خان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ـــ اس سے پیشتر اس کے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں تھیں۔ اس لیے پہلے بیٹے کی پیدائش پر وہ جتنی بھی خوشیاں مناتا وہ کم تھیں ـــ نومولود کا نام تاج محمد خان رکھا گیا لیکن گھر بار میں اُسے ہر کوئی لاڈ سے "چمنئی" کہہ کر بلاتا۔ بڑا ہوا تو دستورِ زمانہ کے مطابق اسے ابتدائی تعلیم کے لیے مقامی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی گاؤں کے پرائمری سکول میں بھی پڑھتا رہا ـــ تاہم انگریزی سے اسے چڑ تھی اس لیے آگے نہ پڑھا۔

چمنئی خان کی جوانی ایک مثالی جوانی تھی۔ وہ ہزاروں میں سے ایک تھا نکلتا ہوا قد، گٹھا ہوا جسم، تیکھے نقش، باز کی سی آنکھیں، کھلتا ہوا رنگ، ہر دیکھنے والا اس جوانِ رعنا کی تعریف کیے بغیر نہ رہتا۔

ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تو تھا ہی جلد شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔

لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس کی بیوی ایک ننھا منّا بیٹا چھوڑ کر جلد ہی چل بسی۔ انہی دنوں اس کا والد سکندر خان بھی وفات پا گیا۔ چمنئی خان پر اچانک ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ ادھر اسے اکیلا دیکھ کر حاسدوں اور مخالفوں نے بھی سر اٹھایا۔ اپنے ہی گاؤں کا ایک شخص حامی خان (جو انگریزی سرکار کا پروردہ تھا) چمنئی خان کی مخالفت میں پیش پیش نظر آنے لگا۔ یہ وہ دن تھے جب ملک بھر میں تحریک خلافت کا چرچا تھا۔ فرنگی کی غلامی سے تنگ آئے ہوئے مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر کابل کو ہجرت کر رہے تھے، نوجوان چمنئی خان بھی ہجرت کر کے مہاجروں کے ایک قافلہ میں شامل ہو کر افغانستان پہنچا۔ راستے میں اس نے اہل قافلہ کو ڈاکوؤں سے بچانے کی خاطر بڑی جرأت اور پامردی کا مظاہرہ کیا جس پر سب اہل قافلہ اس کی عزت کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ہجرت کی تحریک ٹھنڈی پڑ گئی تو دوسرے لوگوں کی طرح چمنئی خان بھی واپس اپنے گاؤں کو آ گیا۔ سرکاری ایجنٹ پھر اس کے پیچھے لگ گئے لیکن چمنئی خان نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ کچھ عرصہ بعد غازی نادر شاہ نے افغانستان میں بچہ سقّہ کے خلاف لڑائی لڑی تو چمنئی خان جلال آباد پہنچ کر غازی نادر شاہ کے لشکر میں شامل ہو کر داد شجاعت دیتا رہا۔ واپس آیا تو حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی کے مجاہدوں میں شامل ہو گیا اور کئی محاذوں پر فرنگی کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔

مالاکنڈ کے مغرب میں نارنجی کے مقام پر فرنگیوں اور مسلمان مجاہدوں کے مابین زبردست جنگ ہوئی۔ مجاہدین کی قیادت اس کے مشہور عالم دین اور سرفروش مجاہد فقیر صاحب النگر کر رہے تھے۔ چمنئی خان نے اس جہاد میں بھی حصہ لیا۔ اب وہ زیادہ تر قبائلی علاقہ ہی میں رہتا۔ کبھی کبھی گھر کی یاد ستاتی تو چپکے سے آتا اور گھر والوں سے مل کر چلا جاتا۔ حکومت نے اسے مفرور قرار دے دیا۔

گرفتار ہوا تو جیل بھیج دیا گیا۔ اپیل پر رہا ہو کر گھر آیا تو چین سے نہ بیٹھ سکا۔ ۱۹۳۵ء میں ایک سڑک کی تعمیر پر فرنگی حکومت اور مہمند غازیوں میں ٹھن گئی۔ چمنئی خان بھی شریک جہاد ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب فرنگی نے اپنے ہی نہتے عوام پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی۔ چمنئی خان نے ایک پہاڑی چوٹی سے ایک ہوائی جہاز کو اس مہارت سے نشانہ بنایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر آ رہا۔ اس پر چمنئی خان کی بڑی شہرت ہوئی۔

ان دنوں چمنئی خان کی بیوی بیمار تھی اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ اسے دیکھنے چھپتے چھپاتے بٹگرام آیا لیکن اس کے اپنے ہی ایک ساتھی نے (جسے فرنگی نے انعام کا لالچ دے کر رام کر لیا تھا) رات سوتے میں اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

(ماخوذ۔ عبدالکافی ادیب)

○

شہدائے تحریکِ پاکستان

۱۹۴۷ء تحریکِ آزادی کا ایک فیصلہ کن سال تھا، سیاسی جدوجہد اپنے عروج پر تھی، تاہم ہندو مسلم کشیدگی بھی انتہائی خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ہندو سرمایہ داروں نے ملک بھر کی ہندو آبادیوں کو اسلحہ خانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ جن سنگھ، ہندو مہاسبھا اور اکالی دل کے سُورما کھلے بندوں دندناتے پھرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں صوبہ بہار کے سات اضلاع میں انتہائی بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں جن میں ہزارہا مسلمان مارے گئے۔ مرنے والوں میں اسّی فی صد عورتیں اور بچے تھے۔ چار مہینوں میں کوئی چھپن بلوے ہوئے۔ خود کانگرسی لیڈر بھی اس سفاکی پر توبہ توبہ کر اُٹھے۔

"فسادات کے سلسلے کا آخری معرکہ گڑھ مکتیسر تھا، جہاں کُمبھ کے میلے میں کئی لاکھ یاتری مقدس گنگا میں اشنان کرنے اور پاپ دھونے جمع ہوئے تھے۔ میرٹھ، مرادآباد اور گرد و نواح کے دو چار ہزار مسلمانوں نے حسبِ سابق میلے پر دکانیں لگائی تھیں۔ ہندو سورماؤں کا لشکر پہلے پہل ان پر حملہ آور ہوا، پھر قصبے کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا، ضلع کانگرس کے صدر ایک مسلمان تھے اور بڑے راسخ العقیدہ کانگرسی ـــــ عدمِ تشدد کے اس پجاری نے مسلمانوں سے اسلحہ لے کر خود پولیس کے پاس جمع کرایا تھا۔ بلوائیوں نے سب سے پہلے انہی کو نشانہ بنایا اور بیوی بچوں

سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا، پھر سینکڑوں مسلمانوں کو ہلاک اور ان کی بہو بیٹیوں کو بے آبرو کیا گیا ——— کئی دن تک مسلمان بیبیوں کی گلی سڑی لاشیں کنوؤں سے نکالی جاتی رہیں۔[1]"

یہ واقعہ نومبر ۱۹۴۶ء کا ہے۔ سرحدی رہنما خان عبدالغفار ان دنوں دہلی میں تھے۔ گڑھ مکیستیر میں مسلمانوں کی تباہی دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں اشارے کنایے سے اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کو کہا بھی لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

صوبہ سرحد کے ہزاروں لوگ کاروبار اور محنت مزدوری کرنے کلکتہ، بمبئی، دہلی اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مقیم تھے وہ بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گئے ——— یہ کٹے پٹے اور تباہ حال لوگ اپنے اپنے آبائی دیہات کو واپس آئے اور انھوں نے ہندو سکھوں کے وحشیانہ مظالم کی خبریں اپنے بھائی بندوں کو سنائیں تو ان کا خون کھولنے لگا۔ جذبات مشتعل ہو گئے اور تھوڑا بہت ردِ عمل یہاں بھی دیکھنے میں آیا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں سندھیار (کوہستان) کے قبائلی مجاہدوں نے بٹل اور اوگی کی منڈیوں پر ہلہ بول دیا، پھر لوگوں نے مانسہرہ کے سودخوار ہندو سیٹھوں کی خبر لی، کوٹ نجیب اللہ میں بھی ایسے واقعات رونما ہوئے اور مری، راولپنڈی اور گلیات ہزارہ کے علاقے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

ان واقعات کے نتیجے میں ہندو مسلم کشیدگی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی کہ ایک دوسرے واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلمانان سرحد کے جذبات یک دم بھڑک

---

[1] تاریخ مسلمانان پاک و بھارت

اُٹھے۔ ہوا یہ کہ ہزارہ کے علاقہ گلیات کی ایک غیر مسلم دوشیزہ نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان سے نکاح کر لیا ——— ہندو سکھوں نے واویلا شروع کر دیا اور مذکورہ مسلمان پر مقدمہ کر دیا —— اس اثناء میں ہندوؤں کے ایک وفد نے صوبہ سرحد کے کانگریسی وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب پر زور دیا کہ وہ نومسلمہ ان کی تحویل میں دے دی جائے ——— ڈاکٹر خان صاحب نے ان کا مطالبہ مانتے ہوئے نومُسلمہ کو ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔

اس خبر کے عام ہوتے ہی مسلمانوں میں بڑا جوش اور اشتعال پھیل گیا۔ صوبہ سرحد کی مسلم لیگ نے تین ارکان پر مشتمل ایک وفد ڈاکٹر خان صاحب کے پاس بھیجا۔ اور انھیں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا لیکن ڈاکٹر خان صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے اور نومُسلمہ کو مسلمانوں کے سپرد نہ کیا۔

اس سے قبل پنڈت جواہر لال نہرو (عبوری حکومت کے وزیراعظم ہند) کی حیثیت سے صوبہ سرحد کا دورہ کر چکے تھے اور ہر جگہ ان کا کالی جھنڈیوں سے ان کا استقبال ہوا تھا بلکہ مالاکنڈ میں تو سرحدی مجاہدوں نے ان پر اتنے پتھر برسائے کہ مشکل ہی سے ان کی جان بچی، سیاسی فضا اس وقت تک بالکل بدل چکی تھی لیکن سرحدی کانگریس بدلے ہوئے حالات کا احساس کرنے سے قاصر تھی۔

۱۹ر فروری ۱۹۴۷ء کو صوبہ سرحد کی مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۲۱ر فروری کو چوک یادگار پر ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا جائے اور بعد میں لوگ ایک جلوس کی صورت میں ڈاکٹر خان صاحب کے پاس کے پاس پہنچ کر اس نومُسلمہ کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے۔

۲۱ر فروری کو دن کے ۲ بجے چوک یادگار پشاور زیر مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک بہت بڑا ہوا۔ جلسے سے خان فدا محمد خان، خان بخت جمال خان اور ارباب عبدالغفور خان

نے خطاب کیا، اس وقت تک پیر صاحب مانکی شریف بھی مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کے ہزاروں مرید بھی جلسوں اور جلوسوں میں سرگرم حصہ لے رہے تھے، جلسے کے اختتام پر جلوس ترتیب دیا گیا، مظاہرین وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خانصاحب کی سرکاری رہائش گاہ (فرانٹیئر ہاؤس) پہنچنا چاہتے تھے لیکن پولیس کی بھاری جمعیت نے سنٹرل جیل پشاور کے سامنے پھاٹک پر انھیں روکنا چاہا۔ جلوس پر آنسو گیس پھینکی گئی، بہت سے مظاہرین بے ہوش ہو گئے، تاہم گرتے پڑتے وہ لوگ ڈاکٹر خانصاحب کے بنگلہ پر پہنچ گئے۔

اب مظاہروں اور سول نافرمانی کا سلسلہ چل پڑا اور نہ صرف مرد بڑھ چڑھ کر ان میں حصہ لینے لگے بلکہ خواتین بھی میدانِ عمل میں نکل آئیں۔ ۱۰ / مارچ ۱۹۴۷ء سے سرحد اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا تھا۔ اس وقت تک مسلم لیگی ارکان اسمبلی میں سے بیشتر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر چکے تھے۔ رضاکاروں نے تہیہ کر لیا کہ دس مارچ کو اسمبلی ہال کے باہر زوردار مظاہرہ کیا جائے تاکہ ایوانِ حکومت میں کھلبلی مچ جائے اور اسمبلی کا اجلاس نہ ہونے پائے۔ دس مارچ کو چوک یادگار سے بہت بڑا جلوس نکلا اور اسمبلی ہال کی طرف بڑھنے لگا۔ جونہی یہ جلوس بالا حصار کے بالمقابل ریلوے پل کے پاس پہنچا۔ گورکھا فوجیوں نے اسے روکنا چاہا۔ تاہم مظاہرین بھی سر پہ کفن باندھ کر نکلے تھے، وہ بے دریغ آگے بڑھتے گئے۔ فوجیوں نے ایک فیتہ سڑک پر باندھ رکھا تھا۔ ایک فوجی افسر نے اعلان کیا کہ جو شخص فیتہ سے آگے قدم بڑھائے گا، گولی سے اڑا دیا جائے گا۔" مظاہرین اس وارننگ کے باوجود بڑھتے ہی گئے ———— کچھ دور آگے جا کر فوجیوں نے پھر فیتہ باندھ دیا اور دوبارہ وارننگ دی کہ کوئی آگے نہ بڑھے۔

نواب خان شہید

بنّی کا رضا کار نواب خاں اس وقت پرچم اٹھائے جلوس کے آگے آگے جا رہا تھا، وہ جوش کے عالم میں اور شوقِ شہادت سے سرشار نعرے لگاتا آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ فوج نے تاک کر اس پر گولی چلائی جو اس کے سینے میں لگی، خون کا فوّارہ اُبل پڑا۔ اس کے ہمراہی رضا کار اسے اٹھا کر لیڈی ریڈنگ ہسپتال لے گئے جہاں چار گھنٹے تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد نواب خان اپنے مولائے حقیقی کے پاس جا پہنچا۔

یوں نواب خان نے تحریکِ پاکستان کا پہلا شہید ہونے کا شرف حاصل کر لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا سارا گھرانہ مسلم لیگی تھا اور اس دن اس کا والد بھی اس جلوس میں شامل تھا۔ نواب جان ایک جوان سال مجاہد تھا۔ اس کی شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نواب خان اور ان کے گھرانے کے بیشتر لوگ پیر صاحب مانکی شریف کے ارادت مند تھے۔

نواب خان شہید کو بنّی ہی کے بڑے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد میں مسلم لیگی وزارت برسرِ اقتدار آئی تو نواب خان شہید کے ورثاء کو اس کی عظیم قربانی کے اعتراف میں گولڈ میڈل اور دس ہزار روپیہ کا انعام دیا گیا۔ لوگ اب تک اس شیر دل مجاہد کا ذکر فخر سے کرتے ہیں۔

محمد علی شہید

صوبہ سرحد کی کانگرسی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک دن بدن زور پکڑتی گئی۔ فضا پلٹ چکی تھی اور کانگرس پر اپنی عدمِ مقبولیت آشکارا ہو

چکی تھی تاہم وہ بزور تحریک حصولِ پاکستان کو دبانے کی ہر ممکن سعی کر رہی تھی۔ مسلم لیگ کے دفتر واقعہ گھنٹہ گھر سے آئے دن جلوس نکلتے جو سرحد اسمبلی کی عمارت کا گھیراؤ کیا کرتے تھے۔ نیشنل گارڈز کے رضاکاروں کی راہنمائی میجر خورشید انور کر رہے تھے۔ وہ بھیس بدل کر جگہ جگہ جاتے اور جلوس ترتیب دیتے، ایک ایسا ہی جلوس انھوں نے پشاور سٹی مسلم لیگ کے دفتر سے نکالا، جلوس مختلف بازاروں سے ہوتا ہوا موجودہ جناح پارک کے پاس پہنچا، شرکائے جلوس کی کوشش تھی کہ ریلوے پل کے نیچے سے گزر کر سرحد اسمبلی کا گھیراؤ کریں۔ رضاکار محمد علی آف متنی سبز ہلالی پرچم اٹھائے جلوس کے آگے آگے تھے۔ جونہی جلوس اسمبلی بلڈنگ کے سامنے پہنچا، فوجی کمانڈروں نے مورچے سنبھال لیے اور لاؤڈ سپیکر پر وارننگ دی کہ "خبردار کوئی سڑک پر لگے ہوئے فیتے سے آگے نہ بڑھے، ورنہ گولی سے اڑا دیا جائے گا۔" اتنے میں میجر خورشید خود آگے بڑھا اور اس نے رضاکاروں کو للکارتے ہوئے کہا۔ "پاکستان کے شیدائیو! دیکھتے کیا ہو ---- فیتہ کیا چیز ہے، آگے بڑھو! اس پر رضاکار محمد علی پورے زور سے نعرۂ تکبیر لگاتا آگے بڑھا اور قریب تھا کہ فوجی کمانڈر پر جھپٹ پڑے کہ ہر طرف سے اس پر گولیاں برسنے لگیں ---- وہ زخموں کی تاب نہ لا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی ---- رضاکاروں نے اس شہیدِ پاکستان کا جلوس نکالا، اسے پھولوں سے لاد دیا۔ شہید محمد علی کی نمازِ جنازہ رہبرِ طریقت سید ستار شاہ بادشاہ نے قصہ خوانی میں پڑھائی۔ بعد میں اسے جلوس کی صورت میں اس کے گاؤں متنی لے جا کر دفن کیا گیا۔ پیر صاحب مانکی شریف اور دوسرے مسلم لیگی زعمائیت کے ہمراہ تھے۔ دو سال ہوئے شہید محمد علی کی عظیم خدمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے ورثاء کو گولڈ میڈل

اور دس ہزار روپیہ نقد انعام پیش کیا گیا۔

سیّد مبارک علی شاہ

پشاور کے ہشت نگری دروازہ کے اندر محلہ گڑھی سیداں میں حضرت کریم شاہ بخاری کے اخلاف میں سے سادات کا ایک قابلِ فخر گھرانا ہے جسے عُرفِ عام میں "ست گھرا" کہا جاتا ہے۔ اسی گھرانے کے سیّد علی عباس بخاری ان مردانِ مجاہد میں سے تھے جنھوں نے صوبہ سرحد میں منظم سیاسی سرگرمیوں کی بنا ڈالی۔ اس گھرانے کے سیّد صابر علی شاہ، سید اعجاز حسین بخاری اور سید مبارک علی شاہ بھی قومی تحریکوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ تحریکِ حصولِ پاکستان کے دنوں میں ارد گرد کی خواتین ان کے ہاں جمع ہو جاتیں اور پھر جلوس کی صورت میں اسمبلی ہال، ریڈیو سٹیشن اور سول سیکرٹریٹ پہنچ کر مظاہرہ کرتیں، زنانہ جلوس کے حفاظتی دستے کے طور پر کچھ نوجوان رضاکار بھی ساتھ ساتھ رہتے۔ بیس سالہ جانبار سیّد مبارک علی شاہ کے ذمہ یہی ڈیوٹی تھی کہ وہ خاتون رضاکاروں کی نگہداشت کرے۔

ایک دن خواتین کا جلوس قلعہ بالا حصار کے سامنے ریلوے پُل سے گزر کر اسمبلی ہال کے سامنے مظاہرہ کرنا چاہتا تھا کہ پولیس اس پر ٹوٹ پڑی اور سب کو اندھا دھند گرفتار کرنے لگی۔ سیّد مبارک علی شاہ بھی گرفتار ہوئے اور انھیں سنٹرل جیل پشاور پہنچا دیا گیا۔ ان کے بھائی اعجاز حسین بخاری بھی قید خانہ میں ان کے ساتھ تھے۔ بڑے بھائی صابر علی شاہ نے برادرانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں بھائیوں کے ضمانت نامے بھرے اور جیل کے حکام کو پیش کیے۔ سید اعجاز حسین شاہ نے تو بھائی کی بات مان لی لیکن

مبارک علی شاہ جوش میں آ گئے اور کہا کہ جب تک ایک بھی مسلم لیگی جیل خانہ میں بند ہے میں باہر نہیں جاؤں گا۔" چنانچہ صابر علی شاہ انھیں جیل ہی میں چھوڑ کر گھر چلے گئے۔

تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ جیل میں ہنگامہ ہو گیا۔ مسلم لیگی کارکن کانگرسی حکومت کے مظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بیرکوں سے باہر نکل آئے، فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔ پولیس نے مظاہرین پر اس کثرت سے اشک آور گیس کے شیل پھینکے کہ قیدی بے ہوش ہو کر ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگے۔ انھی میں سے ایک شیل مبارک علی شاہ کے سر پہ گرا اور وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ پانچویں دن ان کے بھائی صابر علی شاہ کو اطلاع دی گئی کہ مبارک علی شاہ بیمار ہیں۔ وہ جیل پہنچے اور اپنے نیم جان بھائی کو گھر لے گئے، لیکن اب بات علاج سے آگے بڑھ چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے ہر چند انھیں بچانے کی کوشش کی لیکن شہادت سیّد مبارک علی شاہ کا مقدر بن چکی تھی۔ نوجوان سیدزادہ اپنے جدامجد سیدالشہدائے کربلا حضرت امام حسین کی سنت کو زندہ کرتے ہوئے ناموس ملت کے لیے جان کا نذرانہ پیش کر گیا۔ قصہ خوانی میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ شہید مبارک علی شاہ کا نام تاریخ پاکستان میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

محمد ظفر شہید

کریم پورہ پشاور میں ایک محلہ ہے "محلہ ظفر شہید" ——— یہ محلہ ہمیں تا ابد اس نوجوان مجاہد کی یاد دلاتا رہے گا جس نے اپنی زندگی پاکستان کے حصول کی مہم میں نذر کر دی اور ناموس ملت کے لیے جام شہادت نوش کیا۔

شہادت کے وقت محمد ظفر سولہ سترہ سالہ نوجوان تھے۔ اپنے والد محمد یوسف

(جو سرکاری ملازم تھے) کی وفات کے بعد وہ خاندان کے واحد کفیل تھے تاہم وہ شمع پاکستان کے پروانے تھے۔ تحریک پاکستان میں گرمی پیدا ہوئی تو ملازمت چھوڑ چھاڑ کر قلندرانہ وار مسلم نیشنل گارڈ کے رضاکاروں میں شامل ہو گئے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کا جلوس نکلا تو وہ اس میں پیش پیش تھے۔ دوسروں کے ساتھ انھوں نے بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ مجسٹریٹ نے انھیں تین ماہ قید کا حکم سنایا۔ انھوں نے دو ماہ اٹھائیس دن تک ماتھے پر بل ڈالے بغیر قید کاٹی۔ رہائی میں صرف دو دن باقی تھے کہ جیل میں ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس نے مسلم لیگی قیدیوں کو منتشر کرنے کے لیے اندھا دھند آنسو گیس کے شیل پھینکے۔ ایک شیل محمد ظفر کے پاس آن کر گرا۔ ظفر نے فوراً اُسے اٹھا لیا، اس کا ارادہ تھا کہ شیل واپس پولیس پر پھینکے، لیکن شیل اس کے ہاتھ ہی میں پھٹ گیا۔ ہتھیلی کے پرخچے اُڑ گئے۔ وہ سخت زخمی ہوا اور دوسرے ہی دن ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ ہزاروں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی جو قصہ خوانی بازار میں ادا کیا گیا۔ اپنے نوعمر بیٹے کی شہادت کے باوجود ظفر کی والدہ تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیتی رہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ظفر شہید کی خدمات کے اعتراف میں ان کے ورثاء کو گولڈ میڈل اور نقد انعام عطا کیا گیا۔

سید داؤد شاہ شہید

ہزارہ سرفروشوں اور رعنائیوں کی سرزمین ہے۔ یہ خطہ سید احمد بریلوی کی تحریک مجاہدین کا مرکز بھی رہا تو سکھوں کے خلاف مجاہدانہ سرگرمیوں کی جولانگاہ بھی۔ تحریک آزادی میں بھی اہل ہزارہ پیش پیش رہے تو تحریک پاکستان میں بھی ان کا کردار قابل قدر رہا۔ حویلیاں ہزارہ کا ایک اہم قصبہ ہے۔ ریفرینڈم کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے جب مشہور قومی رہنما راجہ غضنفر علی خان حویلیاں پہنچے

تو وہاں کے لوگوں کے قومی جوش و خروش کو دیکھ کر بڑے مسرور ہوئے اور کہا:

"اس قصبے اور گرد و نواح کے لوگوں نے تحریک پاکستان اور ریفرینڈم میں قابلِ فخر اور نمایاں حصہ لیا ہے"۔

یہ شرف بھی حویلیاں ہی کے حصے میں آیا کہ صوبہ سرحد کی کانگرسی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کے دوران اسی جگہ کے مایۂ ناز سپوت سید داؤد شاہ نے فرنگی حکومت کے فوجی سنتریوں کی گولی اپنے سینے پر کھا کر جامِ شہادت نوش کیا۔ سید داؤد شاہ سادات گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا سیّد خواجہ کریم حیدر شاہ کمبیلوی مشہور روحانی بزرگ تھے۔ وہ دربار عالیہ موہڑہ شریف کی جانب سے خلیفہ تھے۔ سید داؤد شاہ کے والد نور علی شاہ بھی عالم دین اور متقی انسان تھے۔ شہید کے چچا سید محمد اسماعیل شاہ بھی تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔

الحاج عبدالحی (سابق ممبر صوبائی اسمبلی) جو ان دنوں حویلیاں مسلم لیگ کے صدر تھے، بیان کرتے ہیں کہ جلال بابا، حکیم عبدالعزیز چشتی اور دوسرے سرگرم کارکنوں کی بدولت مسلم لیگ سرزمین ہزارہ کے گاؤں گاؤں تک پھیل گئی۔

۲۰ر اور ۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء کو ایبٹ آباد میں خفیہ اجلاس ہوا جس میں کانگرس حکومت کے خلاف سولِ نافرمانی کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف تجویزوں پر غور ہوا، کانگرسی حکومت مسلم لیگ کی اس تحریک سے اتنی ہراساں تھی کہ مولانا محمد اسحٰق خطیب جسٹس سجاد احمد جان، حکیم عبدالعزیز چشتی اور غلام جان خان طاہر خیلی پر مشتمل ۲۹ ارکان کو ۲۶ر فروری ہی کو گرفتار کر کے سنٹرل جیل ہری پور بھیج دیا گیا اور چھوٹتے ہی انھیں ایک ایک سال کی سزائے قید سنا دی گئی۔

ان رہنماؤں کی گرفتاریوں پر لوگوں میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ سول نافرمانی کی

تحریک میں تیزی آگئی اور سول نافرمانی کی مہم زور پکڑ گئی۔ جگہ جگہ حکومت کے خلاف جلوس نکلنے لگے۔ جوبلیاں میں ایک بار جلوس نکلا جس میں موضع پنجگران کے سیّد داؤد شاہ ولد سید نور علی شاہ نامی نوجوان بھی شامل تھے۔ وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سرگرم اور سرفروش سالار تھے، جلوس کے شرکاء نعرے لگاتے گورکھا کیمپ کے سامنے جا پہنچے۔ جس پر انگریز ڈپٹی کمشنر نے انھیں مخاطب کرکے گولی سے اڑا دینے کی دھمکی دی۔ لیکن سیّد داؤد شاہ کسی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خاردار تار عبور کرکے فوجی کیمپ میں جا داخل ہوئے اور ڈپٹی کمشنر کو للکارا۔ ”مارو گولی مارو! شہادت میری معراج ہے۔“ اچانک سامنے سے ایک گولی آئی اور سیّد داؤد شاہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ واقعی شہادت ان کی معراج تھی۔

ایک ذریعہ نے سیّد داؤد شاہ کی تاریخ شہادت ۲۴/اپریل ۱۹۴۷ء بتائی ہے۔

یہ درست ہے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک میں برِ صغیر کے ہر حصے کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں تاہم سول نافرمانی کے دوران شہادت پانے کا اعزاز صرف اور صرف صوبہ سرحد کے انہی پانچ سرفروشوں کے حصے میں آیا اور

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا!

○

میجر یوسف خلیل شہید

پشاور کے نواحی قصبے تہکال بالا کا ارباب خاندان نہ صرف دنیوی وجاہت کے اعتبار سے خطۂ سرحد کا ایک ممتاز گھرانا ہے بلکہ ملک و ملت کے ناموس کی خاطر قربانیاں دینے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں، جہاں اس گھرانے کے ارباب بہرام خان اور ارباب جمعہ خان نے سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہیں اسی خانوادے کے چشم و چراغ میجر یوسف خان شہید نے ۱۹۴۷ء میں اپنی جان ناموسِ اسلام پر نثار کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔

ارباب محمد یوسف بچپن ہی سے بے حد خوش خلق، مؤدب اور دیندار شخص تھا۔ وہ نماز کا بڑا پابند اور دینی شعار سے انتہائی لگن رکھنے والا نوجوان تھا۔ نہ صرف وہ پڑھنے لکھنے میں دوسروں پر سبقت لے جاتا بلکہ کھیل کے میدان میں بھی اپنے ہم عمروں سے پیش پیش رہتا، اسی لیے سکول ہی کے زمانے سے اس کے ساتھی اور اساتذہ اس کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ اسلامیہ کالج پشاور میں پہنچا تو اس کی ہر دلعزیزی میں اور اضافہ ہوا۔ اسے خیبر یونین کا صدر منتخب کر لیا گیا جو بہت بڑا اعزاز تھا۔ تقریر کرتا تو انگریز پرنسپل بھی اُس کی تعریف کیے بغیر نہ رہتا۔ فٹ بال کا نامور کھلاڑی ہونے کی وجہ سے اس کی شُہرت اور بھی بڑھی۔ وہ اپنے کالج کی طرف سے امرتسر، لاہور اور ملک کے دوسرے شہروں

میں جا کر کھیلتا اور داد پاتا رہا۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی یوسف خان کو اس کی صلاحیتوں کی بناء پر فوج میں کمیشن مل گیا — ہونہار تو تھا ہی تھوڑے ہی عرصے میں ترقی کرتے کرتے میجر کے عہدے تک جا پہنچا۔

وہ ابھی ہندوستان ہی میں متعین تھا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کا اعلان ہو گیا — وہ کچھ انگریز فوجی افسروں کے ہمراہ امرت سر کے راستے لاہور آرہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ریل گاڑی جس سٹیشن پر بھی رکتی بھارتی غنڈے تلواریں سونتے مسلمان مسافروں پر ٹوٹ پڑتے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ گاڑی امرت سر کے سٹیشن پر رکی تو غنڈوں اور فسادیوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی۔ وہ گھسیٹ گھسیٹ کر مسلمانوں کو پلیٹ فارم پر لاتے اور انھیں ذبح کر دیتے۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کو بھی معاف نہ کیا جاتا — پلیٹ فارم پر مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اور مظلوموں کی چیخیں آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔ یوسف خان نے یہ دردناک منظر دیکھا تو اس کا دل تڑپ اٹھا، اس نے اپنا ریوالور سنبھالا اور پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھی انگریز افسر اسے روکتے ہی رہے لیکن یوسف خان نے ان کی ایک نہ سنی — وہ بلا کا بہادر تھا اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا تھا۔ اس کے ریوالور کی ایک ایک گولی سے ایک ایک مفسدہ پرداز ہلاک ہوتا رہا اور — جب گولیاں ختم ہو گئیں تو یوسف خان خالی ہی ان پر پل پڑا — دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے سکھوں کی تلواریں اس کے جسم میں پیوست ہوتی گئیں اور یوں وطن سے دور — اجنبی سرزمین پر یوسف خان ناموس اسلام پر اپنی جان قربان کر گیا۔

تہکال بالا میں عزیز و اقارب یوسف خان کے پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن یوسف خان پہنچا تو اس نے خونین خلعت پہن رکھا تھا۔ جسم زخموں سے چُور تھا لیکن اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس کی میت پر نُور برس رہا تھا۔ جس نے دیکھا یہی کہا۔

"یوسف خان زندہ ہے" ——— "یوسف خان زندہ ہے" اس لیے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔

مولانا سیف الرحمٰن

علمائے حق ہمیشہ اسلام کی شمشیر برہنہ رہے ہیں، جب بھی ملت پر کوئی کڑا وقت آیا علمائے حق ہمیشہ سینہ تان کر آگے بڑھے اور ہر اسلام دشمن قوت کے ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ بیسویں صدی کا دوسرا عشرہ مسلمانانِ عالم کے لیے ایک کٹھن زمانہ تھا۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے ثابت کر دیا تھا کہ یورپ کی کافر قومیں خلافتِ اسلامیہ کو ختم کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ ان کے مقابلے میں اسلامی حکومتیں جمود و زوال کا شکار تھیں۔ ایسے میں اگر علمائے حق مجاہدانہ جذبے سے میدان میں نہ نکلتے تو مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ تک، کفار کے زیر نگیں چلے جاتے۔ ایسے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا سیف الرحمٰن، مولانا فضلِ ربی، مولانا محمد اسحٰق مانسہروی اور دوسرے نامور علماء نے ۱۹۱۴ء میں "تحریک حزب اللہ" کی بنیاد رکھی۔ اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ آزاد قبائل سرحد میں ایک مشترکہ مرکز جہاد قائم کیا جائے جہاں سے مختلف محاذوں پر انگریزوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس تحریکِ جہاد کو فعال بنانے کی غرض سے حاجی صاحب ترنگ زئی کو "رئیس المجاہدین" کا خطاب دیا گیا اور مولانا عزیر گل کو خصوصی ایلچی بنا کر مولانا محمود الحسن کی طرف سے ان کے پاس بھیجا گیا۔ مولانا سیف الرحمٰن نے بھی اس موقع پر شاندار خدمات انجام دیں اور

صوبہ سرحد کے قبائل اور افغانستان کے لوگوں میں اسلامی جذبہ جہاد کو فروغ دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

مولانا سیف الرحمن الکوزئی پشاور کے مشہور قصبے شبقدر کے نواحی گاؤں متھرا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ہندوستان کی ریاست ٹونک چلے گئے اور بارہ برس تک وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے، فارغ التحصیل ہوئے تو وہیں ایک دینی مدرسہ میں پڑھانے لگے۔ بعد میں دہلی چلے آئے اور مسجد فتحپوری میں شیخ الحدیث کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے۔ دہلی ہی کے قیام کے دوران وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے بے حد متاثر ہوئے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی قیادت میں غلبۂ اسلام کے لیے کام کرنے لگے۔

مولانا سیف الرحمن نہ صرف ایک جید عالم دین تھے بلکہ بڑے مدبّر اور اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے۔ تنظیمی کاموں میں انھیں بڑی مہارت تھی۔ حسن سیرت کے ساتھ ساتھ حسنِ صورت سے بھی اللہ نے نوازا تھا، جو ان سے ملتا ان کی مقناطیسی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ۱۹۱۴ء میں یورپ میں پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے خلافتِ ترکیہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ترکوں پر حملے سے برصغیر کے مسلمانوں کے دل تڑپ اٹھے۔ علمائے حق میدان میں اترے اور انھوں نے انگریز کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ دوسری طرف انگریز نے اپنے زرخرید علماء سے یہ فتویٰ حاصل کر لیا کہ ترکی پر حملہ جائز ہے۔

یہی وہ دن تھے جب مولانا محمود الحسن نے تحریک حزب اللہ کی بنیاد رکھی، تحریک کے اجلاس میں طے پایا کہ مولانا محمود الحسن خود حجاز مقدس کو روانہ ہو جائیں اور وہاں کے ممتاز علماء سے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ حاصل کریں۔ مولانا عبیداللہ سندھی افغانستان جائیں اور وہاں کی حکومت کو فرنگی کے خلاف جہاد

کے لیے آمادہ کریں اور مولانا سیف الرحمٰن پشاور جائیں اور حاجی صاحب ترنگ زئی سے مل کر سرحدی قبائل میں جہاد کے لیے تبلیغ کریں۔

مولانا سیف الرحمٰن بھیس بدل کر علاقہ آزاد مہمند میں حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی سے ملے اور انھیں شیخ الہند کا پیغام پہنچایا۔ ۱۲ر جون ۱۹۱۵ء کو انھوں نے پشاور میں حکیم اسلم سنجری کے مکان پر تحریک حزب اللہ کے اس اجلاس میں حصّہ لیا جس کی صدارت حاجی صاحب ترنگ زئی نے کی تھی اور جس پر مولوی عبدالعزیز مخفی، مولانا فضلِ ربی آف پکھلی، قاری عبدالمستعان، حکیم اسلم سنجری اور دوسرے ارکانِ تحریک بھی شریک ہوئے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب حاجی صاحب ترنگ زئی کی گرفتاری کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ ۱۸ر۔۱۹ر جون ۱۹۱۵ء کو حاجی صاحب کی اہلیہ کا چہلم تھا، دُور دُور سے ان کے ارادت مند ترنگ زئی میں جمع تھے۔ حاجی صاحب نے اپنے سرکردہ مریدوں کو بلایا۔ انھیں جہاد کے بارے میں ہدایات دیں اور رات کی تاریکی میں گھوڑوں پر سوار اپنے رفقاء سمیت قبائلی علاقے کو روانہ ہو گئے۔ انگریز کو خبر ہوئی تو انھیں افسوس ہوا کہ یوں حاجی صاحب کا چلے جانا بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بنے گا۔ اس لیے حکومت نے سرکردہ خوانین کا ایک وفد آزاد علاقہ میں ان کے پاس بھیجا کہ وہ واپس ترنگ زئی (پشاور) آجائیں۔ جب یہ وفد حاجی صاحب سے ملا تو مولانا سیف الرحمٰن بھی وہاں موجود تھے۔ حاجی صاحب کی ہدایت پر انھوں نے ارکانِ وفد کو ان کے رویّہ پر بے حد ملامت کی اور کہا "کہ یہ تو اسلام کے تحفظ کا سوال ہے۔ انگریز سے ہمارا مقابلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ سرزمین آزاد نہ ہو۔"[1]

---

[1] بحوالہ "حاجی صاحب ترنگ زئی" از عزیز جاوید صاحب۔

مولانا سیف الرحمان نے حاجی صاحب ترنگ زئی کی قیادت میں ہر جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس پر انگریزی حکومت ان کی جان کے درپے ہوگئی اور انھیں زندہ یا مردہ گرفتار کرنے والے کے لیے بہت بڑا انعام مقرر کر دیا۔ صوبہ سرحد کا چیف کمشنر سر روس کیپل کو اس معاملے سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے ڈپٹی کمشنر پشاور کو پاڑہ چنار سے بذریعہ تار حکم دیا کہ مولوی سیف الرحمٰن کے تمام عزیز و اقارب کو گرفتار کر لیا جائے اور ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں ۲۹ اگست ۱۹۱۵ء کو مسٹر لوبٹن، ڈپٹی کمشنر نے چیف کمشنر کو مطلع کیا کہ مولانا سیف الرحمٰن سکنہ متھرا کے وارنٹ جاری کر دیے گئے ہیں اور اس کی تمام جائیداد غیر منقولہ ضبط کر لی گئی ہے۔

حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے جہاں انگریزی حکومت نے حاجی صاحب ترنگ زئی پر مقدمہ کیا وہیں مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا عبدالعزیز پر بھی علیحدہ علیحدہ مقدمے قائم کیے گئے۔

افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان کی روش عجیب تھی، بظاہر وہ حاجی صاحب ترنگ زئی کو امداد کا یقین دلاتا تھا لیکن در پردہ اس نے انگریز کو اپنی حمایت کا یقین دلا رکھا تھا۔ اس پر حاجی صاحب نے مولانا سیف الرحمٰن کو افغانستان بھیجا۔ انھوں نے اپنی تقریروں سے وہاں کے عوام کو جہاد پر ابھارا۔ اس پر حکومت افغانستان نے مولانا سیف الرحمٰن کو جیل میں ڈال دیا۔

بعد میں جب امیر حبیب اللہ کی وفات پر امان اللہ خان برسر اقتدار آئے تو اس نے مجاہدین اسلام کی کھل کر حمایت کی۔ اس نے نہ صرف مولانا سیف الرحمٰن کو قید سے آزاد کیا بلکہ ان کی قدر افزائی کرتے ہوئے انھیں روس میں افغانستان کا سفیر مقرر کر دیا۔ مولانا سیف الرحمٰن بعد میں سعودی عرب میں بھی افغانستان کے سفیر رہے۔ بتایا جاتا ہے

کہ شاہ عبدالعزیز بن سعود اور امان اللہ خان کے مابین دوستی کا جو معاہدہ ہوا تھا وہ مولانا سیف الرحمٰن کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ امان اللہ خان کے دورِ اقتدار میں مولانا سیف الرحمٰن افغانستان کے قاضی القضاۃ بھی رہے۔ افغان حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں جاگیر بھی دے رکھی تھی۔

بعد میں افغانستان کی جو حکومتیں قائم ہوئیں، مولانا سیف الرحمان کو ان کی پالیسیوں سے اختلاف نہ تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ وطن لوٹ آئے۔ ان کی وہ جائیداد واگزار کر دی گئی جو انگریزوں نے ضبط کر لی تھی۔ مولانا سیف الرحمٰن ۱۹۵۲ء میں وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کے قریب تھی۔

مولانا سیف الرحمٰن کے ایک بھائی مولانا فضل الرحمٰن ایک عرصہ تک اسلامیہ کالج پشاور میں اسلامیات کے پروفیسر رہے جب کہ ان کے ایک اور عزیز محمد امین بائل (سابق پرنسپل حبیبیہ کالج کابل) وفاقی حکومت کے محکمہ نشر و اشاعت، امور قبائل میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے بھتیجے بیرسٹر محمد اسمٰعیل غزنوی کا شمار تحریک پاکستان کے سرگرم کارکنوں میں ہوتا ہے۔

سیّد عبدالجبّار شاہ

ستھانہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے اٹک سے کوئی تیس میل شمال کو ایک ایسا گاؤں ہے جو ایک سو سال سے زیادہ عرصہ تک صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں جہاد کا مرکز رہا۔ ساداتِ ستھانہ نہ صرف علمی اور روحانی اعتبار سے بلکہ اپنی مجاہدانہ صفات اور سیاسی بصیرت کی بنا پر سارے علاقہ میں بڑی قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ سادات کا یہ گھرانا غوث خراسان، حضرت سیّد علی ترمذی عرف پیر بابا علیہ الرحمۃ کے جانشینوں کا خانوادہ ہے۔ اسی عظیم خانوادہ میں سیّد جمال الدین افغانی ایسا انقلابی مفکر پیدا ہوا جس کے نام سے بڑے بڑے شہنشاہ اور سلطان لرزہ براندام رہتے تھے۔ اسی گھرانے سے سید اکبر شاہ جیسے مرد مجاہد اٹھے جنھوں نے ۱۸۳۶ء میں نوشہرہ کے قریب پیر سباک کے مقام پر سکھ فوجوں اور توپ خانہ کا منہ پھیر دیا۔ اور ہزارہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف اپنی اسلامی مملکت قائم کرنے کا اعلان کیا۔

سید عبدالجبار شاہ اسی مجاہد گھرانے کے مجاہد فرزند تھے۔ صوبہ سرحد کے گورنر اور مشہور مؤرخ سر اولف کیرو کا کہنا ہے کہ سید عبدالجبار شاہ نہایت عالم فاضل اور پارسا انسان ہیں۔ صوبہ سرحد کے گزشتہ دو سو سالہ تاریخی واقعات انھیں نوک بر زبان ہیں ـــــ انھوں نے سوات، بونیر اور بالائی ہزارہ کی سیاست میں عملاً حصہ لیا ہے ـــــ ان کا گھرانہ اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور مجاہدانہ کردار کی

وجہ سے سارے سوات، بونیر اور سرزمین یوسف زئی میں انتہائی احترام کا مالک رہا ہے۔"

سادات ستھانہ ہر حال میں مجاہدین سید احمد بریلوی کے ہمدرد اور غمخوار رہے۔ انھوں نے کسی مشکل سے مشکل وقت میں بھی مجاہدین کو اکیلے نہ چھوڑا۔ مجاہدین کی دوستی کی وجہ سے انھیں فرنگی حکومت کا نشانۂ عتاب بننا پڑا تو بھی انھوں نے صبر و تحمل اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا، جہادِ امبیلہ (۱۸۶۳ء) کے بعد مجاہدین کو اپنا مرکز تبدیل کرنا پڑا تو بھی ساداتِ ستھانہ نے ان کی رفاقت سے ہاتھ نہ کھینچا۔

۱۸۵۷ء میں سید اکبر شاہ (بادشاہ سوات) اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی جگہ سید مبارک شاہ کو "بادشاہ سوات" تسلیم کر لیا گیا۔ ستمبر ۱۸۷۲ء میں وہ اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے نواگئی (وادی چملہ) گئے ہوئے تھے۔ چھ گولیوں والا پستول ہاتھ میں رہتا تھا۔ انھوں نے احتیاطاً ملازم سے کہا "پستول خالی کر لاؤ۔" ملازم نے بے پرواہی کی، کوئی گولی رہ گئی۔ سید مبارک شاہ نے پستول ران پر رکھ لیا اور اپنے عزیزوں سے باتوں میں مگن رہے۔ عین اس وقت پستول کو ایک جھٹکا لگا، گولی چلی اور شہزادہ مبارک شاہ کی ناف میں پیوست ہو گئی۔ — وفات کے وقت ان کی عمر صرف ۳۶-۳۷ برس کی تھی۔

سید مبارک شاہ کے دوسرے بھائی سید شاہ محمود کو زمین کے تنازعہ پر کسی مخالف نے ۲ ستمبر ۱۸۷۸ء کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ان کی عمر اس سانحہ کے وقت کل ۴۳ سال کی تھی۔

اب خانوادہ کی سیادت سید عبدالجبار شاہ کے حصے میں آئی جو اس وقت ابھی بہت کم عمر تھے۔ وہ سید مبارک شاہ کے عمزاد اور سید اکبر شاہ کے حقیقی بھائی کے پوتے تھے۔ بچپن ہی سے انھیں اسلامی علوم کا بہت شوق تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے

علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان کی مختلف دینی درسگاہوں میں زیرِ تعلیم رہے۔ تمام علوم پر یکساں حاوی تھے۔ بعد میں انھوں نے مختلف کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب سوات اور بونیر کے تاریخی اور سیاسی حالات پر ہے۔ دوسری ان کے اپنے خانوادہ کے بزرگوں کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ریاست امب کے سیاسی واقعات پر بھی انھوں نے قابلِ قدر تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔

سیّد عبدالجبار شاہ اس عظیم خانوادے کے رُکن تھے جو روحانی عظمت کے ساتھ ساتھ سیاسی امور میں گہری بصیرت کے بھی مالک تھے۔ اس لیے سوات، بونیر اور ہزارہ کے لوگ ہر معاملے میں اس خاندان کے افراد سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ سیّد موصوف فطرتاً بھی بڑے زیرک اور مدبر انسان تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میدانِ جہاد میں بھی ہمیشہ پیش پیش نظر آتے تھے۔

۱۸۹۷ء میں جب برطانوی سامراجیوں نے ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک پر فوج کشی کی تو مسلمانانِ صوبہ سرحد کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھے اور انھوں نے چترال سے وزیرستان تک ہر جگہ انگریزوں سے جہاد شروع کر دیا۔ اس جہاد میں سید عبدالجبار نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ وہ مالاکنڈ اور چکدرہ کے محاذوں پر دادِ شجاعت دیتے رہے۔ بونیر کے ملّاں سعداللہ عرف "سرتور فقیر" اس غزا میں پیش پیش تھے۔ اور ملّاں صاحب ہڈہ، ملّا صاحب سنڈاکئی اور حاجی صاحب ترنگ زئی بھی اس کے دوش بدوش اس جہاد میں شریک تھے۔

مجاہدین بے سروسامان تھے، نہ اسلحۂ جنگ تھا نہ رسد رسانی کا انتظام، ان کے مقابلے میں برطانوی فوجیں تھیں جو اپنے دَور کی منظّم ترین اور طاقتور ترین فوجوں میں شمار ہوتی تھیں تاہم مجاہدین نے اس جوشِ ایمانی کا مظاہرہ کیا کہ دشمن دنگ

رہ گیا۔ سید عبدالجبار کا بیان ہے کہ "جس مورچے پر شدید ترین جنگ ہوئی میں اس میں موجود تھا۔ مقابلہ چھ بجے صبح شروع ہوا اور بارہ بجے تک جاری رہا۔ مجاہد صرف چند سو کی تعداد میں تھے جبکہ ان کے مقابل دو ہزار مسلح اور تربیت یافتہ فوجی سپاہی تھے ـــ تاہم فرنگی کو اس قدر شدید نقصان اٹھانا پڑا کہ اپنے سپاہیوں اور افسروں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے پچاس ساٹھ فرنگی سوار مارے گئے ـــ جب کہ مجاہدین میں سے صرف ایک غازی مرتبۂ شہادت کو پہنچا۔ باقی سب اس گھمسان کی جنگ سے سلامت نکل آئے جن میں سے ایک میں بھی تھا۔" یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت سید عبدالجبار سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھے۔

چونکہ سید مبارک شاہ کی وفات کے بعد سوات اور بونیر کے لوگوں کا کوئی متفقہ سربراہ نہ تھا اس لیے دیر کے نواب صاحب شیر ہو گئے اور سوات کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ اُدھر انگریز بھی نواب دیر کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ اس لیے قبائلی جرگہ میں صلاح و مشورہ کے بعد سید عبدالجبار شاہ ترمذی کو سوات اور بونیر کا "بادشاہ" چن لیا گیا۔ سنڈاکئے ملّا صاحب اس کارِ خیر میں پیش پیش تھے۔ ان کا مقصد اپنے علاقوں میں شرعی حکومت کا قیام تھا۔ خود انھیں علاقے میں "شیخ الاسلام" کی حیثیت حاصل تھی۔ سنڈاکئے ملّا صاحب ہی کی تحریک پر ۲۴ر اپریل ۱۹۱۵ء کو دریائے سوات کے جنوبی کنارے پر واقع بانڈئی بالا کے مقام پر چنار کے درختوں کی چھاؤں میں سیّد عبدالجبّار کی دستار بندی ہوئی اور سب نے ان کی قیادت پر اظہارِ اعتماد کیا۔

ظاہر ہے کہ سید عبدالجبار کے ذمہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس وقت تک سوات اور بونیر کے لوگ انتہائی پس ماندہ، مُنتشر اور نادار تھے۔ انھیں ایک متّحدہ قیادت کے تحت کام کرنے کا موقع بہت کم نصیب ہوا تھا۔ اس لیے اُن میں قومی

اور اجتماعی جذبے کا فقدان تھا۔ دوسری طرف ہمسایہ ریاست دیر کا حکمران بے پناہ جنگی قوت کا مالک تھا، تیسرے انگریز اس وقت تک چکدرہ میں اپنی چھاؤنی قائم کر چکے تھے جہاں سے کسی وقت بھی مجاہدین کے خلاف فوج کشی کی جا سکتی تھی۔

سب سے بڑھ کر یہ سید عبدالجبار کا مقصد اولین سوات میں اسلامی شرعی حکومت کا قیام تھا۔ ادھر انگریزوں کو اسلام کے نام ہی سے چڑ تھی۔ وہ یہ بات کہاں برداشت کر سکتے تھے کہ سوات میں شریعت محمدی کا نفاذ ہو۔ انھوں نے سوات اور اہل سوات کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ صوبہ سرحد کے اس وقت کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل نے کھل کر نواب دیر کی حمایت شروع کر دی اور دیر کی فوجیں آئے دن سوات کے دیہات پر چھاپے مارنے لگیں۔

ان بیرونی مشکلات کے علاوہ سید عبدالجبار کو اندرونی مسائل کا بھی سامنا تھا۔ چونکہ وہ سنڈاکئی ملا صاحب ہی کی تحریک اور حمایت سے سوات و بونیر کے سربراہ منتخب ہوئے تھے اس لیے ملا صاحب ہر معاملے میں دخل اندازی کرتے تھے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ملا صاحب فقیر گوشہ نشین تھے۔ وہ سیاست کے داؤ پیچ نہ جانتے تھے، اس لیے جذباتیت سے کام لیتے تھے۔ تھوڑی سی طاقت پکڑتے ہی وہ پھر انگریزوں سے کھلم کھلا ٹکر لینے لگے۔ وہ سوات کے گاؤں گاؤں میں جاتے اور وعظ کرتے کہ "اٹھو اور انگریزوں پر حملہ کر دو"۔ حالت یہ تھی کہ اس وقت اہل سوات کے پاس نہ تربیت یافتہ فوج تھی نہ اسلحہ اور نہ خوراک۔ سید عبدالجبار بھی جذبۂ جہاد میں تو کسی سے پیچھے نہ تھے لیکن وہ حقیقت پسند انسان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پوری تیاری کے بعد انگریز پر حملہ کیا جائے تاکہ اسے نکال باہر کیا جا سکے۔

جب سنڈاکئے ملّا صاحب اور سید عبدالجبار کے مابین اختلافات نے سر اٹھایا تو ایک قومی جرگہ بلایا گیا جس میں دونوں رہنماؤں نے اپنے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ سید عبدالجبار نے بتایا کہ بغیر سامانِ جنگ اور تیاری کے انگریز سے ٹکر لینا خودکشی کے مترادف ہے۔ حاضرین میں سے اکثر نے سید صاحب کی باتوں کو معقول اور حقیقت پسندانہ قرار دیا تو ملّا صاحب ناراض ہو گئے اور جرگہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ لوگوں کو چونکہ ملّا صاحب سے گہری جذباتی اور روحانی وابستگی تھی اور وہ ڈرتے تھے کہ اگر یہ خدارسیدہ ہستی ناراض ہو گئی تو علاقے پر آسمانی غضب نازل ہوگا۔ اس لیے انھوں نے ملّا صاحب کی منت سماجت کی اور انھیں واپس جرگہ میں لے آئے۔

اب ملّا صاحب کی خوشنودی کے لیے لشکر تیار کیے گئے اور انگریزی چوکیوں پر ہلّہ بول دیا گیا۔ انگریزی فوج تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ ان کے توپ خانہ نے اندھا دھند گولہ باری شروع کی تو قبائلی مجاہدین کے لیے پیچھے ہٹنے کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ خود ملّا صاحب بھی بونیر چلے گئے اور حضرت پیر باباؒ کے مزار پر ڈیرہ لگا لیا شاید ان کا یہ خیال تھا کہ اگر اہلِ سوات نے دشمن کے مقابلے میں استقامت کا ثبوت نہ دیا تو وہ اہلِ بونیر کا لشکر ترتیب دے سکیں گے۔

سید عبدالجبار ایک منجھے ہوئے حقیقت پسند مدبّر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چونکہ کھلے میدان میں انگریز کے منہ آنے کی طاقت اہلِ سوات میں نہیں ہے، اس لیے اس کی بجائے انھوں نے گوریلا طریق جنگ اختیار کیا۔ انھوں نے سوات کی طرف پیش قدمی کرنے والے انگریزی لشکر پر خفیہ پہاڑی مورچوں سے چھاپے مارنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ دوسرے انھوں نے لوگوں میں اسلامی جوش پیدا کرنے کے لیے حضرت اخون صاحب سواتؒ کے

ایک خلیفہ صاحبزادہ باباجی سے ایک فتویٰ جاری کرایا کہ چونکہ انگریزوں نے خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر چڑھائی کر دی ہے اس لیے فرنگی کے خلاف جہاد ہر مسلمان پر فرض ہو چکا ہے۔ صاحبزادہ باباجی نے اہلِ دیر کو بھی نصیحت کی کہ اگر وہ انگریز کی حمایت سے باز رہیں اور کفر کے مقابلے میں مسلمانوں کی مخالفت کر کے جہنم مول نہ لیں۔ جب یہ فتویٰ مختلف سرحدی قبیلوں میں پہنچا تو انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور مجاہدین دھڑا دھڑ صاحبزادہ باباجی کے جھنڈے تلے سوات کے لشکر میں شامل ہوتے گئے۔ اب فضا کو موافق پا کر سید عبدالجبار انگریز کے خلاف پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ انھوں نے تمام پہاڑی دروں اور کلیدی مقامات پر مورچے قائم کر لیے جہاں سے روزانہ انگریز کے کیمپوں اور فوجی چوکیوں پر حملے ہوتے۔ اب کے لشکر کی کمان سید عبدالجبار کے ہاتھ میں تھی جبکہ اس کا علَم صاحبزادہ باباجی کے پاس تھا۔ ڈوب نامی پہاڑ پر خوشمو زئی اور رامان زئی علاقوں کے مابین واقع ہے، انگریز فوجیوں سے زبردست ٹکر ہوئی۔ اس موقع پر ملّا صاحب سنڈاکئ اگلے مورچوں پر تھے۔ انھوں نے بھی روزانہ شبخون مارنے کا پروگرام اپنا کر دشمن کا قافیہ تنگ کر دیا۔

ادھر صاحبزادہ باباجی کے فتوے کا یہ اثر ہوا کہ اہلِ دیر بھی مجاہدین کا ساتھ دینے لگے۔ دن کو تو وہ چپکے رہتے اور نواب صاحب کی حمایت کا دم بھرتے لیکن اندھیرا پڑتے ہی انگریزوں کی مدد کرنے کی بجائے انہی پر چھاپے مارنے لگتے۔ ایک رات انگریزی لشکر کو بہت نقصان پہنچا تو انگریز کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے حقیقتِ حال معلوم کرنی چاہی تو پتہ چلا کہ شبخون اہلِ سوات نے نہیں بلکہ اہلِ دیر ہی نے مارا تھا جو بظاہر انگریز کے حلیف تھے۔ اس پر خود

نواب دیر بھی پریشان ہو کر رہ گیا۔

آئے دن کے جانی اور مالی نقصانات کو دیکھ کر انگریزی فوج نے سوات میں پیش قدمی کا منصوبہ ترک کر دیا اور وہ چکدرہ کے قلعہ کو واپس چلی گئی۔

انگریز کے خلاف مجاہدین سوات کی یہ جدوجہد ہی بالآخر آزادئ سوات کا پیش خیمہ بنی ــــ سوات پر اجنبی لوگوں کا سایہ پڑنے نہ پایا اور چند ہی سالوں بعد سوات میں ایک آزاد اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی ــــ سوات کے نئے فرمانروا ڈں میاں گل، شہزادہ عبدالودود اور میاں گل عبدالحق جہاں زیب نے اپنی مساعی سے سوات کو ایک خوش حال اور مثالی طور پر ترقی یافتہ ریاست بنا دیا۔

بعد میں سیّد عبدالجبّار شاہ ریاست امب دربند کے وزیر بھی رہے۔ ۱۹۵۶ء میں یہ مردِ مجاہد اپنے اللہ کے حضور پہنچ گیا۔ وہ صوبہ سرحد کے تاریخ نویس ہی نہیں تاریخ ساز مجاہد بھی تھے!

سیّد لال بادشاہ بخاری

آغا سیّد لال بادشاہ بخاری صوبہ سرحد کے صفِ اوّل کے سیاسی رہنما تھے۔ وہ اس جلوس کے قائد تھے جس پر ۲۳/اپریل ۱۹۳۰ء کو قصہ خوانی پشاور میں گورا پلٹن نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں ایک سو سے زیادہ کارکن شہید اور بہت سے زخمی ہوئے۔ لوگ عزت و احترام سے انھیں "سیّد الاحرار" کہا کرتے تھے۔

سیّد لال بادشاہ ساداتِ پشاور کے ایک سرکردہ گھرانے کے فرد تھے، ان کے والد سید مسجدی شاہ پشاور کے آسودہ حال لینڈ لارڈ تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ سید لال بادشاہ پڑھے لکھے شخص تھے۔ مشن سکول سے میٹرک کرنے کے علاوہ عربی اور فارسی پر پورا عبور رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کی لیکن سرکاری پابندیاں ان کی طبیعت پر گراں گزرتی تھیں۔ اس لیے جلد ہی مستعفی ہو گئے اور اور پشاور میں چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔

"قائدِ اعظم اور سرحد" کے مطابق ۱۹۱۹ء میں ایک بار وہ نماز جمعہ ادا کرنے مسجد قاسم علی خاں گئے۔ نماز کے بعد وہاں مجلس خلافت کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ تھا جس سے ایک جوشیلے خلافتی کارکن آغا سیّد بزرگ شاہ نے خطاب کیا۔ صدرِ جلسہ خواجہ محمد عثمان تھے۔ چونکہ حکومت خلافت کمیٹی کے صدر اور

سیکرٹری کو گرفتار کر چکی تھی۔ اس لیے جلسے میں اپیل کی گئی کہ کوئی موزوں شخصیت صدر خلافت کمیٹی کے لیے اپنی خدمات پیش کرے۔ اس پر آغا سیّد لال بادشاہ نے کھڑے ہو کر اپنا نام صدر خلافت کمیٹی کے طور پر پیش کیا۔ بعد میں جب سیکرٹری شپ کے لیے نام طلب کیا گیا تو آغا صاحب نے اپنے بیٹے سیّد محمود شاہ کا نام پیش کر دیا۔ آپ نے اپنے آبائی مکان واقع محلہ فضل حق میں خلافت کمیٹی کا دفتر قائم کر دیا اور دن رات قومی خدمت کے میدان میں سرگرم عمل نظر آنے لگے۔

آغا صاحب ایک مذہبی آدمی تھے، انھوں نے "قیام الصلوٰۃ" کی تحریک بڑی کامیابی سے چلائی، رضاکاروں کی ٹولیاں گھر گھر جاتیں اور مسلمان عوام سے باجماعت نماز ادا کرنے کا عہد لیتیں۔ ہر گلی کوچے میں سیّد چن شاہ قلندری کے ترانے سننے میں آتے کہ

چل مسیت نماز گزار

بے نمازی جد مر جاسی   اُس دا جنازہ کوئی نہ چاسی

گھر وِچ پیار رہسی مردار   چل مسیت نماز گزار

لوگ یوں بھی آغا صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سیاسی زندگی میں آنے سے اُن کے وقار میں اور اضافہ ہو گیا۔ کوئی قومی تحریک اُن کے بغیر کامیاب ہونے نہ پاتی۔ اس طرح ان کو پشاور کے بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ خلافت، ہجرت اور ترکِ موالات سبھی تحریکیں آپ ہی کے دم قدم سے کامیاب ہوئیں اور انہی کی کوششوں کی بدولت میونسپل کمیٹی کے پہلے انتخاب میں بھی پیر بخش خان ایڈوکیٹ اور سردار عبدالرب نشتر خلافت کمیٹی کے ٹکٹ پر میونسپل کمشنر منتخب ہو گئے۔

جب ۱۹۳۰ء میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک چلی اور شراب خانوں اور قحبہ خانوں پر پکٹنگ کا پروگرام بنایا گیا تو برطانوی حکومت حرکت میں آگئی۔ اس نے ۲۲ اور ۲۳ اپریل کی درمیانی رات کو پشاور کے قریباً سبھی قومی کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا، تاہم اس تحریک کے قائد اور ڈکٹیٹر سید لال بادشاہ، غلام ربانی سیٹھی اور اللہ بخش برقی نے رات کو گرفتاری نہ دی۔ صبح جب پولیس انھیں گرفتار کر کے بس میں تھانہ کابلی لے جا رہی تھی تو کسی نے چوک یادگار میں بس کا ٹائر پنکچر کر دیا، جس پر جلوس اور سیاسی رہنما پیدل ہی تھانہ کابلی کو چل دیے۔

جوں ہی یہ جلوس قصہ خوانی بازار پہنچا گورا فوجیوں نے آرمرڈ کاروں سے اس پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ سینکڑوں بے گناہ شہید ہوئے۔ ہر طرف کہرام مچ گیا اور سارے صوبے میں سیاسی ورکروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اس ظالمانہ کارروائی کی گونج لندن کی گول میز کانفرنسوں میں بھی سنی گئی اور دنیا بھر کی مہذب قوموں نے فرنگی استبداد کی کھل کر مذمت کی۔

۱۹۳۶ء میں قائداعظم محمد علی جناح پہلی بار سرحد کے دورے پر آئے تو آغا سید لال بادشاہ بخاری اور پیر بخش خان ایڈوکیٹ ہی کی دعوت پر آئے۔ قائداعظم کے جلسے، جلوس اور قیام کا اہتمام سید لال بادشاہ ہی کے ذمہ تھا۔ جب تک دم میں دم رہا، آغا صاحب انتہائی خلوص اور ایثار سے قوم کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔

انھوں نے وفات پائی تو سارا شہر جنازے میں شرکت کے لیے امنڈ آیا۔ انھیں پشاور شہر کے مشہور ولی اللہ حضرت جی فضل احمد مجددی علیہ الرحمۃ کے احاطۂ مزار میں دفن کیا گیا۔

ان کے صاحب زادے سید اقبال شاہ بخاری ایڈووکیٹ تحریک پاکستان کے جیالے کارکن اور ایک پرجوش سماجی رہنما ہیں۔

○

حاجی محمد امین مجاهد

دورِ حاضر کے پختون علمائے کرام میں فخرِ کشمیر حاجی محمد امین مرحوم صدر جماعت ناجیہ نہایت بلند مقام کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت عالم دین بھی تھے اور مجاہد فی سبیل اللہ بھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید رہا تو دوسرے میں بندوق۔ ان کی نعتوں سے عشقِ رسول انام جھلکتا ہے تو ان کے مجاہدانہ کارناموں سے قرنِ اوّل کے غازیانِ اسلام کی شان آشکارا ہوتی ہے۔

حاجی محمد امین خیبر ایجنسی کے شنواری قبیلہ کی ملخیل شاخ سے تعلق رکھتے تھے وہ ۱۸۹۵ء میں محمد اسد خان کے ہاں شیخ محمدی ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں انھیں مقامی سکول میں داخل کیا گیا جہاں انھوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ پھر دینی علوم کی تحصیل کی طرف مائل ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی روحانی استعداد بڑھانے کی طرف بھی توجہ دی۔ چنانچہ وہ سات برس تک جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک کے شیخ الحدیث مولانا سید بادشاہ گلؒ کے والد ماجد سید مہربان علی شاہ بخاری کے زیرِ تربیت رہے۔ بعد میں انھوں نے تیراہ کوہاٹ کے عالم باعمل ملا صاحب کربوغہ شریف سے روحانی فیض حاصل کیا۔ اس دوران انھیں دو مرتبہ حج بیت اللہ شریف کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں جب گورا فوج کے سپاہیوں نے قصہ خوانی پشاور میں نہتے عوام پر گولی چلا کر ایک سو نو (۱۰۹) مسلمانوں کو شہید کر دیا تو حضرت حاجی محمد امین

فرنگی کے خلاف محاذ قائم کرلیا، انھوں نے غازیوں کا ایک لشکر جمع کرکے سرکاری دیہات پر حملے کیے۔ تین دن رات یہ معرکے جاری رہے۔ ان میں ایک انگریز جرنیل اور دو فوجی مارے گئے جبکہ مجاہدین کی جانب سے شیخ محمدی کا ایک طالبعلم خان گل شہید ہوا۔ لبعد میں انگریز نے انھیں دھوکہ سے گرفتار کرکے قید کردیا۔ رہا ہوتے ہی حاجی محمد امین علاقہ آزاد مہمند میں مشہور مجاہد حاجی صاحب ترنگ زئی کے پاس پہنچ گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے نحقی کے مقام پر انگریز کے خلاف جہاد میں حصہ لیا جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی اور نصرت سے نوازا۔

حاجی محمد امین ایک مجاہد بھی تھے اور مصلح قوم بھی، پشاور شہر سے طوائفوں کا بازار ختم کرنے میں ان کی کوششوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ ۱۹۴۶ء میں انھوں نے اصلاح رسوم اور تبلیغ جہاد کے لیے "جماعت ناجیہ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کا مرکز عمرزئی (چارسدہ) قرار پایا۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے تہکال بالا کے بزرگ سیاستدان ارباب عبدالغفور خان کے ہمراہ جہاد کشمیر میں بھرپور حصہ لیا۔ اس جہاد میں ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں "فخر کشمیر" کا خطاب اور ان کے مجاہد ساتھیوں کو بہادری کی سندات عطا کی گئیں۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کے ضمن میں بھی ان کی خدمات بڑی قابل قدر ہیں۔ ایک بار انھوں نے صدر سکندر مرزا کو دامن سے پکڑ کر مطالبہ کیا کہ وطن عزیز میں اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں۔

حضرت حاجی محمد امین ایک سچے عاشق رسول تھے۔ انھوں نے پشتو نعتوں کے کئی مجموعے اور دینی کتابیں چھوڑی ہیں۔ ۳۱ مئی ۱۹۵۸ء اس مجاہد ملت کا یوم وفات ہے۔ انھیں مجاہد آباد، عمرزئی، چارسدہ ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔

قاضی عبدالولی خان

قاضی عبدالولی خان وہ عظیم مردِ مجاہد تھے جو ساری عمر اپنے قلم، اپنی زبان اور اپنی تلوار سے فرنگی سامراجیوں کے خلاف مصروفِ جہاد رہے ــــ ان کی ذات کو اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کی شخصیت میں وہ مقناطیسیت تھی کہ جو انھیں دیکھتا یا ملتا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا ــــ وہ جہاں اور جس محفل میں جاتے اس پر چھا جاتے ــــ اپنی عمرِ عزیز کا زیادہ تر حصہ انھوں نے جلا وطنی میں گزار دیا۔ غلام ملک میں واپس نہ آنے کا عہد کر رکھا تھا ــــ قیام پاکستان کے بعد پشاور لوٹے تو زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

قاضی عبدالولی خان ۱۸۸۰ء میں پشاور کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو اپنے علم و فضل اور دنیوی وجاہت کے اعتبار سے ممتاز رہے۔ ان کے والد کا نام قاضی محمود خان تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے فاضل والد سے حاصل کی جو انگریز افسروں کو پشتو اور اردو سکھانے پر مامور تھے۔ قاضی عبدالولی خان بھی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آفیسر منشی کے طور پر کام کرتے رہے۔ انھیں انگریزی اور دوسری زبانوں پر بھی کامل عبور تھا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ برصغیر کی مشہور فوجی تربیت گاہ سٹاف کالج کوئٹہ میں اردو، فارسی اور پشتو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بقول

جناب اللہ بخش یوسفی تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی قابلیت کا شہرہ سمندر پار برطانیہ تک جا پہنچا اور انھیں لندن یونیورسٹی میں فارسی کی "چیئر" (مسند) پیش کی گئی۔ تاہم ابھی لندن جانے نہ پائے تھے کہ ہز ہائی نس سلطان جہان بیگم آف بھوپال نے انھیں اپنے ہاں سٹاف آفیسر اور اے۔ ڈی سی کے طور پر ریاست میں بلا لیا۔ وہ اپنے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ ریاست کے فوجی سیکرٹری اور ولی عہد ریاست شہزادہ عبید اللہ خان کے اتالیق کے منصب پر بھی فائز رہے۔

نوجوان قاضی ولی خان شہرت کی بلندیوں پر تھے اور ان کے لیے عزت و دولت کے تمام دروازے کھلے تھے لیکن ان کے دل میں اسلام کی سچی محبت اور مسلمانوں سے گہری ہمدردی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی جنگ طرابلس چھڑی اور فرنگی نے مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا قاضی عبدالولی خان اتنے اونچے منصب پر لات مار کر ایک رضاکار کے طور پر ترک لشکر میں شامل ہو گئے۔ فرنگی کے خلاف دادِ شجاعت دیتے ہوئے ایسے کاری زخم آئے جو ہر ممکن علاج کے باوجود عمر بھر مندمل نہ ہوئے اور تکلیف کا باعث بنے رہے۔

قاضی ولی خان میں یہ خوبی تھی کہ جو دیکھتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ترکی میں تھے تو انور پاشا (جو بعد میں اپنے ملک کے وزیر جنگ بنے) سے دوستی کا رشتہ جوڑا۔ انور پاشا زندگی بھر ان کی عزت کرتے رہے۔

بتایا جاتا ہے کہ جب قاضی صاحب ترکی سے واپس پشاور آئے تو اہل شہر نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر بھی ان کے دوست سید علی عباس پیش پیش تھے۔ جنگ عظیم چھڑی تو انگریز نے اپنے تمام سیاسی مخالفوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ قید کے دوران انھیں کچھ عرصہ چھندواڑہ کی اس جیل میں رہنے کا موقع ملا جہاں مولانا محمد علی جوہر اسیری کے دن گزار رہے تھے۔

قید سے رہا ہوئے تو رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں لگ گئے۔ فعال انسان تھے۔ ایک پل کے لیے بھی چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ مئی ۱۹۱۹ء میں پشاور شہر سے اپنے مسکن پشاور صدر کو آ رہے تھے کہ کسی "محرم راز" نے انھیں بتا دیا کہ فرنگی حکومت آج رات آپ کو گرفتار کر رہی ہے۔ اس پر گھر آنے کی بجائے وہ درہ کوہاٹ کے راستے کابل جا پہنچے جہاں ان دنوں ان کے دوست سید علی عباس بھی مقیم تھے۔

ان دنوں ہجرت کی تحریک چل نکلی اور لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر کابل کی طرف کوچ کرنے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں ہزاروں بے سر و سامان لوگ افغانستان میں جمع ہو گئے لیکن حالت یہ تھی کہ افغانستان کے سیاسی اور اقتصادی حالات نہایت ابتر تھے۔ اس لیے افغان حکومت اتنے مہاجروں کو آباد کرنے کے ہرگز قابل نہ تھی۔ قاضی ولی خان نے حتی المقدور مہاجرین کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک قومی کارکن شوکت عثمانی نے، جو خود بھی ہجرت کر کے جانے والوں میں شامل تھے۔ اپنی تصنیف "پشاور سے ماسکو" میں قاضی ولی خان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"...... قاضی ولی خان قوم پرست عناصر کے ترجمان اور نمائندے تھے، وہ بڑے مدبر انسان تھے .... دوسرے دن مہاجرین اور دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کو قاضی ولی خان کی طرف سے ایک ضیافت میں مدعو کیا گیا ـــــ مولانا عبیداللہ سندھی بھی وہاں موجود تھے اور مولوی عبدالحق نامی ایک اور شخص بھی، جو لیڈری کا دم بھرتے تھے اور اس امر کے حامی تھے کہ مہاجرین کو ترکی پہنچ کر خلیفۃ المسلمین کی جانب سے شریک جہاد ہونا چاہیے ـــــ ان تینوں لیڈروں میں خوب کھینچا تانی ہوئی، ہر ایک اپنی بات منوانا چاہتا تھا،

تاہم مولانا عبیداللہ کا رویہ تحکمانہ تھا۔ یہی حال مولوی عبدالحق کا بھی تھا لیکن قاضی ولی خاں شرافت کا دامن ہرگز نہ چھوڑتے تھے۔ ان کی باتیں مدلل اور پُرمغز تھیں۔ ہر ایک نے انھیں پسند کیا۔ تمام مہاجرین ان کے ساتھ ہو لیے اور "ترکی چلو، ترکی چلو" کے نعرے لگانے لگے۔ اس طرح قاضی ولی خاں کا مؤقف تسلیم کر لیا گیا۔"

تحریکِ ہجرت کے ایک اور رہنما اقبال شیدائی نے بھی، جو افغانستان گئے۔ قاضی ولی خان کی صلاحیتوں کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

بعد میں قاضی ولی خان اس انقلابی حکومت کے بھی رکن رہے جو راجہ مہندرا پرتاپ کی قیادت میں کابل میں بنائی گئی تھی۔

تیسری جنگِ افغانستان میں امیر امان اللہ خان کی فوج میں رضا کارانہ طور پر شامل ہو کر قاضی ولی خان نے بڑی بہادری سے فرنگی فوجوں کا مقابلہ کیا، ڈکہ کے محاذ پر انھوں نے افغان فوجی کمانڈر کی بھرپور مدد کی۔ اس پر افغان حکومت نے انھیں "لوئے خان" (خانِ اعظم) کا خطاب بھی دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب غازی امان اللہ خان کا زوال شروع ہوا اور افغانستان میں بدامنی اور ابتری پھیل گئی تو پہلے روس اور پھر وہاں سے یورپ چلے گئے۔

اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر قاضی عبدالولی خان فرانس، مصر اور جرمنی سے ہوتے ہوئے سوئٹزر لینڈ جا پہنچے۔ وہاں فارسی اور عربی پڑھاتے رہے اور وہیں شادی بھی کر لی۔ بعد میں انھوں نے جرمنی سے پی ایچ۔ ڈی بھی کیا ــــ قاضی صاحب نے سوئٹزر لینڈ سے "کریسنٹ"، "مسلم سٹینڈرڈ" اور "اورینٹ" اخبار بھی نکالے، انگریزی حکومت نے ان اخبارات کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا، تاہم افغانستان کے راستے یہ اخبار یہاں پہنچ ہی

جاتے اور لوگ ان کا ایک ایک لفظ بڑے شوق سے پڑھتے۔

ایک معلّم، ماہر لسانیات اور مجاہد فی سبیل اللہ ہونے کے علاوہ قاضی عبدالولی خان ایک مبلّغ اسلام بھی تھے۔ یورپ کی کئی نامور ہستیوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھ کر اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا۔

مولانا محمد علی جوہر قاضی صاحب کے بڑے قدردان تھے۔ ۱۹۲۸ء میں وہ یورپ گئے تو بطورِ خاص قاضی ولی خان سے ملاقات کی اور اپنی تحریروں میں بھی انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

۱۹۳۷ء میں صوبہ سرحد میں پہلی بار صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی قیادت میں وزارت بنی تو قاضی عبدالولی خان پر عائد کردہ پابندیاں ہٹالی گئیں اور سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں ان کی ضبط شدہ جائیداد بھی واگزار کر دی گئی تاہم چونکہ اس وقت تک انگریز کا منحوس سایہ ابھی سرزمین پر باقی تھا اس لیے قاضی صاحب نے واپس آنا گوارا نہ کیا۔

قیام پاکستان کے بعد وہ پشاور لوٹے لیکن یہاں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ان کی آمد کے چند دن بعد ان کی پاکستانی اہلیہ وفات پاگئیں۔ انھیں اپنے ہاتھوں سپردِ خاک کیا۔ پھر بیمار پڑ گئے اور ۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو یہ ایثار پیشہ مردِ مجاہد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گیا۔

○

عجب خان آفریدی

"عجب خان"! ——— "عجب خان!"........ ساری دنیا میں شور مچا ہوا تھا۔ سارے ہندوستان اور برطانیہ کے اخبارات کی شہ سرخیوں میں اس کا ذکر تھا ——— وہ نہ کوئی بین الاقوامی لیڈر تھا نہ قومی ہیرو ——— لندن اور دہلی کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا! ——— ایک طرف پوری سلطنتِ برطانیہ کی طاقت اور وسائل تھے اور دوسری طرف بے چارہ عجب خان اور اس کے چار ساتھی۔

بات صرف اتنی تھی کہ آفریدی قوم کے قبیلہ بوستی خیل کا ایک فرد عجب خان کوہاٹ چھاؤنی کے ایک افسر میجر ایلس کی جوان سال بیٹی کو اٹھا کر لے گیا تھا ——— اس میں تعجب کی بات تھی تو صرف اتنی کہ مسلمان اور پختون کبھی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا ——— ۱۸۴۹ء سے سرحد کے قبائلی مجاہد فرنگی کے خلاف برسرِ پیکار تھے ——— ہزاروں لوگ ان جھڑپوں میں جان گنوا بیٹھے تھے لیکن کسی مسلمان مجاہد کے ہاتھوں دشمن کی کسی خاتون کو کوئی گزند نہ پہنچا تھا ——— پھر عجب خان کو آخر کیا سوجھی کہ اس نے مس ایلس کے اغوا کی تہمت اپنے ذمہ لی؟ ——— لیکن کوئی عجب خان سے بھی تو پوچھتا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی؟ ——— وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا ——— پہل فرنگی ہی کی طرف سے ہوئی تھی ——— فرانٹیر کانسٹیبلری کا کمانڈنٹ

ایرک چارلس ہینیڈی سائنڈ اقتدار کے نشہ میں اتنا بدمست تھا کہ اس نے کسی شک کی بناء پر بوستی خیل میں واقع عجب خان کے گھر کی تلاشی لیتے وقت اتنا بھی خیال نہ کیا کوئی مرد گھر میں موجود نہ تھا ـــــ صرف عورتیں تھیں ـــــ کیا انگریز افسر کو پردہ دار مسلمان خواتین کا احترام نہیں کرنا چاہیے تھا؟ ـــــ کیا اسے سرحدی روایات کا علم نہ تھا؟ ـــــ بعد میں عورتوں نے اپنی بے بسی اور لاچاری کا رونا عجب خان کے آگے رویا تو اس نے قسم کھائی کہ فرنگی نے میرے گھرانے کی مستورات کی بے عزّتی کی ہے تو میں فرنگی کو اس کا مزا ضرور چکھاؤں گا۔

بات کئی برس سے چل رہی تھی ـــــ عجب خان ایک غیّور مسلمان تھا ـــــ وہ کسی طرح بھی وطنِ عزیز پر فرنگی کا تسلّط برداشت نہ کر سکتا تھا ـــــ ۱۹۱۹ء میں غازی امان اللہ خان انگریز کے خلاف میدانِ جہاد میں اُترا تو عجب خان نے قلعہ ٹل کے محاذ پر اس کا بھرپور ساتھ دیا ـــــ ٹل کی فتح میں عجب خان کا کردار قابلِ ستائش تھا ـــــ بعد میں غازی امان اللہ خان کو امیر افغانستان تسلیم کر لیا گیا اور اس کے اور انگریزی حکومت کے مابین مصالحت ہو گئی تو عجب خان وطن واپس آگیا ـــــ درّہ آدم خیل میں اس کا گاؤں بوستی خیل کوہاٹ چھاؤنی سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔

فرنگی افسر عجب خان سے بھرے بیٹھے تھے، جو واردات ہوتی اس کا الزام وہ اسی کے سر تھوپ دیتے۔ ۲۶ اور ۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء کی درمیانی رات کو کوہاٹ چھاؤنی کی لانسر رجمنٹ کے گارڈ روم پر حملہ ہوا۔ سنتری کو ہلاک کر کے حملہ آور اسلحہ خانہ سے بارہ بندوقیں، آٹھ ڈور بینیں، پندرہ تلواریں اور بہت سے کارتوس لے گئے ـــــ صبح ہوئی تو ساری کوہاٹ چھاؤنی میں کہرام

مچ گیا۔ ڈپٹی کمشنر کرنل بروس نے آفریدی جرگہ سے کہہ کر عجب خان کو بلا بھیجا لیکن پیغام اس تک نہ پہنچ سکا۔

اس واقعہ پر تھوڑے دن گزرے تھے کہ کیپٹن سپارکس نامی ایک انگریز فوجی افسر سے کوئی اعلی انسل کے دو گھوڑے اڑا کر لے گیا۔ اس کا الزام بھی عجب خان پر لگایا گیا۔

عجب خان کو فرنگی کی اس کینہ پروری کا علم ہوا تو اسے بڑا قلق ہوا اور وہ کھل کر سامنے آگیا۔ ۱۴ اور ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کی درمیانی رات کو وہ کرنل فوکس نامی انگریز افسر کے بنگلہ میں جا دھمکا۔ اس کا بھائی شہزادہ خان اس کے ساتھ تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ کرنل فوکس کو اٹھا کر لے جائے اور یرغمالی بنا لے لیکن اتفاق سے کرنل فوکس جاگ رہا تھا۔ اس نے عجب خان کو کمرے میں گھستے دیکھ کر عجب خان پر ریوالور تان لیا، عجب خان نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو فائر سے بچایا اور فوراً ہی کرنل فوکس پر خنجر سے وار کر دیا۔ کرنل زخمی ہو کر گرا تو اس کی بیوی نیند سے بیدار ہو گئی۔ وہ اپنے خاوند کی مدد کو آگے بڑھی تو عجب خان نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس پر خنجر سے وار کیا۔ پھر دونوں بھائی بجلی کی سی تیزی سے بنگلہ سے نکلے اور رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔

چھاؤنی میں خطرے کے الارم ہوئے۔ فوج اور پولیس حرکت میں آگئی۔ انھوں نے ساری چھاؤنی چھان ماری لیکن عجب خان اور اس کا بھائی قابو میں نہ آئے۔ سارے کوہاٹ میں خوف و ہراس کی لہر پھیل گئی اور حفاظتی انتظامات بہت ہی سخت کر دیے گئے۔

۲۲ فروری ۱۹۲۳ء کی رات کو فرنگی کے اقتدار پر ایک اور زد پڑی عجب خان اور اس کے مٹھی بھر ساتھی دندناتے ہوئے آئے اور کوہاٹ چھاؤنی کے اسلحہ خانہ

پر ٹوٹ پڑے ــــــ کسی کو ان کے منہ آنے کی جرأت نہ ہوئی اور قبائلی مجاہد ۳۰۳ کی ۴۶ بندوقیں لے کر چلتے بنے ــــــ اب تو کرنل بروس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے تنگ آکر قومی جرگہ بلایا تاکہ خود آفریدی قوم کے سربرآوردہ لوگ اپنی روایات کے مطابق اس مسئلے پر رائے دیں اور اس کا حل تلاش کریں۔

مشہور صحافی اللہ بخش یوسفی مدیر روزنامہ "سرحد" پشاور نے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:۔

"انگریز ڈپٹی کمشنر کا خیال تھا کہ آفریدی جرگہ عجب خان کے جرم کی ذمہ داری قبول کرے گا لیکن اجلاس میں ایسا نہ ہونے پایا اور کسی قبیلے نے بھی جرم کی ذمہ داری اپنے سر نہ لی۔ سب نے ان وارداتوں کو کسی فرد یا افراد کا ذاتی فعل قرار دیا ــــــ بعد میں کرنل بروس نے طیش میں آکر فرانٹیر کانسٹیبلری کے کمانڈنٹ مسٹر ہینڈی سائڈ (جسے کسی حریت پسند نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور جس کی یاد میں درۂ کوہاٹ کے مقام کوتل میں ایک دروازہ ہینڈی سائڈ گیٹ اب بھی موجود ہے) کو عجب خان بوستی خیل کے مکان کی تلاشی لینے، وہاں سے مسروقہ اسلحہ برآمد کرنے اور عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ اس پر جرگہ سے اجازت لیے بغیر فرانٹیر کانسٹیبلری (بارڈر پولیس) کے جوانوں کے ایک دستہ نے بوستی خیل میں عجب خان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی مرد موجود نہ تھا۔ خانہ تلاشی میں کوئی مال مسروقہ بھی برآمد نہ ہوا ــــــ جاتے جاتے اور کچھ نہ بنا تو انگریز افسر عجب خان کے کچھ عزیز و اقارب کو گرفتار

کر کے ساتھ لے گیا"۔

بتایا جاتا ہے کہ جاتے جاتے ہینڈی سائڈ نے اس کے گھرانے کی مستورات کو کچھ طنزیہ باتیں بھی کہیں ـــــ اس نے یہ بھی پوچھا کہ "عجب خان کہاں ہے؟" جس پر قبیلہ کی ایک معمر خاتون نے جواب دیا ـــــ "اچھا ہوا ـــــ وہ گھر پر نہیں ہے ورنہ تم دونوں میں سے ایک آج زندہ نہ ہوتا"

جب عجب خان اور شہزادہ خان گھر لوٹے اور انھیں گھر کی تلاشی لینے اور گھر کی عورتوں کی بے عزتی کا علم ہوا تو انھوں نے قسم کھائی کہ جب تک انگریز سے اس بے عزتی کا انتقام نہ لیں گے، گھر واپس نہیں آئیں گے۔

وہ کوہاٹ چھاؤنی کو چلے گئے اور مستقبل کے لیے منصوبے بنانے لگے۔ اب کے انھوں نے میجر ایلس نامی انگریز افسر کو زندہ اٹھا لے جانے کا فیصلہ کیا۔ کئی دن تک عجب خان میجر ایلس کے بنگلہ کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ بنگلہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ کے بالکل پاس تھا۔ میجر ایلس کے ہاں ایک خونخوار کتّا بھی تھا جو رات کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ عجب خان کئی دنوں تک روزانہ گوشت لاتا اور کتّے کو کھلاتا، حتیٰ کہ کتّا اس سے مانوس ہو گیا اور واردات کی رات اسے کتّے کو قابو کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ عجب خان کے ہمراہ اس کے دو بھائی شہزادہ خان اور گل اکبر اور دو ساتھی سلطان میر اور حیدر شاہ بھی تھے۔

۱۴ اپریل ۱۹۲۳ء کی رات تھی۔ عجب خان بنگلہ کے ایک روشندان کے ذریعے کمرے میں داخل ہوا اور دروازے کی چٹخنی کھولی جس پر شہزادہ خان بھی اندر چلا گیا۔

وہ اندھیرے میں خواب گاہ کی طرف بڑھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ میجر ایلس اور مسز ایلس چار پائیوں پر محوِ خواب ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ میجر ایلس کسی سرکاری کام

سے ہنوں گیا ہوا تھا۔ مسز ایلیس آہٹ سُن کر اٹھی اور مزاحمت کرنی چاہی تو شہزادہ خان نے اندھیرے میں میجر ایلیس کے گمان میں اسے خنجر کا وار کر کے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سُلا دیا۔

میجر ایلیس کی سترہ۱۷ سالہ بیٹی مولی ایلیس (MOLLIE ELIS) ملحقہ کمرے میں مصروف مطالعہ تھی۔ وہ دوڑی ہوئی آئی تو اس ڈر سے کہیں وہ شور نہ کرے عجب خان نے اپنی چادر اس کے منہ پر ڈال دی اور اسے کندھے پر اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل بھاگا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس نے بنگلے کی دیوار پھلانگی اور اپنی راہ لی۔

چوکیداروں کو اُن کے سامنے آنے کی جرأت تو نہ ہوئی تاہم بھاگتے ہوئے افراد کے سائے دیکھ کر انھوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ میجر ایلیس کا پڑوسی کیپٹن ہائی لینڈ میجر ایلیس کے ہاں پہنچا تو مسز ایلیس دم توڑ چکی تھی۔ حکّام بالا کو اطلاع ہوئی تو ساری انتظامیہ حرکت میں آگئی ——— مس مولی ایلیس کی بڑی ڈھنڈیا پڑی ——— قبائلی علاقوں کو جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی لیکن عجب خان کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھا کہ ہاتھ آتا۔

بعد میں مس ایلیس نے بتایا کہ بنگلہ سے نکل کر پہلے ہم لوگ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ صبح تک وہ ایک پہاڑی غار میں پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے پشاور کوہاٹ روڈ صاف نظر آ رہی تھی تاہم انھیں کوئی دیکھ نہ سکتا تھا۔ عجب خان اور اس کے ساتھی مس ایلیس سے نہایت شفقت سے پیش آئے ——— سورج نکلا تو پہلی بار مس ایلیس نے عجب خان کو غور سے دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ "اگر تم مجھے پیسوں کی خاطر لائے ہو تو کاغذ لاؤ جتنی رقم تم مانگتے ہو میں لکھ دیتی ہوں۔"

اس پر شہزادہ خان نے کہا۔ "ہمیں پیسے نہیں چاہئیں، ہم نے اپنی بے عزّتی کا بدلہ لیا ہے ——— اب بھی اگر کرنل بروس کی بیوی ہمیں ہاتھ لگ گئی تو نہیں چھوڑ دیں گے۔"

اسی اثناء میں عجب خان، جو باہر گیا ہوا تھا، ایک گدھا لے کر آیا۔ اُس کے کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی تھا جو وہ مس ایلیس کے لیے لایا تھا، چونکہ کوہاٹ سے روانہ ہوتے وقت مس ایلیس کا جوتا اور ٹوپی وہاں رہ گئی تھی اس لیے عجب خان نے اسے ایک جوتا اور سر پر اوڑھنے کے لیے ایک چادر بھی دی۔

۱۵ اپریل ۱۹۲۳ء کو نہ صرف برِ صغیر ہند بلکہ ساری مملکت برطانیہ میں ایک کہرام مچ چکا تھا، صوبہ سرحد کا چیف کمشنر جان میفی (MAFFEY) انتہائی پریشان تھا۔ اس نے سارے واقع پر غور کیا۔ پھر ایک منصوبہ بنایا اور ایسے افراد کو منتخب کیا جو اس سلسلے میں انتہائی مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ اس نے خیبر کے نواب زمان خان کو ہدایت کی کہ خیبر اور تیراہ کی تمام سرحدوں پر نظر رکھے کہ کہیں مس ایلیس کو افغانستان نہ پہنچا دیا جائے۔ کرّم ایجنسی کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ خان بہادر قلی خان کو، جو قبائلی امور کے خصوصی ماہر تھے، تیراہ بھیجا کہ وہاں کے معززین بالخصوص کربوغہ شریف کے سجادہ نشین کے تعاون سے مُولی ایلیس کا پتہ لگائیں۔ رسالدار خان بہادر مغل باز خان کو ایف۔سی کے جوانوں کے ساتھ خانکی دادی (تیراہ) پہنچے اور معاملے کا کھوج لگانے پر مامور کیا۔ سر جان میفی نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ کسی ایسی خاتون کو بھی مہم پر بھیجا جائے جو مس ایلیس سے بات چیت کر کے اسے تسلّی دے سکے۔ سوچ سوچ کر بالآخر اس نے مشن ہسپتال پشاور کی نرسنگ سسٹر مسز سٹار (STARR) کا انتخاب کیا جو تیراہی پشتو بولتی تھی اور ایسا لباس پہنتی تھی کہ دیکھنے والا اسے اورک زئی یا آفریدی خاتون

ہی سمجھتا تھا، سرمیفی خود مسٹر سٹار کے ہمراہ سمانہ کے قلعہ تک گیا جہاں سے اس نے للین سٹار اور رسالدار مغل باز خان کو چند محافظوں سمیت تیراہ کے لیے رخصت کیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں آج تک کسی انگریز یا غیر ملکی خاتون کا قدم نہ پڑا تھا۔ کربوغہ کے مولانا عبدالحق کی مدد سے بالآخر یہ پتہ چل گیا کہ مس ایلس زندہ ہے اور ایک جگہ سلامتی سے نظر بند ہے۔ خان بہادر مغل باز خان اور قلی خان نے عجب خان اور شہزادہ خان سے ملاقات کی ______ وہ دل ہی دل میں شرمندہ تھے کہ میجر ایلس یا کسی مرد افسر کو یرغمالی بنانے کی بجائے ایک نوعمر لڑکی مولی ایلس کو ساتھ لے آئے تھے جس پر تمام قبائلی زعماء انھیں ناپسند کرنے لگے تھے۔ بات چیت کچھ دن تک جاری رہی۔ بالآخر عجب خان نے اس شرط پر مس ایلس کو اس جماعت کے حوالے کر دیا کہ تمام گرفتار شدہ بوستی خیل رہا کر دیے جائیں گے اور انگریز آفریدی علاقہ پر آئندہ فوج کشی نہیں کریں گے۔ مس ایلس نے عجب خان اور اس کے ہمراہیوں کے حسن سلوک کی بڑی تعریف کی۔ مس ایلس تیراہ سے رخصت ہو رہی تھی تو اسے زرق برق آفریدی لباس پہنایا گیا، اس کے گلے میں طلائی ہار ڈالا گیا اور بڑے تپاک سے اسے الوداع کہا گیا۔

تاہم فرنگی نے اپنی عادت کے مطابق بدعہدی کی۔ آفریدیوں کا جرگہ طلب کیا گیا اور پر زور دیا گیا کہ عجب خان بوستی خیل اور اس کے ساتھیوں کو آفریدی علاقہ میں کہیں پناہ نہ دی جائے۔ جو قبیلہ انھیں اپنے ہاں بسنے کی اجازت دے اس پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی جائے گی۔ ۱۳ مئی ۱۹۲۳ء کو تمام بڑے بڑے آفریدی ملکوں اور مذہبی رہنماؤں سے ایسے معاہدہ پر دستخط لے لیے گئے جس میں کہا گیا تھا کہ عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو آفریدی علاقہ سے نکال دیا جائے۔

اس پر عجب خان، شہزادہ خان اور ان کا گروہ روپوش ہو گیا۔ انھوں نے آخری بار انگریز سے انتقام لینے کے لیے ایک اور انگریز افسر کیپٹن واٹس اور اس کی بیوی کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا مگر شہزادہ خان کی بے احتیاطی کی وجہ سے منصوبہ ناکام ہو گیا۔ کیپٹن واٹس زندہ ہاتھ نہ آسکا تو اسے ہلاک کر دیا گیا جبکہ اس کی بیوی شدید زخمی ہوئی۔

اس واقعہ سے انگریزوں میں ایک بار پھر خوف و ہراس پھیل گیا۔ پھر سے عجب خان ہندوستان اور برطانیہ کے تمام اخبارات کا موضوع بن گیا۔ فرنگی نے حفاظتی انتظامات سخت کر دیے۔ زیادہ تعداد میں کانسٹیبلری اور خاصہ دار بھرتی کیے گئے۔ افغانستان جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی اور عجب خان اور اس کے ہمراہیوں کی گرفتاری کے لیے بھاری رقم دینے کا اعلان کیا گیا ـــــ تاہم عجب خان کو کون پکڑتا وہ کسی نہ کسی طرح افغانستان پہنچ گیا۔ اور امیر امان اللہ خان سے پناہ کا طالب ہوا۔

نامور اہل قلم عبدالکافی ادیب لکھتے ہیں کہ "عجب خان ایک پہاڑی عقاب تھا۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ کابل میں دو ماہ تک امیر افغانستان نے اسے اپنا ذاتی مہمان بنا کر رکھا۔ بعد میں اسے شمالی علاقہ مزار شریف میں ایک بڑا مکان مہیا کر دیا۔ گزارے کے لیے معقول وظیفہ اور کچھ اراضی بھی دی ـــــ اس حال میں وہ چار سال تک امن و سکون سے رہا لیکن جب بچہ سقہ نے امان اللہ خان کی بادشاہت کا تختہ الٹ دیا تو عجب خان پھر پہاڑوں کی طرف نکل گیا لیکن بچہ سقہ کی اطاعت قبول نہ کی ـــــ جب بچہ سقہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اقتدار نادر شاہ کے ہاتھ آیا تو عجب خان کی مراعات بحال کر دی گئیں ـــــ"

عجب خان نے بعد میں اپنے بیوی بچوں اور عزیز و اقارب کو بھی مزار شریف بلا لیا تھا۔ اس کی آخری عمر نسبتاً چین سے گزری۔ ۸۵ سال کی عمر میں وہ جولائی ۱۹۶۱ء میں فوت ہوا اور وہیں دفن کیا گیا ۔۔۔ اس کا بھائی شہزادہ خان آخری دنوں میں پاکستان آگیا تھا۔ حال ہی میں مرحوم عجب خان کے بیٹے بھی افغان مہاجرین کے دوش بدوش جہاد میں مصروف رہے ہیں۔

مس مولی ایلس ابھی زندہ ہے۔ اس کے ذہن سے کوہاٹ اور پشاور کی یادیں ابھی محو ہونے نہیں پائیں۔ فروری ۱۹۸۳ء میں وہ پشاور آئی تو حکومت صوبہ سرحد نے اسے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ وہ خان بہادر قلی خان کے گھرانے کی مہمان رہی اور کوہاٹ میں اپنی ماں کی قبر پر بھی حاضر ہوئی۔

○

حکیم عبدالرحیم، بنّوں

ایک بار تحریکِ آزادی کے بہت سے مقتدر لیڈر ایک جگہ جمع تھے، یہ بحث چھڑ گئی کہ تحریکِ خلافت میں سب سے بڑھ کر حصّہ کس علاقہ نے لیا۔ کسی نے پشاور کا نام لیا، کسی نے کراچی کا۔ اس پر مولانا ظفر علی خان بول اٹھے۔ "میری رائے میں تحریکِ خلافت میں سب سے زیادہ قربانیاں اہل بنّوں نے دیں"۔ تو سبھی زعماء کو یہ حقیقت تسلیم کرتے ہی بن پڑی۔ بنّوں میں اس وقت بیرسٹر محمد جان خان، ملک خدا بخش اور حکیم عبدالرحیم جیسے ایثار پیشہ رہنمایانِ خلافت سرگرمِ عمل تھے۔ حکیم عبدالرحیم کی عظمتِ کردار سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان نے جیل میں ان کی شان میں جو استقبالیہ نظم کہی وہ ایک واضح اعترافِ حقیقت ہے۔ مولانا نے کہا ؎

بسجن اندر چوں می پرسی حکیم عبدالرحیم آمد
بہ بزم اندر نگار آمد، بباغ اندر نسیم آمد
صراطش چوں حق آگاہان صراطِ مستقیم آمد
بہ زنداں رفت چوں یوسف بہ سینا چوں کلیم آمد
چوں جاں افشاند در راہِ حضورِ خواجۂ یثرب
بگوشش از سمر نامژدۂ فتحِ عظیم آمد

حالت یہ تھی کہ ضلع بنوں کے نمبرداروں، ذیلداروں اور سفید پوشوں نے اپنے عہدوں سے استعفے دے دیے، فرنگی فوجیوں نے گھروں کو لوٹا اور عورتوں کے جسم سے زیورات اتروا لیے ــــ خلافت کے نو سو کارکن گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ چھ بے گناہوں کو قتل کر دیا گیا۔ چار علاقوں (ٹپہ داؤد شاہ، بازار احمد خان، ککی اور غوریوالہ) پر تین سال کے لیے تعزیری چوکیاں قائم کر دی گئیں، جن کا خرچ ۶۳ ہزار روپیہ سالانہ تھا، یہ رقم بھی اہلِ علاقہ نے ادا کرنی تھی۔

بنوں سے چھوٹے اور دُور افتادہ ضلع میں تحریکِ خلافت کو جس شاندار بنیادوں پر منظم کیا گیا اس کا سہرا حکیم عبدالرحیم جیسے مخلص رہنماؤں ہی کے سر تھا۔

حکیم عبدالرحیم بنوں کے مقام گڑھی شیر احمد (عیسکی) کے رہنے والے تھے، وہ ۱۹۱۸ء میں طبیہ کالج دہلی میں پڑھ رہے تھے کہ حکیم اجمل خان کی تحریک پر سیاسیات میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہروں میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔ بعد میں تحریکِ خلافت میں انھوں نے ناقابلِ فراموش کردار انجام دیا۔

۲۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو انھیں گرفتار کر کے تین سال قید سخت کی سزا سنائی گئی اور منٹگمری (موجودہ ساہی وال) جیل بھیجدیا گیا، یہی وہ موقع تھا جس کی مناسبت سے مولانا ظفر علی خان نے ان کی شان میں استقبالیہ نظم کہی ــــ اہلِ بنوں نے نہ صرف تحریکِ خلافت میں عملاً حصہ لیا بلکہ کافی رقم جمع کر کے جنرل نادر خان کو بھجوائی۔ انھوں نے بنوں اور وزیرستان سے وزیر، محسود اور دوسرے پختون رضا کاروں کو بھی افغانستان بھیجا تاکہ وہ بچہ سقہ کے

خلاف امیر امان اللہ خان کی پارٹی کی طرف سے جہاد میں حصّہ لیں۔
۱۹۰۳ء میں خدائی خدمت گار تحریک کی حمایت میں بھی اہلِ بنّوں نے نمایاں کردار انجام دیا۔ حکیم عبدالرحیم کو گرفتار کر کے گجرات جیل میں بند کر دیا گیا، قید سے رہائی ہوئی تو ملک کی سیاسی فضا بدل چکی تھی۔ کانگرس میں مدغم ہو کر خدائی خدمت گار تحریک اپنے اسلامی کردار کو چھوڑ بیٹھی تھی اس لیے حکیم عبدالرحیم نے خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد میں انھوں نے مسلم لیگ کی تنظیم اور تحریک حصولِ پاکستان میں بھی سرگرم حصّہ لیا، ملک کو آزادی ملی تو حکیم صاحب اور ان کے ساتھی سجدۂ شکر بجا لائے۔ جب تک ان کے دَم میں دَم رہا حکیم عبدالرحیم اپنے عوام کی بے لوث خدمت انجام دیتے رہے اور بالآخر اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جا پہنچے۔

○

فقیر آف اپی

۱۹۳۷ء کا سال تھا۔ انگریز کے تیس ہزار فوجی افسر اور سپاہی وزیرستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے، ہوائی جہازوں سے اندھا دھند بمباری کی جاتی تھی، یہاں تک کہ خود برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان اس ظالمانہ کارروائی کی کھلی مذمت کر رہے تھے، پھر برطانوی فوجوں کی یہ وحشیانہ کارروائی روس، جرمنی یا کسی دشمن طاقت کے خلاف نہ تھی بلکہ ایک درویش خدامست کے خلاف، جسے اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کا بھروسہ نہ تھا۔

سالہا سال سے وزیر اور محسود قبائل کے خلاف برطانیہ کی فوجی مہمات جاری تھیں، قومی خزانے سے کروڑوں روپیہ محض اس لیے پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا کہ سرحدی قبائل اپنی آزادی کی ضمانت مانگتے تھے۔ روز اول سے وہ آزاد چلے آ رہے تھے اور اب بھی ہر قیمت پر آزاد رہنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ آئے دن کی لڑائیوں کی وجہ سے وہ بددل ہو کر چپکے سے زندگی گزار رہے تھے۔ ایسے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے وہ میدان جہاد میں نکلنے پر مجبور ہو گئے۔

ہوا یوں کہ موضع جھنڈو خیل ضلع بنوں کی مسماۃ رام کماری دختر میوہ رام گلاٹی ایک شادی شدہ ہندو عورت تھی۔ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد سید امیر نور علی شاہ سے نکاح کر لیا اور دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ لیکن بنوں میں چونکہ ہندو بہت

متموّل اور آسودہ حال تھے۔ انھوں نے انگریزی عدالت میں امیر نور علی شاہ کے خلاف اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اگر معاملہ جرگہ سپرد ہوتا تو فیصلہ آسان تھا لیکن عدالتی کارروائی کے دوران ہندو ڈاکٹر کے اس سرٹیفیکیٹ پر کہ لڑکی نابالغ ہے، مقدمے کا ہندوؤں کے حق میں فیصلہ کر دیا گیا ــــ لڑکی کے والدین اور ہندو معززین اسے ہوشیار پور (پنجاب) لے گئے، وہاں اسے دوبارہ ہندو مذہب میں داخل کر کے اُسے "شُدھی" کا سرٹیفیکیٹ جاری کر دیا۔ اور اس طرح "اسلام بی بی" پھر سے رام کماری بن گئی ــــ مسلمانانِ بنوں میں اس واقعہ پر بڑا اشتعال پھیل گیا، اس اشتعال اور بدامنی کے دوران فقیر آف ایپی منظرِ عام پر آئے اور رفتہ رفتہ سارے وزیرستان کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔

فقیر آف ایپی کا اصل نام میرزلی خان تھا، وہ طوری خیل وزیر تھا، درمیانہ قد اور عام شکل و صورت کا یہ نوجوان پہلے پہل ایک طالب علم کی حیثیت میں بنوں میں آیا۔ وہ کم گو اور قناعت پسند انسان تھا۔ مختلف دینی مدرسوں میں پھرتے پھراتے وہ نورڑ کے مولوی گل نوئیداد کا شاگرد بنا۔ علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد اسے روحانی تربیت کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اپنے دور کے ولیٔ کامل سید حسن المعروف بہ نقیب جلال آبادی سے طریقِ قادریہ میں بیعت سے مشرف ہوا اور ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا، اس کی شادی فاطمہ خیل کلاں کے قاضی حیات الدین سے ہوئی جو تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکن رہے تھے۔

تحصیلِ علم کے بعد میرزلی خان نے اپنے آپ کو ہمہ تن دینی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور اپنے آبائی گاؤں "ایپی" میں ڈیرہ لگایا جو بنوں سے وادی ٹوچی جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اسی گاؤں کی نسبت سے "فقیر آف ایپی" کہلانے لگا۔ اللہ نے اسے روحانی کمالات سے نوازا تھا۔ بیمار دعا کے لیے

آتے تو انھیں شفا ملتی۔ وہ مستجاب الدعوات تھا۔ ہر وقت عبادت اس کا شعار تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سارے علاقے کے لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اس دوران میں میرزلی خان عرف فقیر ایپی حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے۔

اس زمانے میں برّصغیر میں سیاسی تحریکیں بھی زوروں پر تھیں، شدھی، سنگھٹن اور مسجد شہید گنج کی بدولت ہندو مسلم کشیدگی عروج پر تھی۔ اسلام بی بی کے واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا، فقیر آف ایپی نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ جلد ہی فقیر ایپی نے ایک منظم لشکر تیار کیا اور دریائے خیسورہ کی وادی میں برطانوی چوکیوں اور تنصیبات پر حملے شروع کر دیے۔ انگریزی فوجوں نے مزاحمت کی تو باقاعدہ طویل لڑائی کا سلسلہ چل نکلا۔

فقیر صاحب ہر قبیلہ میں جاتے اور نوجوانوں کو جہاد کے لیے جمع کرتے۔ ان غازیوں کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ محاذ پر جاتے تو سات آٹھ دن کے لیے خشک روٹیاں اور چنے ساتھ لے جاتے، نہ رسد رسانی کا کوئی انتظام تھا نہ مناسب اسلحہ جنگ پاس تھا تاہم وہ ہر معرکے میں کامیاب رہتے، اسے فقیر آف ایپی کا روحانی کمال سمجھا جاتا۔ فقیر صاحب نے بعد میں اپنا مرکز جہاد گرویخت میں منتقل کر دیا جو پاک افغان سرحد سے صرف ڈیڑھ میل دور تھا۔

۱۹۳۷ء کے اوائل میں وزیرستان میں برطانوی سپاہیوں اور افسروں کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی لیکن اتنی قوت کے باوجود فرنگی کو فقیر کے مقابلے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تو ہوائی جہازوں سے علاقے پر بمباری کی جانے لگی، ساری مہذب دنیا نے نہتے عوام پر فضائی بمباری کے ظالمانہ اقدام کی مذمت کی، خود برطانوی پارلیمان نے اس فعل کی مذمت کی لیکن انگریز باز نہ آیا — اس پر

قبائلی غازیوں نے بھی انگریزی چوکیوں پر چھاپوں، افسروں کے قتل اور اغواء اور ہندو سیٹھوں پر ڈاکوں کی رفتار تیز کر دی۔

تنگ آ کر حکومت نے طوری خیل قبیلوں پر زور دیا کہ وہ فقیر آف ایپی کو اپنے علاقے سے نکال باہر کریں لیکن طوری خیل نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی بجائے دن بدن فقیر آف ایپی کے مجاہدین میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس پر فرنگی نے کئی بریگیڈ فوج ان غازیوں کی سرکوبی کے لیے وزیرستان بھیج دی۔ جان ماسٹرز نے ۱۲ر مئی ۱۹۳۷ء کے اس معرکے کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

"اب جرنیل نے فیصلہ کیا کہ بہر صورت پیش قدمی جاری رکھی جائے اور فقیر آف ایپی کو گرفتار کرنے کے لیے اس کے ہیڈ کوارٹر ارسل کوٹ پر ہلہ بول دیا جائے جہاں فقیر ایک غار میں زندگی بسر کرتے تھے۔ غار تک پہنچنے کے لیے نہ کوئی سڑک تھی نہ پگڈنڈی۔ جگہ جگہ دست بدست لڑائی ہوتی تو قبائلی مجاہد موت سے بے خوف ہو کر برستی ہوئی گولیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دشمن پر شیروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ پڑتے۔ اس پہاڑی لڑائی میں برطانوی سپاہی زخمی ہو کر گرتے تو انھیں اٹھا کر دوسری جگہ بھیجنا بھی مشکل ہوتا ـــــ ایک فوجی کو دوسرے کی ہوش نہ رہتی۔"

دو بریگیڈ فوج ایک فقیر بے نوا کے پیچھے لگی ہوئی تھی لیکن اپنی انتہائی کوشش کے باوجود وہ فقیر کی پناہ گاہ تک نہ پہنچ سکی۔ قبائلی مجاہدین کے حوصلے اتنے بڑھے کہ ۲۳ر جولائی ۱۹۳۸ء کو دو ہزار غازیوں نے بنوں شہر پر حملہ کر دیا جس میں بیسیوں شہری ہلاک اور زخمی ہوئے اور لاکھوں روپے کا سامان تجارت حملہ آوروں کے ہاتھ لگا۔ فوج نے ہر چند غازیوں کا مقابلہ کیا تاہم اس حملے سے وہ خوف و ہراس

پھیلا کہ شہر کی آدھی ہندو آبادی ہمیشہ کے لیے بنّوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جا بسی۔ اس طرح برطانوی حکومت کا وقار مٹی میں مل گیا۔

چونکہ لوگ فقیر آف ایپی کی روحانی عظمت کے قائل تھے، اس لیے انگریزوں نے لوگوں کو ان سے بدظن کرنے کے لیے ایک مذموم منصوبہ بنایا۔ وہ جانتے ہیں کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ فقیر آف ایپی کے خلاف "شامی پیر" نامی ایک شخص کو دزمک بلوایا اور اس کے بارے میں مشہور کیا کہ اس کا تعلق پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کے بڑے صاحبزادے پیر عبدالرزاق کی اولاد سے ہے۔ انگریزوں نے طرح طرح کی روایات اور کرامتیں بھی شامی پیر سے منسوب کیں تاکہ لوگ فقیر آف ایپی کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوں، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ شامی پیر اصل میں "لارنس آف عریبیا" کی طرح کوئی انگریز تھا۔

فقیر آف ایپی بڑی تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے کئی جرنیل اور خلفاء مقرر کر رکھے تھے جو اس کی غیر حاضری میں اس کے جانشین کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان میں خلیفہ گل نواز، خلیفہ عبداللطیف، شیر علی خان، خلیفہ تاویل دار، خلیفہ سردرنی خان، خلیفہ میر احمد، خلیفہ مہر دل خٹک، جرنیل رب نواز خان، جرنیل شیر باز خان، جرنیل شادی خان اور جرنیل مشک عالم خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ فقیر صاحب نے اسلحہ سازی اور توپیں ڈھالنے کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔

لوگ فقیر آف ایپی پر جان چھڑکتے تھے اور اس کے حکم پر اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چنانچہ وہ کبھی فوجی چوکیوں پر حملہ آور ہوتے، کبھی بنّوں شہر کے قریب ریلوے لائن کو بم سے اڑاتے اور بہادری کے دوسرے کارنامے انجام دیتے۔

"بنوں، تاریخ کے آئینے میں" کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ فقیر ایپی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سورانی قبیلے میں آئے۔ دریائے گرّم کے کنارے نمازِ عصر ادا کی۔ سلام پھیرا تو اپنے آپ کو دشمنوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک طرف دریا کی تند و تیز لہریں تھیں۔ دوسری طرف دشمن دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ ان کے ساتھی فکر مند ہو گئے لیکن فقیر صاحب بالکل مطمئن تھے۔ انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ آسمان یک لخت سرخ ہو گیا۔ فضا میں صرف بھڑوں کے غول ابھرے اور دشمن کے سپاہیوں کو ڈسنے لگے۔ سپاہی چیختے چلاتے وہاں سے بھاگ گئے اور فقیر صاحب اور ان کے مجاہد ساتھیوں کو نرغہ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔

فقیر آف ایپی برطانوی حکمرانوں کے لیے ایک ہوّا تھا۔ وہ ہر وقت اس سے لرزہ براندام رہتے۔ کوئی شخص ان سے ملاقات کر کے آتا تو بنوں پہنچتے ہی اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ ان کے ارادت مندوں پر کڑی نظر رکھی جاتی — تاہم اس حریت پسند رہنما نے ۱۹۴۶ء تک اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۴۷ء میں اس سرزمین پر ایک آزاد اسلامی مملکت وجود میں آئی تو وہ بھی پس منظر میں چلا گیا۔

اس مجاہد مردِ خدا نے ۱۹۶۰ء میں وفات پائی۔ ان کی آخری آرام گاہ اب بھی مرجع خاص و عام ہے۔

○

موت کو کھیل سمجھنے والے

وزیرستان کی بے آب و گیاہ سرزمین ہے۔ خشک اور چٹیل میدان میں اونچی نیچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک فوجی قلعہ ہے۔ سروا کئی کے اس قلعے کی ایک گرم سہ پہر ہے۔ گہرا سکوت چھایا ہوا ہے۔ افسر بالائی منزل کے کمروں میں اور سپاہی نیچے بیرکوں میں آرام کر رہے ہیں۔ ایسے میں اچانک خطرے کا الارم ہوتا ہے — سپاہی اور افسر آنکھیں ملتے بندوقیں سنبھالے باہر نکل آتے ہیں — "بظاہر کوئی ایمرجنسی تو ہے نہیں — پھر خطرے کا بگل؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا — سبھی اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگتے ہیں — "بات کیا ہے؟" ہر شخص اپنے اپنے طور پر سوچنے لگتا ہے — اتنے میں چوکی کی چھت سے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ سب چونک اٹھتے ہیں۔ "قبائلی لشکر؟" — "نہیں یہ تو اپنی ہی چوکی کا ایک باوردی سپاہی ہے — اسے کیا سوجھی! نعرے لگا رہا ہے — پاگل تو نہیں ہو گیا کہیں اس غضب کی گرمی کے ہاتھوں!" سب سوچ میں پڑ جاتے ہیں — لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سپاہی دیوانہ نہیں فرزانہ ہے — وہ پھر نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے اور دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگا دیتا ہے، سبھی حیرت سے اسے دیکھنے لگتے ہیں — اچانک ایک اردلی شور کرتا ہے۔ "پکڑو —

پکڑو ــــ پولیٹیکل افسر صاحب قتل ہو گئے ہیں ــــ قاتل یہی سپاہی ہے ــــ پکڑو، جانے نہ دو!" لوگ پکڑنے کو دوڑتے ہیں لیکن وزیری سپاہی اطمینان سے کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے ــــ "پکڑنے کی یا شور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ــــ میں بھاگوں کا نہیں ــــ میں نے پولیٹیکل افسر صاحب کو قتل کیا ہے اور سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں!" انگریز آفیسر کمانڈنگ اس کی باتیں سن رہا تھا ــــ

"یہ شہابی خیل سپاہی تو بڑا فرمانبردار، بڑا کم گو اور بڑا مودب ہے، اسے کیا ہو گیا؟ قتل ــــ اور ایک انگریز افسر کا قتل؟" ــــ وہ سپاہی سے قتل کی وجہ پوچھتا ہے ــــ سپاہی بتاتا ہے۔ صاحب میں مجبور تھا ــــ مجبوری سے قتل کیا ــــ مجبوری سے!" ــــ "قتل اور مجبوری سے ــــ کیا مطلب ہے تمھارا؟" ــــ "یہ ہمارے قبیلے کی روایت ہے صاحب! کہ جو شخص کسی فرنگی کو قتل نہ کرے اسے بہادر نہیں سمجھا جاتا ــــ میں نے اپنے آپ کو بہادر ثابت کرنے کے لیے صاحب کو قتل کیا ــــ" "اچھا ــــ تو تمھیں اس حرکت کی سزا بھی معلوم ہے نا ــــ؟" آفیسر کمانڈنگ نے کہا۔ "میں سزا پانے کے لیے حاضر ہوں سر! ــــ میرا مقصد پورا ہو گیا ہے ــــ میں اب کسی سزا سے نہیں ڈرتا۔"

قلعے کے انگریز افسر صلاح مشورے کرنے لگتے ہیں۔ کورٹ مارشل ہوتا ہے جس میں فیصلہ ہوتا ہے کہ قاتل سپاہی کو فوراً گولی سے اڑا دیا جائے تاکہ کسی دوسرے کو اس طرح کی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو!" ــــ سپاہی سزا سن کر بھی مسکراتا ہے۔ انگریز افسر سوچ میں پڑ جاتے ہیں، جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے یہ ــــ آفیسر کمانڈنگ ایک بار پھر سوچتا ہے۔ "ہوں!

اسے گولی سے اڑا دیا جائے۔ لیکن اس پر گولی کون چلائے گا ـــــ اگر کسی دوسرے قبیلے کا فرد اسے گولی مارے گا تو اس سے شہابی خیل وزیر اپنے ملکی دستور کے مطابق بدلہ لیں گے ـــــ" قاتل کو دوبارہ بلا کر پوچھا جاتا ہے۔ اب بھی اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے کوئی آثار نہیں ـــــ اس سے اس کی آخری خواہش دریافت کی جاتی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے ہی کسی بھائی بند کی گولی سے مرنا پسند کرے گا، دوسرے یہ کہ اس کی لاش اس کے وارثوں کے حوالے کر دی جائے۔ آفیسر کمانڈنگ اس کی دونوں باتیں مان لیتا ہے۔ وہ بخوشی ایک اونچے چبوترے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا ایک ہم قبیلہ عزیز جو اسی فوجی دستہ میں ہے، بندوق سے فائر کر کے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے، وعدے کے مطابق اس کی لاش اس کے ورثار کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ قبیلہ والے جشن مناتے ہیں اور اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ سارے وزیرستان میں ان کے قبیلے کا وقار بلند ہو گیا ہے۔ وہ اسے بڑے اعزاز سے دفن کرتے ہیں اور اس کی قبر پر جھنڈا گاڑ دیتے ہیں۔ علاقے کے تمام نوجوان قبر کی زیارت کو جاتے ہیں اور اُس کے اس قابلِ رشک کارنامے کو سراہتے ہیں۔ ہر جمعرات کو اس شہید کے مزار پر چراغ جلائے جاتے ہیں پھول چڑھائے جاتے ہیں اور اس کی بلندئ درجات کے لیے دعائیں ہوتی ہیں۔

وقت گزرتا جاتا ہے، لوگ اس واقعہ کو بھول چکے ہوتے ہیں ـــــ بنّوں چھاؤنی میں ایک نئی گورا پلٹن تبدیل ہو کر آ رہی ہوتی ہے، دریائے کُرّم کے پُل تک اُن کے اعزاز میں استقبالیہ محرابیں بنائی جاتی ہیں، بنّوں چھاؤنی کے تمام بڑے بڑے انگریز افسر اپنے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ نئی

گورا پلٹن کے استقبال کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ خود بریگیڈیر صاحب اور بریگیڈ میجر تمام انتظامات کی نگرانی کرتے ہیں۔ دریائے کرم کے پُل پر مہمانوں کی سلامی اتاری جاتی ہے پھر نئی پلٹن اور بنّوں کے فوجی دستے اپنے اپنے بینڈ بجاتے، فضاؤں میں نغمے بکھیرتے ہل کو بنّوں چھاؤنی کی طرف مارچ کرتے ہیں۔ وہ دریا کا پُل پار کر کے بنّوں کی سمت ایک خشک پہاڑی نالے کے چھوٹے سے پُل پر پہنچتے ہیں تو ایک دم نیچے سے گولی آتی ہے اور انگریز بریگیڈ میجر کے سینے میں پیوست ہو جاتی ہے جو فوجی پریڈ میں سب سے آگے آگے چل رہا ہوتا ہے ـــــ!

تمام گورا سپاہی بندوقیں تانے، سنگینیں چڑھائے ادھر کو بڑھتے ہیں جہاں سے گولی آئی تھی تو پھٹے پرانے کپڑے میں ملبوس ایک بے سروسامان شخص وہاں کھڑے مسکراتا نظر آتا ہے۔ تمام سپاہی چیلوں کی طرح اس پر جھپٹتے ہیں، یوں نظر آنے لگتا ہے کہ وہ اپنی سنگینوں سے اس کی تکا بوٹی کر دیں گے کہ بریگیڈیر صاحب انھیں ایسا کرنے سے روکتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ ملزم کو زندہ پکڑ کر پیش کیا جائے کہ تحقیقات مکمل ہو سکے ـــــ قاتل سے پوچھ گچھ ہوتی ہے تو وہ بھی شہابی خیل قبیلہ کا وزیر نکلتا ہے ـــــ اس سے قتل کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو ہنستے ہوئے کہتا ہے "میں نے یہ کام صرف اپنے قبیلے کا وقار بڑھانے کے لیے کیا ہے ـــــ صرف ثواب کی نیت سے اپنے ملک کے کافر دشمن کو مردار کیا ہے۔"

اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ فرانٹیر کرائمز ریگولیشن کے تحت اس پر مقدمہ چلتا ہے اور پھانسی کی سزا سنا دی جاتی ہے۔ اسے پھانسی گھاٹ پر لایا جاتا ہے تو وہ مردِ غازی ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ جب اُس سے اُس

کی آخری خواہش کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ مجھے میری گولی سے مرنے والے انگریز افسر کا عہدہ (رینک) بتا دیا جائے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ مقتول بریگیڈ میجر تھا تو اس کا چہرہ اُتر جاتا ہے، اُسے افسوس ہوتا ہے کہ اس نے یہ سمجھ کر گولی چلائی تھی کہ پریڈ میں سب سے آگے آگے جنرل یا بریگیڈیر صاحب ہوں گے، اسے کیا خبر کہ وہ تو بریگیڈ میجر نکلا —— غازی کو یہ حسرت رہ گئی کہ وہ انگریز جرنیل کا قاتل کہلانا چاہتا تھا نہ کہ صرف بریگیڈ میجر کا —— غازی کو پھانسی دے دی جاتی ہے اور اس کی لاش ورثاء کے حوالے کرنے کی بجائے رات کی تاریکی میں کہیں دفن کر دی جاتی ہے۔

اس واقعہ پر تھوڑے دن ہی گزرتے ہیں کہ ایک دن ساؤتھ وزیرستان سکاؤٹس کے ہیڈ کوارٹرز وانا میں کہرام مچ جاتا ہے۔ آفیسرز میس میں سکاؤٹس کا کرنل کمانڈنگ، پولیٹیکل ایجنٹ اور دو دوسرے انگریز افسر کھانے کی میز پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہوتے ہیں کہ ایک اردلی حواس باختہ دوڑا ہوا آتا ہے، یہ الفاظ کہ "صاحب! پٹھان سپاہی آگیا——" ابھی اس کے منہ ہی میں ہوتے ہیں کہ ایک وزیر سکاؤٹ رائفل ہاتھ میں لیے ہوئے نمودار ہوتا ہے اور آنکھ جھپکتے میں کرنل پر فائر کر کے اسے ڈھیر کر دیتا ہے۔

ہر طرف افراتفری مچ جاتی ہے۔ کچھ لوگ زخمی کرنل کو سنبھالنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور کچھ قاتل کو پکڑنے کے لیے —— قاتل بغیر مزاحمت کے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتا ہے —— ہیڈ کوارٹرز میں اس وقت سو دوسرے وزیر سپاہی بھی ہیں —— اُن کے سامنے وزیر سپاہی کو

سزا دینا خطرے سے خالی نظر نہیں آتا —— تو آدھی رات کو سوتے میں غازی کو جگایا جاتا ہے۔ راتوں رات اسے پھانسی دے دی جاتی ہے اور اس کی لاش کسی ایسی جگہ پھینک دی جاتی ہے جہاں سے اس کی ہڈیاں بھی دستیاب نہ ہو سکیں۔

○

مولانا محمد اسحٰق مانسہروی

تحریکِ خلافت کے عروج کے دن تھے اور مانسہرہ کی ایک مسجد ــــــ اس چھوٹی اور سادہ سی مسجد پر عدالتِ عالیہ کا گمان ہوتا تھا ــــــ دُور دُور سے لوگ اپنے مقدمے اور تنازعے لے کر آتے تھے اور مسجد کے مولوی صاحب بس چشمِ زدن میں ان کا فیصلہ سنا دیتے تھے۔ انگریز کی کچہریاں اور تھانے ویران پڑے تھے اور ٹوڈی خان بہادروں اور آنریری مجسٹریٹوں کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ یہ ۲۳-۱۹۲۲ء کا زمانہ تھا۔

ــــــ اور اب ۱۹۶۲ء کا ایک دن تھا، ایک نحیف و نزار ضعیف العمر شخص نے دل کے دَورے سے بچ جانے کے بعد آنکھیں کھولیں ــــــ عوام اور ارادت مند جمع تھے، ان سے مخاطب ہو کر کہا ــــــ "اب میں ایک سو پندرہ برس کا ہو گیا ہوں ــــــ اللہ کے بلاوے کا انتظار ہے ــــــ میرا اثاثہ یا تو یہ دینی کتابیں ہیں اور یا ایک گھوڑی جس پر سوار ہو کر میں قریہ بہ قریہ وعظ کے لیے جایا کرتا تھا ــــــ اب یہ دونوں چیزیں میرے کام کی نہیں، اس لیے میں کتابیں مسجد سے ملحقہ دینی مدرسہ کے لیے وقف کرتا ہوں اور نئے امام مسجد کی تحویل میں دیتا ہوں اور گھوڑی کی لگام اپنے وفادار خادم جمعہ خاں کے حوالے کرتا ہوں ــــــ اب میں سبکدوش ہو کر اپنے خالقِ حقیقی کے حضور جا رہا ہوں۔"

یہ تھے مولانا محمد اسحٰق مانسہروی ——— مشہور عالم دین ——— سحر بیان خطیب اور مجاہد فی سبیل اللہ، وہ مانسہرہ کے رہنے والے تھے اور دار العلوم دیوبند کے فیض یافتہ ——— مشہور قومی کارکن اشرف عطا، ان کی قلمی تصویر یوں کھینچتے ہیں :-

"سرو قامت، نورانی چہرہ، اعلیٰ درجہ کے شہسوار، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی جیتی جاگتی تصویر، اٹل ارادوں اور غیر متزلزل عزم کا انسان جس کے رگ و ریشہ میں انگریز کی سامراجیت کے خلاف جذبۂ جہاد جوش مار رہا ہو اور جس نے ساری سرزمین مانسہرہ کی رائے عامہ کو برطانوی ملوکیت کے خلاف منظم اور متّحد کر دیا ہو ——— وہ پکّا مسلمان اور اسلام کا سچا سپاہی تھا۔ اس کی آواز میں گرج تھی، تقریر میں خلوص اور جذبۂ ایمان تھا ——— وہ جرأت اور بے باکی کا مجسمہ تھا اور تحریک خلافت کا صفِ اوّل کا سالار!"

مولانا محمد اسحاق کی آتش بیانی نے برطانوی حکام کو آتش زیرِ پا کر رکھا تھا، وہ جہاں تقریر کرتے عوام برطانوی ملوکیت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور رضا کارانِ خلافت میں نام لکھواتے۔ لوگوں نے ان کے کہنے پر انگریز کی عدالتوں اور تھانوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا ——— کوئی واردات ہوتی تو معاملہ جرگہ میں پیش ہوتا اور قومی جرگہ کے ارکان اس کا فیصلہ کرتے ——— لین دین یا جائیداد کے بارے میں فریقین میں تنازعہ پیدا ہوتا تو مولانا محمد اسحٰق اور دوسرے علمائے دین شرعی قانون کے تحت اس کا فیصلہ کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مانسہرہ، کوہستان اور بالائی ہزارہ میں عملاً انگریز کی عملداری ختم ہو کر رہ گئی ہے ———

سرکارِ انگریزی کے ہوا خواہ لینڈ لارڈز خان بہادر اور آنریری مجسٹریٹ اس انقلاب پر بیٹھے سوچتے اور اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے۔ مولانا محمد اسحٰق کو سفیدہ کے خوانین غلام رسول خان، عبدالقیوم خان اور دوسرے قوم پرست زعماء کی سرگرم حمایت حاصل تھی اس لیے پولیس ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتی تھی۔ بالآخر حکومت نے فوج کو ان کی گرفتاری پر مامور کر دیا۔ ایک بار وہ کسی گاؤں میں تقریر کرنے جا رہے تھے کہ فوجی دستہ نے ان کا تعاقب کر کے گرفتار کر لیا۔ مولانا بتایا کرتے تھے کہ گرفتاری کے بعد انگریز حکام نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے تصوّر ہی سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ مولانا کو اوندھا لٹا کر ان کی پیٹھ پر انگریز پولیس افسر اور فوجی جوان بوٹوں سمیت کھڑے ہو گئے۔ بعد میں انھیں اس بے دردی سے زدوکوب کیا کہ وہ بار بار بے ہوش ہو جاتے رہے، کئی سالوں تک مولانا محمد اسحٰق صوبہ سرحد اور پنجاب کے جیل خانوں میں قید کاٹتے رہے، جہاں انھیں چکی بند کر دیا جاتا اور انھیں دس دس سیر دانے روزانہ پیسنے پڑتے، مولانا نے آزادیٔ وطن کی راہ میں ان تمام مصائب کو برداشت کیا، گھبرانے کی بجائے ان کا عزم و ارادہ اور مضبوط ہوتا گیا اور جب کبھی انھیں موقع ملتا وہ انگریزی سامراجیت پر ضرب لگانے سے کبھی نہ چوکتے۔

قید و بند کی سزا کاٹ کر جب وہ رہا ہوئے تو بھی انھیں مانسہرہ نہ جانے دیا گیا بلکہ سارے ہزارہ میں ان کے داخلے پہ پابندی لگا دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ساری زندگی غریب الوطنی میں بسر کی۔

جیل سے رہائی کے بعد اپنی وفات تک وہ راولپنڈی میں مقیم رہے، پہلے مرکزی جامعہ حنفیہ میں امامت اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے

رہے۔ اس دوران آپ کی تقریریں انگریز کے دل و دماغ پر چرکا لگاتی رہیں۔ حکومت نے جامعہ حنفیہ کے منتظمین پر زور دیا کہ یا مولانا کو سیاسی تقریروں سے روکا جائے یا انھیں ملازمت سے الگ کر دیا جائے۔ اس پر مولانا نے خود ہی اس ادارہ سے قطع تعلق کر لیا۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے راولپنڈی کے محلہ امام باڑہ میں انگور والی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ وہاں آپ امامت و خطابت بھی کرتے اور درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے۔ ان کی فیضانِ صحبت سے بہت سے نوجوانوں میں قومی جذبہ بیدار ہوا اور انھوں نے مولانا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگیاں ملک و ملت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ مولانا کے ان تربیت یافتہ حضرات میں "زمیندار" کے مدیر مولانا خدا بخش اظہر، مولانا محمد اسماعیل، کامریڈ عبدالغنی اور صوفی عنایت اللہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جب ان کے ایک اور ہم وطن قومی رہنما ملک امیر عالم اعوان مدیر "ترجمانِ سرحد" نے ہزارہ میں جاگیرداروں کے ظالمانہ رویّہ کے خلاف کسان تحریک چلائی اور مزارعین کو ان کے جائز حقوق دلانے کی کوششیں شروع کیں تو مولانا محمد اسحٰق نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

مولانا محمد اسحاق کو اپنے نامور اور مجاہد استاد مولانا سید انور شاہ سے بے حد عقیدت تھی۔ جب کبھی مولانا انور شاہ کو موقع ملتا وہ راولپنڈی آتے اور کچھ دنوں کے لیے مولانا محمد اسحٰق کے پاس قیام کرتے، مولانا محمد اسحٰق اکثر کہا کرتے تھے کہ جب کبھی مولانا انور شاہ کو دیکھتا ہوں صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگی میری آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور میرا قلب ایک گونہ تسکین و فرحت محسوس کرتا ہے۔

مولانا محمد اسحٰق مانسہروی کی وفات کے بارے میں اشرف عطا لکھتے ہیں کہ:

"۸ر دسمبر ۱۹۶۲ء بروز یک شنبہ معمول کے مطابق مولانا محمد اسحٰق

نمازِ فجر ادا کرنے کے لیے مسجد میں آئے، ابھی نماز میں چند منٹ باقی تھے کہ طبیعت یک دم بگڑ گئی ـــــ اپنے وفادار ملازم جمعہ خان کو آواز دی کہ مجھے فوراً چار پائی پر لٹا دو ـــــ جمعہ خان ابھی پوری طرح انھیں سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ مولانا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ـــــ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو پندرہ برس تھی لیکن کیا مجال جو کوئی نماز باجماعت چھوٹنے پائی ہو۔"

"دوسرے روز مولانا کو ان کے آبائی گاؤں حویلیاں میں ان کے آبائی قبرستان میں اپنے بڑے بھائی حکیم خلیل احمد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ مولانا محمد اسحٰق نے اپنا کُل ترکہ چار سو پینتالیس دینی کتابوں اور ایک گھوڑی کی صورت میں چھوڑا۔ کتابوں کی فہرست بنا کر اس کتب خانہ کو مسجد کے نئے امام اور خطیب مولانا سید چراغ شاہ کے سپرد کر دیا گیا جبکہ گھوڑی ان کے دیرینہ خادم جمعہ خان کے حوالے کر دی گئی۔"

کیا لوگ تھے جنھوں نے ساری ساری زندگی ملک و ملت کے مفاد کے لیے وقف کر دی، آج ہم آزادی کی نعمت سے مالا مال ہیں تو ایسے ہی مردانِ مجاہد کی قربانیوں کے طفیل ـــــ ان لوگوں کی داستانِ حیات میں ہمارے لیے بصیرت بھی ہے اور عبرت بھی۔

○

پیر امین الحسنات مانکی شریف

تحریکِ حصولِ پاکستان کا شمار دنیا کی عظیم ترین انقلابی تحریکوں میں ہوتا ہے۔ اس تحریک کی بدولت برصغیر کے مسلمانوں کو جہاں فرنگی کی سیاسی غلامی سے نجات ملی وہیں ہندو کی اقتصادی برتری سے بھی جان چھوٹی —— گویا یہ تحریک مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ بن گئی —— اس تحریک کے اسلامی کردار کے پیشِ نظر بڑے بڑے مشائخ کرام بھی اپنے گوشۂ خلوت کو چھوڑ کر علی الاعلان میدانِ عمل میں نکل گئے۔ انہی ہستیوں میں سے ایک پیر صاحب مانکی شریف بھی تھے —— یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر پیر مانکی شریف، پیر زکوڑی شریف اور دوسرے روحانی پیشوا تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیتے تو آج صوبہ سرحد بلکہ وطن عزیز کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

پیر امین الحسنات کے جدِ امجد حضرت پیر عبدالوہاب سلسلۂ قادریہ کے نامور سرحدی پیشوا حضرت اخون صاحب سوات رح کے خلیفۂ مجاز تھے۔ مشہور مجاہدِ اسلام حضرت نجم الدین ہڈہ ملّا صاحب ان کے پیر بھائی تھے۔ اپنے مرشدِ گرامی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حضرت عبدالوہاب رح نے بھی انگریزوں کے خلاف جہاد امبیلا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عبدالوہاب رح کا دائرۂ فیض بہت وسیع تھا۔ ان کے مرید عموماً "مانکی کے شیخ" کے نام سے پکارے جاتے

تھے۔ یہ لوگ اپنی بات کے دھنی تھے اور اپنے پیشوا کے کہنے پر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

حضرت عبدالوہابؒ کے بعد ان کے فرزند حضرت عبدالحقؒ اور پھر ان کے صاحب زادے حضرت عبدالرؤف باچا مانکی شریف کے گدی نشین رہے فروری ۱۹۲۲ء میں اسی پاکباز گھرانے میں پیر امین الحسنات کی ولادت ہوئی جو آگے چل کر شہرت کے آسمان پر سورج بن کر چمکے۔ امین الحسنات ابھی چھ ماہ کے تھے کہ والدہ ماجدہ کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ پھر دس گیارہ برس کے تھے کہ ان کے والد پیر عبدالرؤف بھی راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔ انھوں نے دینی اور دنیوی علوم کی تحصیل میں پوری کوشش کی اور اپنی روحانی ذمہ داریوں کو بھی نباہتے رہے۔

خاندان میں جائیداد کی تقسیم کے بارے میں کافی عرصہ سے تنازعہ چلا آرہا تھا جو ان کی فراست اور تدبر سے طے ہو گیا۔ دوست دشمن سب نے ان کا سلوک قابلِ قدر تھا۔ اپنے گرد و پیش کے حالات پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ ۱۹۴۵ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح صوبہ سرحد کے دورے پر آئے تو پیر صاحب نے اُن سے علیحدہ ملاقات کی اور ملاقات کے فوراً بعد مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

اس وقت تک سرحد مسلم لیگ زیادہ تر خان خوانین کی جماعت تھی۔ دیہات میں سرخپوشی کی جڑیں بڑی مضبوط تھیں، ان کے مقابلے میں کام کرنا آسان نہ تھا لیکن بفضلِ خدا پیر صاحب مانکی شریف کے مسلم لیگ میں آتے ہی ان کے ہزاروں "مُرید" خم ٹھونک کر میدان میں آگئے اور مسلم لیگ سرحد میں ایک مستحکم قوت بن کر ابھری۔ قریہ قریہ جلسے ہونے لگے، جلوس نکلنے لگے۔

مئی ۱۹۴۶ء میں مشائخ اسلام کی ایک کانفرنس پشاور میں منعقد ہوئی جس میں کوہوغہ شریف کے سجادہ نشین، فقیر صاحب آماخیل، فقیر صاحب شیوہ، حاجی محمد امین مجاہد صدر جماعت ناجیہ، پیر صاحب تونسہ شریف اور بھوٹان ملا صاحب جیسے زعماء نے شرکت کی۔ اسی طرح بنارس میں ہونے والی آل انڈیا سنّی کانفرنس میں بھی پیر صاحب مانکی شریف اور ان کے عقیدت مندوں نے بھرپور حصہ لیا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں مسلم لیگ نے سرحد کی کانگرسی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی مہم چلائی تو بھی پیر صاحب کے مریدوں نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پیر صاحب خود جگہ جگہ جاتے اور تقریریں کرتے۔ اس پر ۲۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو پیر امین الحسنات کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو رہائی عمل میں آئی تو انھوں نے ریفرینڈم کی کامیابی میں شاندار کردار انجام دیا۔ ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم صوبہ سرحد کے دورے پر آئے تو مانکی شریف بھی گئے اور پیر صاحب کی کوششوں کا اعتراف کیا۔

قیام پاکستان کے بعد عبدالقیوم خان سے ان کی بن نہ آئی لہٰذا انھوں نے غلام محمد خان لوند خوڑ اور دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مل کر عوامی مسلم لیگ بنالی۔ پیر صاحب مانکی شریف جنوری ۱۹۶۰ء میں سڑک کے ایک حادثہ میں وفات پا گئے۔

ملک عبدالغفار خان، دیر

صوبہ سرحد کی ریاست دیر کے عوام ایک سو سال تک مطلق العنان نوابوں کے ظلم و ستم سہتے رہے۔ انھیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی نہ علاج معالجہ کی سہولتیں میسّر تھیں، بات بات پر ناروا پابندیاں ان کا مقدر بن چکی تھیں، لوگ ظلم کی چکی میں پس رہے تھے لیکن انھیں فریاد تک کرنے کی آزادی نہ تھی۔ مطلق العنانیت کی اس اندھیری رات میں ملک عبدالغفار خان آفتابِ اُمید بن کر طلوع ہوئے۔

ملک عبدالغفار خان ۲۰ اپریل ۱۸۷۹ء کو ناگوتل نامی گاؤں میں پیدا ہوئے انھیں امید تھی کہ پاکستان بننے کے بعد نوابی دور ختم ہوگا اور دیر کے لوگ دوسرے علاقے کے پاکستانی بھائیوں کے دوش بدوش آزادی کے فوائد سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ لیکن اس کے لیے بڑی محنت اور تنظیم کی ضرورت تھی چنانچہ ملک عبدالغفار نے ہمّت کی، ایک خفیہ انجمن تشکیل دی، اس انجمن کے پلیٹ فارم سے دیر کی نوابی ریاست ختم کرنے کا مطالبہ رفتہ رفتہ زور پکڑتا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں یہاں تک نوبت آن پہنچی کہ نواب کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ریاست میں جگہ جگہ مزید قلعے تعمیر کرنے پڑے۔ اس نے مزید فوجی بھرتی کیے اور لوگوں کو اور بھی زیادہ سختی سے دبانا شروع کر دیا، تاہم لوگوں کا احتجاج بھی

دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ وہ بار بار حکومت پاکستان سے رجوع کرتے تھے کہ نواب کے مظالم کا نوٹس لیا جائے۔

دن بدن عوام کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا، آخر کار ریاست دیر کے سینکڑوں افراد پر مشتمل ایک جلوس مالاکنڈ پہنچا اور مسلسل تیرہ دن تک پولیٹیکل ایجنٹ مالاکنڈ کے دفتر کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھا رہا۔ بعد میں یہ جلوس پشاور اور لاہور بھی گیا اور متعلقہ حکام اور گورنر مغربی پاکستان کو اپنے جذبات و مطالبات سے آگاہ کیا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ نواب دیر عوام کی شکایات کا ازالہ کرتا اور انھیں سہولتیں مہیا کرتا لیکن ہوا یہ کہ اس احتجاجی مظاہرے پر نواب اور بھی بپھر گیا۔ اس نے ملک عبدالغفار خان اور عوامی تحریک کے رہنماؤں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔

۲۲ جون کو تحریک کے ایک رہنما عبدالعزیز خان کے گھر پر اچانک حملہ ہوا اور نواب کے کارکنوں نے اس کے گھرانے کے دس افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کے بعد ملک عبدالغفار خان کو نشانۂ ستم بنایا گیا اسے گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ پر رکھا گیا اور اسے سخت اذیتیں دی گئیں۔ اس کی زبان کاٹ دی گئی اور ہاتھ پاؤں باندھ کر گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس کی لاش پر پہرہ لگا دیا گیا اور عوام کی طرف سے پرزور احتجاج پر تین دن رات بعد اس کی لاش ورثاء کے حوالے کی گئی۔ بہر حال ان قومی شہیدوں کی قربانیاں رنگ لائیں، عوامی تحریک زور پکڑتی گئی۔ ظلم کی سیاہ رات ختم ہوئی، آزادی کا سورج طلوع ہوا۔

ریاست دیر ختم کر دی گئی۔ نواب کو معزول کر دیا گیا اور عوام کو پاکستان

کے دوسرے علاقوں کے رہنے والوں کی طرح ہر طرح کے قانونی حقوق دے دیے گئے۔

ملک عبدالغفار خان اپنی جراءت، مستقل مزاجی، خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کے لیے بہت مشہور تھے، اگرچہ اب وہ اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے ہیں تاہم دیر کے عوام ان کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔[1]

○

---

[1] ماخوذ ــــــ پروفیسر علاؤالدین خلجی۔

پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء کے سرحدی شہداء

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگوں کے شانہ بشانہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کے سرفروشوں نے بھی اپنے خون سے تاریخ کے زریں باب رقم کیے۔ ہزاروں نوجوانوں اور یونیورسٹی طلباء نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات حکومت کو پیش کیں، ہسپتالوں میں خون کے عطیات دینے والوں کی قطاریں لگ گئیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے حکومت سے کامل یک جہتی کا مظاہرہ کیا۔ خواتین اور لڑکیوں نے اپنا زیور تک اتار کر دفاعی فنڈ میں دے دیا۔ غرض ایک عجیب پاکیزہ جذبہ تھا جو ستمبر ۱۹۶۵ء کے جہاد کے دوران ہر پاکستانی کے سینے میں موجزن تھا، اسی جوش اور ولولہ کی بدولت پاکستانی افواج نے اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت کے دانت کھٹے کر دیے۔

صوبہ سرحد کے عوام نے بھی اس سلسلے میں تکلیفیں اٹھائیں، انھیں جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا لیکن ان کے حوصلے آخر تک بلند رہے۔ ۱۲ ستمبر کو بھارتی طیاروں نے پشاور، لنڈی ارباب اور کوہاٹ کی شہری آبادی پر وحشیانہ بمباری کی لیکن پاکستان کی طیارہ شکن توپوں کی کارگزاری اتنی عمدہ تھی کہ دشمن کو زیادہ نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا۔ پشاور میں صرف مال روڈ کے ایک بنگلہ کو نقصان پہنچا، بمباری سے عمارت کا ایک حصہ مسمار ہو گیا اور

چند لوگ جاں بحق ہوئے۔

لنڈی ارباب پر بمباری میں کچھ مکانوں کو نقصان پہنچا اور گیارہ افراد نے شہادت پائی، شہید ہونے والوں میں ایک معمر بزرگ بھی شامل تھا جو نمازِ تہجّد کے لیے بیدار ہوا تھا۔ ابھی وضو کے لیے کوزہ سنبھالا ہی تھا کہ بم آن کر گرا اور وہ شہادت کا مرتبہ پا گیا۔ مرنے والوں میں کچھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب بھارتی طیارے گاؤں کے اوپر سے گزرے تو بعض منچلوں نے چھت پر کھڑے ہو کر بندوقوں سے ان کا نشانہ لیا۔ بھارتی ہوا بازوں نے یہ خیال کیا کہ فائرنگ کسی فوجی چھاؤنی سے ہوئی ہے اس پر انھوں نے اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ گاؤں کی مسجد میں بہت بڑا تالاب تھا جس کا پانی رات کی چاندنی میں چمک رہا تھا، بھارتی سورماؤں نے اسے تیل کا ذخیرہ سمجھ کر بم گرانے شروع کر دیے جس سے مسجد کا کچھ حصہ شہید ہو گیا۔

سب سے زیادہ تباہی کوہاٹ میں ہوئی، دشمن کے طیاروں نے کوہاٹ شہر کے عین وسط میں محلہ فتح خان خیل پر بم گرائے۔ بمباری کا نشانہ بننے والے مکانوں میں سب سے زیادہ نقصان مولانا احمد گل کے مکان کو پہنچا۔ وہ ملبے کا ڈھیر بن گیا اور گھر کے تقریباً سبھی افراد موت کا لقمہ بن گئے۔

مولانا احمد گلؒ تحریکِ خلافت کے صفِ اول کے رہنما تھے۔ نہایت ہر دلعزیز اور ایثار پیشہ ـــــ ان کی ساری زندگی برطانوی سامراج کے خلاف جہاد میں گزری تھی ـــــ ان کے گھرانے کے افراد کی موت نے سارے کوہاٹ اور سارے صوبے کو غمزدہ کر دیا ـــــ مرنے والوں میں بچے اور عورتیں بھی اور بڑے بوڑھے بھی ـــــ دشمن کے طیاروں نے جو بم گرائے تھے ان میں سے کئی پھٹ نہ سکے تھے۔ بعد میں فوج اور پولیس نے ان بموں کو تلف کر دیا۔ اس کارروائی نے

کئی دنوں تک لوگوں کا امن و سکون غارت کر دیا۔ ہر لحظہ یہی خدشہ رہتا تھا کہ ان میں سے کوئی بم پھٹ نہ جائے۔

صوبہ سرحد کے جن فوجی افسروں اور جوانوں نے اس جہاد میں حصہ لیا ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، خود پاکستانی افواج کے سپہ سالار اور قائد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اسی صوبے کے فرزند تھے۔ وہ خود ایک ایک مورچے پر پہنچتے اور مجاہدین کو جنگی اہمیت کے مشورے دیتے۔ ان کے پُرجوش اعلانِ جہاد نے لوگوں کو نیا عزم اور ولولہ دیا۔ ساری قوم بھارتی جارحیت کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی اور ہمارے سرفروشوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ قرنِ اول کے مسلمان مجاہدین کی یاد تازہ ہو گئی۔

کوہاٹ کے بریگیڈیر قیوم شیر واہگہ محاذ پر جنرل سرفراز خان کے رفیق کار تھے۔ جنرل نے انھیں ایک نہایت خطرناک کام سپرد کیا۔ انھیں دریائے راوی کو پار کر کے اپنی فوج کو بی۔آر۔بی نہر کے مشرقی کنارے پر پہنچانا تھا۔ اس حال میں کہ دشمن بی۔آر۔بی نہر کا پُل اُڑا چکا تھا اور چھ میل تک کا سارا علاقہ انتہائی دلدلی تھا، یہ بے حد مشکل کام تھا لیکن بریگیڈیر قیوم شیر خان نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس ذمہ داری کو نبھایا اور لاہور کے دفاع میں نمایاں حصہ لے کر سب اہلِ وطن سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

کرنل صاحبزادہ گل (شہید) تحصیل ہنگو ضلع کوہاٹ کے گاؤں تورغ سرائے کے رہنے والے تھے۔ وہ کھیم کرن کے محاذ پر ایک دستے کی کمان کر رہے تھے، اگرچہ عام حالات میں کمانڈر اپنے دستے کے عقب میں رہتا ہے لیکن صاحبزادہ گُل اپنے مجاہدوں کے آگے آگے چلتے اور ان کی ہمت بڑھاتے تھے۔ انھوں نے دشمن کا مقابلہ اتنی بے جگری سے کیا کہ اسے میدان چھوڑ کر بھاگتے ہی بن پڑی اور

کھیم کرن فتح ہو گیا ـــ تاہم فتح کے بعد بھی کرنل صاحب زاد گل نے بھگوڑے بھارتیوں کا تعاقب جاری رکھا۔ ایک جگہ وہ اپنے سپاہیوں کو ہدایات دینے دینے کے لیے اپنے ٹینک سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک گولہ انھیں آن کر لگا اور وہ شہادت کا درجہ پا گئے۔

پشاور شہر کے محلہ سار بانان، علاقہ رامداس کے ایک معزز خاندان کے نورِ نظر میجر امان اللہ خان بھی ملک و ملت کی خاطر جان کی قربانی اور نذرانہ پیش کرنے والے مجاہدوں میں شامل تھے۔ ۳ر ستمبر ۱۹۶۵ئہ کو وہ آزاد کشمیر کے ٹیٹوال سیکٹر میں اپنے فرائضِ منصبی بجالانے کے سلسلے میں بہادری سے لڑتے لڑتے راہِ خدا میں شہید ہو گئے۔

میجر قاضی بشیر احمد ہوتی مردان کے ایک عالم فاضل گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ۵ر ستمبر ۱۹۶۵ئہ کو وہ بوڑیاں کے محاذ پر متعین تھے ـــ ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ہر وقت اپنے لڑاکا جوانوں سے آگے آگے رہتے۔ دشمن گولہ باری کرتا رہا لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی ـــ اسی عالم میں "شیل" کا ایک ٹکڑا آیا اور ان کے سینے کے دائیں جانب لگا۔ وہ سنبھل نہ سکے اور گرتے ہی اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔

میجر فخر عالم خان (برادر جنرل محمد اعظم خان) متھرا ضلع پشاور کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ بڑے دلیر اور باحوصلہ جوان تھے۔ خوف و ہراس اُن کے نزدیک تک نہ پھٹکتا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ئہ کے پہلے ہفتے میں بوڑیاں سے چار میل آگے دیوی پورہ کے مقام پر ٹینکوں کے ایک دستہ کی کمان کر رہے تھے، دشمن کے گولے آ آ کر گرتے لیکن اس حال میں بھی وہ اپنے ٹینک میں کھڑے ہو کر اپنے سپاہیوں کو ہدایات دیتے ـــ اسی حال میں ایک بار وہ دشمن کی پوزیشن کا

جائزہ لے رہے تھے کہ ایک گولہ آکر ان کے بازو پر لگا اور بازو جسم سے الگ ہو گیا۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود وہ بدستور آگے بڑھتے رہے اور دشمن کو سخت نقصان پہنچایا۔ خون بہتا رہا اور زندگی کی شمع ٹمٹمانے لگی — ایسے میں انھوں نے پوچھا "کیا ڈیوٹی پورہ فتح ہو گیا؟" — ساتھیوں نے کہا — "جی! فتح مبارک ہو!" یہ خوشخبری سن کر وہ آخری بار مسکرائے اور شہادت کا بلند مرتبہ پا گئے۔

میجر منیر خان ادرک زئی ہنگو ضلع کوہاٹ کے رہنے والے تھے، اُن کے والد بھی فوج میں افسر رہ چکے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ سپاہی کے طور پر فوج میں بھرتی ہو گئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ترقی کرتے کرتے میجر کے رینک تک پہنچے۔ ۷ ستمبر کو جوڑیاں کے محاذ پر دشمن سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے۔

کیپٹن عبدالجلیل ادرک زئی بھانہ ماڑی پشاور شہر کے رہنے والے تھے۔ پشاور یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ ایم۔اے انگلش کی تیاری کر رہے تھے کہ فوج میں کمیشن مل گیا۔ بڑے بلند اخلاق اور پُرعزم نوجوان تھے۔ نماز روزے اور دینی شعار کے پابند۔ ۷ ستمبر کو چھمب جوڑیاں محاذ پر مردانہ وار دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور ابدی زندگی پا گئے۔

میجر خادم حسین شہید استر زئی ضلع کوہاٹ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے رَن کچھ کے معرکے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ معرکہ ختم ہوا تو وہ کوئٹہ چلے گئے جہاں سے انھیں لاہور کے محاذ پر پہنچنے کا حکم ملا۔ وہ کوارٹر ماسٹر مقرر ہوئے۔ ایک روز وہ اپنی جیپ میں اگلے مورچوں کا معائنہ کر رہے تھے کہ ایک جگہ دشمن کے تین ٹینکوں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھا — پاکستانی مورچہ

عین سامنے تھا لیکن وہاں سے کوئی فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ فوراً اس مورچے کی طرف لپکے۔ معلوم ہوا کہ وہاں کا توپچی شہید ہو چکا تھا اور توپ کے دو گولے اس کے پاس پڑے تھے۔ اگرچہ توپ چلانا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا تاہم انھوں نے غیر معمولی شجاعت سے کام لے کر ایک گولے سے دشمن کا ایک ٹینک اور دوسرے گولے سے دوسرا ٹینک تباہ کر دیا۔ تیسرا فائر کرنے ہی والے تھے کہ دشمن کا ایک گولہ ان کے پاس آن کر گرا اور چشم زدن میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

فرانٹیر کور یا ملیشیا کے جانبازوں کا اصل کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے، تاہم جب ۱۹۶۵ء کا جہاد شروع ہوا تو ان جوانوں کی رگوں میں بھی خون کی گردش تیز ہو گئی ــــ انھیں محاذِ جنگ پر جانے کا موقع ملا تو انھوں نے اپنے خون سے تاریخ پاکستان میں جرأت و بہادری کا ایک شاندار باب رقم کیا ــــ اس چھوٹی سی فوجی جمعیّت نے تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اپنے عظیم کارناموں کی بدولت تیس ۳۰ فوجی اعزازات حاصل کیے جن میں سات ستارۂ جرأت، سات تمغۂ جرأت، دو ۲ تمغۂ بسالت اور چودہ امتیازی اسناد شامل ہیں۔

ستارہ جرأت پانے والے تھے صوبیدار نظر بند شہید، نائب صوبیدار بہرام گل، صوبیدار سمن گُل کوکی خیل، صوبیدار افضل گل شہید، نائب صوبیدار یعقوب خان آفریدی، صوبیدار میجر غلام مرتضٰے اور صوبیدار علی مدد ــــ تمغۂ بسالت کیپٹن سمندر خان اور کیپٹن خادم حسین نے پایا، تمغۂ جرأت حوالدار پائندہ خان، حوالدار عظیم خان شہید، سپاہی امام غلام اورک زئی، حوالدار گلی شاہ، لانس نائیک نور رحمٰن آدم خیل اور حوالدار رمضان شہید کو ملا۔

اسی طرح صوبیدار سمندر گل، کپتان رحیم بخش ناصر (چترال) کپتان سکندر خان (محسود) نور حسین طوری، حوالدار عظیم خان شہید، صوبیدار شیر اسلم شہید، سپاہی نیاز بادشاہ شہید، گل حسن خان شہید، ظہور عالم آفریدی شہید، آفریدی خان شہید، لفٹننٹ کرنل غلام حسن خان، محمود احمد شہید، گل رحمٰن شہید، میجر میاں رضا شاہ شہید، نورالبصر شہید، سخی احمد شاہ شہید، میر محمد خان خٹک شہید، محمد بلال شہید، میر محمد خان شہید، اجمل خان شہید اور محمد لطیف شہید کے علاوہ ہزاروں سرحدی سرفروش ہیں جو آسمانِ شجاعت پر چاند تارے بن کر چمکے اور آنے والی نسلوں کے لیے زرّیں روایات چھوڑ گئے۔

پاک فضائیہ نے بھی دشمن پر وہ کاری ضربیں لگائیں کہ دنیا عش عش کر اٹھی۔ سرزمین ہزارہ نامور فرزند ونگ کمانڈر (بعد میں ائیر چیف مارشل) انور شمیم، فلائیٹ لفٹننٹ ارشد سمیع، فلائیٹ لفٹننٹ غنی اکبر خان (صوابی) اور بیسیوں ایسے سرحدی ہوا باز اور افسر تھے جن کے نام ہماری قومی تاریخ سے کبھی محو نہ ہونے پائیں گے۔

۱۹۶۵ء کے اس جہاد میں ریاست سوات نے ایک ہزار مجاہدین کی خدمات حکومت کو پیش کیں۔ یہ غازی مختلف محاذوں پر افواجِ پاکستان کے شانہ بہ شانہ سرگرم عمل رہے، اسی طرح سرحدی ریاست دِیر کے کئی سو نوجوان رضاکار بھی شریکِ جہاد رہے۔

ایک عجیب قومی جوش اور ولولہ تھا جو ان دنوں دیکھنے میں آیا۔ افواج پاکستان کے سرفروش اپنے سے دس گنا بڑی طاقت کے مقابلے میں صف آرا ہوئے اور آزمائش کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے۔ انھوں نے اپنی قربانیوں سے دنیا بھر میں پاکستان کے وقار میں اضافہ کیا اور اس کی عزّت کو چار چاند لگا دیے۔

میجر امان اللہ خان شہید

پشاور شہر کے محلہ رامداس کے میجر امان اللہ خان شہید کا شمار شمعِ وطن کے ان پروانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ۱۹۶۵ء کے جہاد میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

امان اللہ خان بڑے ملنسار اور ہردلعزیز نوجوان تھے۔ بائیس ۲۲ برس کی عمر میں پشاور یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور پاک فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ان کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ دشمنانِ وطن کو شرمناک شکست دیں یا خود وطن کی آن پر قربان ہو جائیں۔

۱۹۶۵ء میں وہ اپنے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے چھٹی لے کر پشاور آئے ہوئے تھے کہ ہیڈ کوارٹرز نے انھیں واپس بُلا بھیجا۔ جونہی وہ ہیڈ کوارٹرز پہنچے انھیں ٹیٹوال سیکٹر پہنچنے کا حکم نامہ مل گیا، چنانچہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ وہاں پہنچے اور ڈیوٹی سنبھال لی۔

۳ ستمبر کو پاکستانی مورچوں پر دشمن کا دباؤ بہت بڑھ گیا۔ پاکستانی جوانوں نے امان اللہ خان کی قیادت میں زبردست شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ تاہم ان کی تعداد دشمن کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی۔ امان اللہ خان ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا کرتے تھے: "ساتھیو! جان لو، میدانِ جنگ سے منہ موڑنا مسلمان سپاہی کے شایانِ شان نہیں —— ہم آخر تک دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ نتیجہ جو ہو سو ہو!"

۴ ستمبر کی شام تک یہ مٹھی بھر سپاہی دشمن کے بالمقابل ڈٹے رہے۔ بھارتی سپاہی بار بار حملے کرتے اور پاکستانی جانباز انھیں پسپا کر دیتے۔ دو ۲ دنوں میں دشمن

ایک اِنچ بھی آگے نہ بڑھ سکا، چار ستمبر کو بھارتی فوجوں کو مزید کمک پہنچ گئی تو اس نے پاکستانی مورچوں پر پورے زور سے نیا حملہ کیا، پاکستانی جانبازوں کے لیے اب صورتِ حال انتہائی نازک ہو گئی۔ ایسے میں میجر امان اللہ خان سٹین گن لیے ہوئے مورچے سے نکلے اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح بھارتی فوجیوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے وہ بے دریغ فائرنگ کی کہ دشمن ہلاک ہو کر ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگے۔ اس اثناء میں مخالف سمت سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور امان اللہ خان کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل ہوئی ـــــ وہ شہادت کا رتبہ پا چکے تھے ـــــ وہ رُتبہ جو تمام دنیا کے عہدوں سے بالاتر ہے۔

ان کا آبائی محلہ اب ان کی یاد میں محلہ امان اللہ شہید کہلاتا ہے اور لوگوں کا یقین ہے کہ امان اللہ خان کی رُوح اب بھی اس محلہ میں بستی ہے۔

میجر خادم حسین شہید

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں صوبہ سرحد کے جن سپوتوں نے جامِ شہادت نوش کیا ان میں سے ایک میجر خادم حسین بھی تھے۔

میجر خادم حسین کوہاٹ کے خوش منظر اور خوب صورت گاؤں اُستر زئی کے رہنے والے تھے۔ بڑے ہنس مکھ اور بڑے جراءت مند نوجوان تھے ـــــ ۱۹۴۴ء میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں انھیں کمیشن ملا، شہادت سے چند ماہ پہلے تک وہ سٹاف کالج کوئٹہ میں سٹاف کیپٹن تھے۔

بھارت نے ۶ ستمبر کو بغیر کسی اعلان کے پاکستان پر دھاوا بول دیا تو میجر خادم حسین کو لاہور کے محاذ پر متعین کیا گیا۔ وہ قصور سیکٹر میں اپنے جوانوں کو اسلحہ سپلائی کرنے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک جگہ انھوں نے دشمن کو پیش قدمی

کرتے دیکھا۔ تین بھارتی ٹینک مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ پاکستانی مورچہ ان کے بالکل سامنے تھا تاہم جواب میں وہاں سے کوئی فائر نہیں ہو رہا تھا۔ خادم حسین فوراً پاکستانی مورچے کی طرف لپکے۔ قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پاکستانی توپچی شہید ہو چکا تھا اور توپ کے پاس ہی دو گولے پڑے ہوئے تھے ـــــ اگرچہ توپ چلانا میجر خادم حسین کے فرائض میں شامل نہ تھا لیکن وقت سوچنے کا نہیں بلکہ کچھ کر گزرنے کا تھا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر توپ کو سنبھالا اور دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔ انھوں نے ایک گولے سے دشمن کے ایک ٹینک کو نشانہ بنایا جبکہ دوسرے گولے سے دوسرے ٹینک کے پرخچے اڑا دیے۔ تاہم دشمن کا تیسرا ٹینک میجر خادم حسین کو کچلتے ہوئے آگے نکل گیا اور وہ جانباز دیکھتے ہی دیکھتے اپنے اللہ کے حضور جا پہنچا، تاہم ان کی قربانی رائیگاں نہ گئی اور دشمن کے تیسرے شرمن ٹینک کے بھارتی کمانڈر لفٹنٹ گل کو تھوڑی دیر کے بعد ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی۔ دشمن سینکڑوں لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگ نکلا اور میدان پاک فوج کے ہاتھ رہا ـــــ اس طرح میجر خادم حسین کی قربانی کام کر گئی، انھوں نے جان پہ کھیل کر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور وطن عزیز کی آبرو رکھ لی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے میجر خادم حسین کو ستارۂ جرات سے نوازا ـــــ میجر خادم حسین نے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا ـــــ پاکستان کو اپنے ان مجاہدوں پہ ناز ہے۔

میجر بشیر احمد خان

میجر قاضی بشیر احمد خان مردان کے ایک عالم فاضل گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا شمار وطنِ عزیز کے ان پاسبانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے کوڑیاں

کے بھارتی دفاعی قلعے کو نیست و نابود کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی عزیز جان بھی اس مقصد کے لیے قربان کر دی۔

قاضی بشیر احمد بڑے حسّاس نوجوان تھے۔ اسلام کی عسکری زندگی انھیں بڑی عزیز تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے سے قبل وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے پُرجوش کارکن بھی رہ چکے تھے۔ بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح سے انھیں حد درجہ عقیدت تھی۔ جب کبھی قائداعظم کا ذکر آتا، شدتِ جذبات سے اُن کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔ وہ پاکستان کی سالمیت اور شارعِ آزادی کے تحفظ کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے تھے۔ انھیں محاذِ جنگ پر جانے کا حکم نامہ ملا تو وہ اتنے شاداں تھے گویا ساری دنیا ہاتھ آگئی ــــ ایک خط میں انھوں نے گھر والوں کو لکھا:۔

"محاذِ جنگ پر میری موجودگی میرے لیے باعثِ فخر ہے اور آپ کے لیے موجبِ مسرت ــــ ہم دشمن کو وہ سبق سکھائیں گے کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔"

انھوں نے جو کچھ کہا، پورا کر دکھایا ــــ اپنے جانباز ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی بھارتی فوج کو پسپا کر کے جوڑیاں فتح کر لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک شیل انھیں آکر لگا اور وہ شمعِ وطن پر نثار ہو گئے۔

میجر بشیر احمد مرحوم نے اپنی زندگی کے تین آخری دن اتنے مصروف گزارے کہ انھیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہ تھا، ایک لحظہ آرام کیے بغیر وہ مسلسل دشمن کے سے دو دو ہاتھ کرتے رہے۔ اپنے ساتھیوں اور سپاہیوں میں وہ اتنے ہر دلعزیز تھے کہ جب ان کی میت گاڑی پر رکھ کر محاذ سے لائی گئی تو اسے دیکھتے ہی افسر اور

جوان سبھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

قاضی بشیر احمد اسلامیہ کالج پشاور کے گریجویٹ تھے۔ پاک بھارت جنگ کے دَوران جو خط انھوں نے اپنے گھر والوں کو لکھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے سینے میں ایک سچے مسلمان سپاہی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی باتیں تھیں، دشمن پر کامل فتح یا شہادت! ـــــ اللہ تعالیٰ نے ان کی دونوں تمنائیں پوری کر دیں ـــــ ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء میجر بشیر احمد خان کا یومِ شہادت ہے۔

کیپٹن عبدالجلیل شہید

پشاور علاقہ بھانہ ماڑی کی ایک سڑک ہے جلیل شہید روڈ۔ یہ سڑک اس علاقہ کے ایک بہادر فرزند کی یاد دلاتی ہے۔

عبدالجلیل اورک زئی بھانہ ماڑی پشاور کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بڑے خوش خُلق اور تندرست و توانا نوجوان تھے، نکلتا ہوا قد، روشن پیشانی اور عقابی نگاہیں ان کے پختہ عزم و ارادہ کی نشان دہی کرتی تھیں۔ بچپن ہی سے تعلیم اور کھیلوں میں نمایاں دلچسپی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، میٹرک اسلامیہ ہائی سکول پشاور اور بی اے ایڈورڈز کالج سے کیا۔ کچھ عرصہ تک ایک مقامی ہائی سکول میں پڑھاتے رہے۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ انگریزی میں ایم، اے کرنا چاہتے تھے، سال اوّل سے کامیاب ہو گئے، سال دوم کا امتحان پاس کرنے نہ پائے تھے کہ "او۔ ٹی۔ ایس" سے بلاوا آ گیا۔ فوجی تربیت کے دَوران بھی وہ اپنے ساتھیوں میں بڑے مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ شعائرِ اسلام کی پابندی ان پر ختم تھی، سخت گرمی کے دنوں میں فوجی مشقیں ہوتیں، کئی کئی میل دھوپ میں چلنا پڑتا لیکن عبدالجلیل روزے سے ہوتے۔ نماز پابندیٔ وقت کے ساتھ ادا کرتے۔

سگریٹ تک کو ہاتھ نہ لگاتے۔ اپنے فرائض منصبی سے کوئی وقت بچتا تو مطالعہ سے جی بہلاتے۔

چھمب جوڑیاں میں انھوں نے اپنے خون سے وہ داستانِ شجاعت رقم کی جو ہماری تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ اس محاذ پر وہ ۵ راگست سے سات ستمبر ۱۹۶۵ء تک مسلسل بھارتی حملہ آوروں کی مزاحمت کرتے رہے اور بہت سے دشمنوں کو جہنم رسید کیا۔ تاہم تنگ آکر سات ستمبر کو بھارت نے اپنی پوری قوت سے اس محاذ پر تازہ حملہ کیا، کیپٹن عبدالجلیل نے اس موقع پر بھی گھبراہٹ کا کوئی مظاہرہ نہ کیا۔ انھوں نے پورے اطمینان سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اپنے سپاہیوں سمیت دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ وہ دشمن کو بھاری زک پہنچا کر بدستور آگے بڑھتے گئے اور بھارتی مورچوں پر پاک پرچم لہرا دیا — جب تک ان کے دم میں دم رہا اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھاتے رہے، بالآخر دشمن کا ایک بم اُن کے پاس آکر پھٹا اور وہ جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کی یاد اہلِ وطن کے دلوں سے کبھی محو نہ ہونے پائے گی۔

کیپٹن ظہور الاسلام آفریدی

۱۹۶۵ء میں بھارتی فوجوں نے بغیر کسی اعلان کے رات کی تاریکی میں پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ وقت ہماری قومی زندگی کا ایک نہایت نازک تھا۔ دشمن کی فوج عددی طور پر ہماری فوج سے پانچ چھ گنا بڑی تھی۔ اسے اپنے اسلحہ کے انباروں پر ناز تھا۔ تاہم پاک فوج کے جیالوں نے اپنی بہادرانہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے دشمن کا منہ پھیر کر رکھ دیا — نتیجہ یہ ہوا کہ سترہ دن کی انتہائی تیز لڑائی کے بعد بھارتی سورما اپنے ہی زخم چاٹ رہے تھے — اس

مقدس جہاد میں جن پاکستانی جانبازوں نے شہادت کا مرتبہ پایا ان میں کیپٹن ظہور الاسلام آفریدی بھی شامل تھے۔

مجاہد ظہور الاسلام بابری بانڈہ کوہاٹ کے نامور آفریدی گھرانے کا بطلِ جلیل تھا۔ اس خاندان کے افراد نے وطنِ عزیز کی خدمت کا اعلیٰ ریکارڈ قائم کیا ہے۔ کیپٹن ظہور الاسلام کے والد کرنل تیمور خان بھی فوج میں شاندار خدمات انجام دے چکے تھے۔ گویا ظہور الاسلام کو شجاعت و جرأت کے اوصاف ورثے میں ملے تھے۔

ظہور الاسلام نے سینٹ لارنس کالج گھوڑا گلی میں تعلیم پائی۔ ایف۔ ایس سی کرنے کے بعد انھیں پاکستان ملٹری اکاڈمی میں تربیت پانے کا موقع ملا۔ وہاں سے کورس کی تکمیل پر انھیں بلوچ رجمنٹ میں کمیشن دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں دشمن کے خلاف جہاد کا موقع ملا تو انھوں نے بہادری کے وہ کارنامے دکھائے جن پر سبھی اہلِ قوم کے سر فخر سے بلند رہیں گے۔ بالآخر وہ ایک معرکہ میں زخمی ہونے کے بعد عین عالمِ شباب میں شہادت کی سعادت حاصل کر گئے۔ میّت وطن پہنچی تو ان کے نامور والد نے ظہور الاسلام کی پیشانی کو چومتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کا بلند اقبال صاحب زادہ منصب شہادت پا گیا۔

نیاز بادشاہ شہید

کوہاٹ ان بہادروں اور سرفروشوں کی سرزمین ہے جہاں کے لوگوں نے پاکستانی افواج کے پرچم تلے جرأت و عزیمت کی قابلِ فخر داستانیں رقم کی ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ان بہادروں نے اپنی جانوں پر کھیل کر اپنے سے کئی گنا بڑی بھارتی

فوج کا منہ پھیر کے رکھ دیا۔ کوہاٹ کے جن مایۂ ناز سپوتوں کو ان کی قربانیوں کے اعتراف میں فوجی اعزازات دیے گئے۔ انہی میں سے ایک نیاز بادشاہ شہید ستارۂ جرأت بھی تھے۔

شہید نیاز بادشاہ قبیلہ خٹک کے ایک ممتاز گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ وہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ضلع کوہاٹ کے مشہور قصبہ لتمبر میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی سے بڑا انڈر اور جری تھا۔ کھیلتا ہوا دور پہاڑوں میں نکل جاتا۔ نشانہ بازی میں گاؤں کا کوئی لڑکا اس کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ اس کے گھرانے کے اکثر افراد پاکستانی فوج میں خدمات انجام دے رہے تھے، اس لیے قدرتاً وہ بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلنے کا متمنی تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں وہ رینجرز میں بھرتی ہو گیا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات کو بھارتی فوج نے اعلانِ جنگ کیے بغیر ہی لاہور پر حملہ کر دیا تو نیاز بادشاہ اس وقت رینجرز کی چوکی بیدیاں میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ یہ چوکی بارڈر سے قریباً دو سو گز مشرق کو تھی۔ نیاز بادشاہ کے ساتھ چوکی میں کچھ دوسرے سپاہی بھی تھے۔ آدھی رات ہوئی تو بھارتی فوج کے ایک دستے نے اس الگ تھلگ واقعہ چوکی پر فائرنگ شروع کر دی۔ یہ حملہ بلائے ناگہانی سے کم نہ تھا۔ بھارتی سورما تینوں اطراف سے گولیاں برسا رہے تھے ——

لانس نائیک نے جو چوکی انچارج تھا باقی سپاہیوں کو ہدایت کی کہ فوراً ہیڈ کوارٹر جا کر فوجی کمک لائیں —— وہ چلے گئے تو چوکی میں یا تو وہ لانس نائیک رہ گیا یا سپاہی نیاز بادشاہ —— وہ دونوں جانباز دشمن کے بالمقابل ڈٹے رہے اور گولی کا جواب گولی سے دیتے رہے۔ تاہم دشمن کی فائرنگ تیز سے تیز تر ہوتی گئی —— ایسے میں لانس نائیک بھی اپنا فرض ادا کرتے کرتے جام شہادت نوش کر گیا تو سپاہی نیاز بادشاہ خٹک تن تنہا رہ گیا —— دشمن اب چوکی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ بھارتی

کمانڈر نے نیاز بادشاہ کو للکارا اور ہتھیار ڈالنے کو کہا ___ اس پر نیاز بادشاہ نے برجستہ جواب دیا۔ "میں پٹھان ہوں اور مسلمان ہوں اور ہتھیار ڈالنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔" بھارتی کمانڈر نے اس پر کہا ___ "کیا تمھیں اپنی جان عزیز نہیں؟" نیاز بادشاہ نے جواب دیا۔ "جان عزیز ہے لیکن ایمان اس سے بھی زیادہ عزیز ہے۔" ___ اس پر بھارتی کمانڈر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا ___ "چوکی کو گرنیڈ سے اڑا دو۔" چنانچہ دشمن کا ایک سپاہی عقبی دیوار پر چڑھ گیا۔ اور نیاز بادشاہ پر گرنیڈ پھینکا۔ ابھی وہ گرنیڈ پھٹنے بھی نہ پایا تھا کہ نیاز بادشاہ نے اوسان بجا رکھتے ہوئے وہی گرنیڈ اٹھایا اور دشمن پر دے مارا۔ دشمن سراسیمہ ہو کر رہ گیا تاہم وہ مسلسل گرنیڈ پھینکتا رہا ___ ایک بم نیاز بادشاہ کے سر پر آگر پھٹا اور اس کے ساتھ ہی نیاز بادشاہ نے اللہ اکبر اور اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کے لفظ کہے اور شہیدان راہ خدا کے زمرہ میں شامل ہو گیا۔ اس کی میت وطن لا کر دفن کی گئی ___ فیلڈ مارشل ایوب خان نے نیاز بادشاہ شہید کے ورثاء کو "ستارۂ جرأت" عطا کیا۔ قبیلے کو اس شیر دل شہید پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

میجر فخر عالم شہید

"ہمارے زندۂ جاوید مذہب اسلام نے ہمیں جہاد کی روح اور عسکری جذبہ سے کام لینے کی تعلیم دی ہے۔ ہم غازیوں کی طرح زندہ رہ کر یا شہیدوں کی طرح اس دار فانی سے رخصت ہو کر اس دنیا اور اگلی دنیا میں فلاح و نجات اور عزت و بلندی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں ___ ہمیں اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہے اور انشاء اللہ ہم کامیاب اور فتح مند رہیں گے۔"

یہ الفاظ ہیں وطنِ عزیز پاکستان کے ایک مایۂ ناز بہادر فرزند جنرل اعظم خان کے جو انھوں نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ایک اخباری بیان میں کہے ـــــ جنرل اعظم خان نے جو کچھ کہا، ان کے حقیقی بھائی میجر فخر عالم نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا اور وہ ملکِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر گئے۔

میجر فخر عالم خان موضع متھرا ضلع پشاور کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے، شروع ہی سے وہ ایک جرأت مند اور پُرعزم نوجوان تھے۔ خوف و ہراس ان کے نزدیک تک نہ پھٹکتا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے میں بوڑیاں سے چار میل آگے دیوی پورہ کے مقام پر ٹینکوں کے ایک دستہ کی کمان کر رہے تھے۔ عین گولہ باری کے وقت بھی وہ ٹینک سے نکل کر اپنے سپاہیوں کو ہدایات دیتے رہے۔ ایک بار اس وقت، جب وہ دشمن کی پوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے، ایک گولہ ان کے بازو پر آ کر لگا اور بازو جسم سے الگ ہو گیا تاہم اس زخمی حالت میں بھی وہ بدستور آگے بڑھتے گئے اور دشمن کو سخت نقصان پہنچایا۔ خون بہتا رہا اور ان کی زندگی کی شمع ٹمٹمانے لگی ـــــ ایسے میں انھوں نے پوچھا: "کیا دیوی پورہ فتح ہو گیا؟" ساتھیوں نے کہا: "جی! فتح مبارک ہو"! یہ خوشخبری سن کر وہ آخری بار مسکرائے اور خالقِ حقیقی کے پاس جا پہنچے۔

میجر منیر خاں اورک زئی

میجر منیر خان اورک زئی ہنگو ضلع کوہاٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد بھی فوج میں رہ چکے تھے، میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ سپاہی کے طور پر فوج میں بھرتی ہو گئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ترقی کرتے ہوئے میجر کے

رینگنے تک جا پہنچے۔ ۱۰ ستمبر کو جوڑیاں کے محاذ پر دشمن سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے۔

بہرام خان جانی خیل

افواج پاکستان کے شانہ بشانہ فرانٹیر کور کے جوانوں اور افسروں نے بھی ۱۹۶۵ء کے جہاد میں قربانیوں کی ایک لازوال داستان اپنے خون سے رقم کی، انہی میں سے ایک شمشیر آزما بہرام خان جانی خیل بھی تھے۔ بہرام خان موضع بنور خیل ضلع بنوں کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں ٹوچی سکاؤٹس میں سپاہی کے طور پر بھرتی ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں حوالدار اور ۱۹۶۳ء میں نائب صوبیدار ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں دشمن کے ایک مورچے پر حملہ کرنے کا حکم ملا۔ اگرچہ دشمن تین انچ دہانے کی خودکار توپوں سے مسلسل آگ برسا رہا تھا لیکن بہرام خان اور ان کے ساتھی شوق شہادت سے سرشار بڑھتے ہی چلے گئے۔ انھوں نے دشمن کی ایک پوری کمپنی کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ حال دیکھ کر دشمن کے باقی ماندہ سپاہیوں کو فرار ہوتے ہی بن پڑی اور مورچہ پاکستانی فوج کے قبضہ میں آگیا۔

میجر شاہ بہرام خٹک

میجر شاہ بہرام خٹک ایک سکواڈرن کی قیادت کر رہے تھے جس نے بتار تام گاؤں کے شمال مغرب میں مورچے قائم کر رکھے تھے۔ اس سکواڈرن پر دشمن سارا دن بکتر بند دستوں سے حملے کرتا رہا۔ دشمن کی کوشش تھی کہ وہ اس علاقے میں قدم جما کر سیالکوٹ پسرور روڈ کاٹ دے لیکن میجر شاہ بہرام خٹک اور ان کے ساتھی بے مثال جرأت کے ساتھ ان کے ہر حملے کو پسپا کرتے رہے اور

ان کا سکواڈرن عزم و استقلال کا پہاڑ بن کر میدان میں ڈٹا رہا، جرأت و عزیمت کے اس غیر معمولی مظاہرے پر میجر شاہ بہرام خٹک کو "ستارۂ جرأت" کا اعزاز دیا گیا۔

عظیم خان خٹک

قبیلہ خٹک کی سیتی خیل شاخ کے حوالدار عظیم خان نے اسلام کے ننگ و ناموس اور وطن کی حفاظت کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور "تمغۂ جرأت" سے نوازے گئے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ زوروں پر تھی۔ دشمن کے ایک مورچے سے پاکستانی افواج پر مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی۔ حوالدار عظیم خان کو حکم ملا کہ جیسے بھی ہو دشمن کے اس مورچے کو تباہ کیا جانا ضروری ہے۔ وہ اپنی مشین گن لیے بڑھتا ہی چلا گیا اور دشمن کے مورچے کو تہس نہس کر کے ہی دم لیا۔ دشمن کی لائٹ مشین گن سے عظیم خان خود بھی زخمی ہو گیا تاہم اپنی جان کی قربانی دے کر اس نے دشمن کی مشین گنوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ اس کی شاندار بہادری کے اعتراف میں اسے تمغۂ جرأت کا اعزاز دیا گیا۔

رحیم بخش ناصر

جنگ کا میدان گرم تھا۔ دشمن کے تازہ دم دستے مورچوں پر پہنچ رہے تھے۔ ایسے میں چترال کے جیالے فرزند رحیم بخش ناصر نے دیکھا کہ دشمن کی آمد و رفت کا واحد ذریعہ ایک پل تھا، کوئی چار سو فٹ لمبا۔ اس نے سوچا اگر یہ پُل تباہ کر دیا جائے تو دشمن کی پیش قدمی رک جائے گی، لیکن یہ کام کوئی آسان نہ تھا۔

اس میں جان کی بازی لگانی پڑتی تھی۔ رحیم بخش ناصر نے اپنے دو جانباز ساتھیوں کو لیا اور اس خطرناک مہم پر نکل پڑا۔ درختوں کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے وہ پُل کے قریب پہنچے۔ دشمن نے دیکھتے ہی ان پر بے دریغ گولیاں برسانی شروع کر دیں، تاہم ان سرفروشوں نے پیش قدمی جاری رکھی اور بالآخر اس پُل کو تباہ و برباد کر دیا۔

فضل گُل آفریدی

فضل گُل آفریدی ملک دین خیل قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے مجاہد والد کا نام سید گل تھا۔ فضل گُل نے ۱۹۴۱ء میں ملیشیا میں شرکت کی۔ فروری ۱۹۶۴ء میں اسے صوبیدار بنا دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں اسے بھارت کے خلاف جنگ میں بھیجا گیا۔ ایک مورچہ پر اُسے اپنے سے دس گنا بڑے فوجی دستہ سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ فضل گل نے وہاں اپنی روایتی بہادری کا مظاہرہ کیا، اس نے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا، تاہم بھاگتے ہوئے دشمن نے پاکستانی جوانوں پر بے دریغ فائرنگ کی۔ دشمن کی ایک گولی صوبیدار فضل گل کو لگی اور وہ جامِ شہادت نوش کر لیا۔ اس مثالی قربانی پر حکومت نے اسے "ستارۂ جراٴت" کے اعزاز سے نوازا۔

ان سرفروشوں کے علاوہ سمند گُل کگی خیل آفریدی، نور حسین طوری، گلا خان، سپاہی امام غلام، نائب صوبیدار یعقوب خان، میجر غلام مرتضیٰ، صوبیدار علی مدد، نظر بند شاہ، سکندر خان، پائندہ خان خٹک، گُل شاہ، نور رحمٰن آدم خیل، حوالدار محمد رمضان، میجر عبد الحلیم خان آفریدی، کپتان رضا شاہ کاکا خیل، صوبیدار گل نواز خان، کرنل ظفر خان شنواری، جہان زیب خان

ارباب، نصیراللہ خان بابر اور ہزاروں سرحدی مجاہدوں نے ۱۹۶۵ء کے اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ان میں سے اکثر سرفروشوں کو ان کی خدمات کے اعتراف میں اعلیٰ فوجی اعزاز دیے گئے۔ تمام غیور مجاہدوں نے پاک بھارت جنگ کو مقدّس جہاد سمجھ کر اس میں حصّہ لیا اور اپنے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ہر مشکل کا بہادری سے مقابلہ کیا، ان مجاہدوں کی جزاء صرف اور صرف وہی خالقِ دو جہاں دے سکتا ہے۔ یہ لوگ اپنی جانوں کا نذرانہ دے گئے کہ ان کے اہلِ وطن امن اور چین سے آزادی کی فضا میں زندہ رہ سکیں۔ اس سے مقدس جذبہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے؟

○

بیرسٹر محمد جان خان

بیرسٹر محمد جان خان عباسی کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ
"ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی"

وہ ایک شعلۂ جوّالہ تھے جنھوں نے اپنے نفسِ گرم سے ہزاروں دلوں میں آزادی کا جذبہ اور قومی خدمت کی تڑپ پیدا کی ـــــ اتنا مخلص اور ایثار پیشہ، اتنا قابل اور روشن خیال قومی رہنما دہلی، کلکتہ، بمبئی یا لکھنؤ میں ہوتا تو شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکتا لیکن محمد جان خان نے ساری عمر بنوں میں گزار دی، جہاں نہ ان کی صلاحیتیں منظرِ عام پر آسکیں، نہ قومی سطح پر ان کی قدر شناسی ہو نے پائی۔ تحریکِ خلافت میں بیرسٹر محمد جان خان کی خدمات کا اعتراف مولانا ظفر علی خان ایسے بطلِ جلیل نے یوں کیا ہے ؎

تجھے اے ہم نشیں! وہ دن بھی ہیں یاد
کہ پھٹ پڑنے کو ہم پر آسمان تھا

خلافت پارہ پارہ ہو چکی تھی
نشاں اسلامیوں کا بے نشاں تھا

اندھیرے میں بھٹکتے پھر رہے تھے
مصیبت میں ہمارا کارواں تھا

نکل کر دل سے رک جاتی تھی فریاد
کہ جس کو دیکھیے وہ بے زباں تھا

غرض اس ابتلاء میں ہر طرف سے
ہماری غیرتوں کا امتحاں تھا

کیا اس وقت جس نے سب کو بیدار
وہ اک بیدار طالع نوجواں تھا
خدا نے کی عطا جس کو یہ توفیق
اکیلا اک محمد جان خان تھا

نامور قومی کارکن، سیاسی رہنما اور صحافی اللہ بخش یوسفی اپنی قید کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"ایک شام کو کہ جیل کی بیرکیں بند ہو چکی تھیں، داروغہ جیل ایک لحیم شحیم، سرخ و سپید، بارعب و باوقار شخص کو ساتھ لے کر آیا جو سرخ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، بیرک کا دروازہ کھلا اور وہ شخص اندر داخل ہوا تو داروغہ یہ کہہ کر لوٹ گیا کہ یہ مہمان ایک رات آپ کے پاس ٹھہریں گے اور صبح "یورپین وارڈ" میں چلے جائیں گے۔"

نووارد نے آتے ہی جا نماز مانگا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ہم قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ کسی نے کہا "ترک ہے"۔ کسی نے کہا: "ایرانی ہے"۔ البتہ اکیلے عبدالرحمن نے کہا: گمان ہے کہ یہ محمد جان خان ہے" —— اور واقعی وہ محمد جان خان بیرسٹر ہی تھا۔ بنوں کے سول جج محمد بخش کا بیٹا جو آڈ نبرا سے بیرسٹری کی سند لے کر اور سات مختلف مضامین میں ایم۔اے کی ڈگریوں کے ساتھ انگلستان سے واپس لوٹا تھا اور آتے ہی مجلس خلافت کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگا تھا۔ انگلینڈ میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسری اہم سیاسی شخصیتیں اس کی ہم درس رہ چکی تھیں۔

وطن آتے ہی اسے ای۔اے۔سی (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) کا عہدہ پیش کیا جا چکا تھا لیکن اس نے سب کچھ ٹھکرا کر آزادئ وطن کی خاطر قلندری اور

قید و بند کی کٹھن راہ اختیار کی تھی، بعد میں وہ ڈسٹرکٹ بورڈ بنوں اور میونسپل کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ پنڈت نہرو نے قیام پاکستان کے بعد محمد جان خان کو ایک دوستانہ خط میں لکھا تھا:

"تمھارے اہلِ وطن نے تمھاری قدر نہیں کی، ہندوستان آؤ تو جس صوبے کی گورنری چاہو حاضر ہے۔"

لیکن محمد جان خان وہ مردِ مجاہد تھا جس نے اپنی ملت سے وفا کی اور جسے صرف اور صرف اللہ کی رضا مطلوب رہی، (اغلباً) ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

○

شہزادہ فضل دین

دنیا کی کسی قوم نے اپنی آزادی اور اپنے دین کی سربلندی کے لیے اتنی قربانیاں نہیں دیں جتنی صوبہ سرحد کے قبائلیوں نے ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک انگریز نے قبائلی علاقوں پر ہزاروں بار فوج کشی کی، ہوائی جہازوں سے بمباری کی لیکن یہ سب کارروائیاں مجاہدینِ اسلام کے جذبۂ جہاد کو دبا نہ سکیں ـــــ وزیرستان تو آخر تک میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرتا رہا۔

مُلّا پاوندہ وہ روحانی پیشوا اور مجاہد تھے جن کی قیادت پر وزیر، محسود سبھی متفق تھے۔ ان کی متحدہ قیادت میں وزیریوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ پہاڑی گوریلا لڑائی میں کوئی حریف بھی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ مُلّا صاحب کی وفات پر ان کے صاحبزادے شہزادہ فضل دین ان کے جانشین قرار پائے تو انھوں نے بھی انگریز کو ایک پل کے لیے چین نہ لینے دیا۔ وہ گدی نشین ہوئے تو جنگِ عظیم اوّل کا آغاز ہو چکا تھا اور انگریز اپنے ہی پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ مجاہدین کے منہ آتے ہوئے ڈرتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ شہزادہ فضل دین جیسے بطلِ جلیل کو اس کا ہمنوا بنا کر اس کی حمایت حاصل کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے پولیٹیکل حکام نے انھیں تین ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ اور پانچ سو گھوڑوں کی پیش کش کی لیکن اس مردِ مجاہد نے فرنگی کی تمام شرائط کو ٹھکرا دیا۔

شہزادہ فضل دین وزیرستان بھر کے دورے کرتے اور جہاں اپنے عوام کو اسلامی تعلیمات پر چلنے کی تلقین کرتے وہیں انھیں دشمنانِ دین کے خلاف جہاد کا درس بھی دیتے۔ ان کے ارادت مندان کے اشارۂ ابرو پر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے، جہاں کہیں کسی فرنگی فوجی کو دیکھتے وہیں ڈھیر کر دیتے ___ ٹانک میں پولیٹیکل ایجنٹ ڈاڈ اور کئی انگریز افسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو گورا سپاہی غصے میں آ کر ان کے قاتل سرفراز خان محسود (ملک شاہی) پر ٹوٹ پڑے تاہم سرفراز بے خوف ہو کر کھڑا رہا اور اس نے کہا بے شک مجھے مار دو۔ اب مجھے مرنے میں کوئی باک نہیں۔ میں کسی بڑے انگریز کو قتل کر کے اپنی بہادری منوانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میرے دل کی حسرت نکل گئی ہے"۔

تب انگریزوں نے محسود کے مشہور قصبہ خیسورہ پر حملہ کر کے اس واقعہ کا انتقام لینا چاہا لیکن سرفروشانِ وطن نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ انھوں نے ڈٹ کر انگریز کا مقابلہ کیا۔ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کا ڈھیر دیکھ کر گورا سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا اور وہ راہ میں سروکی ہی کے قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بالآخر جرگہ بلایا گیا اور جیسے بھی ہوا انگریز نے صلح کی شرائط مان کر بات آئی گئی کر دی۔

تارا گئے کے مقام پر مجاہدین اور انگریز کے سپاہیوں میں ایک بار پھر گھمسان کا رن پڑا۔ انگریز کو بے پناہ نقصان پہنچا اور اس کے قریباً چودہ ہزار سپاہی لڑائی میں کام آئے جبکہ غازیانِ اسلام میں سے کل دو سو چالیس (۲۴۰) نے جام شہادت نوش کیا۔ بظاہر یہ اعداد و شمار ناقابلِ یقین نظر آتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے غازیوں کی مدد کی۔ انگریز کے سپاہی لڑائی کی شدت کی تاب نہ لا کر بھاگے تو اپنی ہی توپوں کے گولوں کی زد میں آ گئے اور ان کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگیں۔

اس خونیں معرکے کے بعد انگریز نے پھر اپنی قوت مجتمع کی، کوٹڑا نے کے مقام پر پھر غازیوں اور فرنگی سپاہیوں کی ٹکر ہوئی، جب بری فوج کو ہارتے دیکھا تو انگریز ہوائی جہازوں سے کام لینے لگے۔ اس پر وزیریوں نے شاملک رامزئی پہنچ کر میران شاہ سے تازہ کمک طلب کی۔ دونوں طرف کے لڑاکا اس جوش و خروش سے لڑے کہ زمین زخمیوں کے خون سے سُرخ ہوگئی ــــ انگریز اس بار لڑتے لڑتے وانا پہنچ گئے۔ پھر پولیٹیکل ایجنٹ آگے بڑھے اور عارضی صلح کا اہتمام کیا تاہم قتل مقاتلے کی اکا دُکا واردات ہوتی رہی۔

شہزادہ فضل دین کی مجاہدانہ قیادت میں وزیر اور محسود قبیلوں نے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۵ء تک فرنگی کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ ایک طرف نادار، قلاش اور پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے غازی ہوتے تو دوسری طرف دنیا کے سب سے بڑھ کر مسلح اور تربیت یافتہ برطانوی فوجی۔ محسود قوم سے بڑے بڑے نامور لڑاکا اٹھے، شمن خیل کے محمد و مضان خان اور لنگر خیل کے عیسو رخان بڑے مشہور گوریلا لیڈر تھے۔ ان کے مجاہدوں نے انگریزوں کی بائیس فوجی چوکیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ توروام، کانی گرام، شکائی، شامینہ کے مقامات پر ان کی فرنگی سے سخت جھڑپیں ہوئیں۔ کئی دن تک ہوائی جہاز ان علاقوں پر مسلسل بمباری کرتے رہے۔

شہزادہ فضل دین گوریلا لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ میدانِ سیاست کے شہسوار بھی تھے۔ برصغیر کی سیاست سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی۔ کانگرس کی تحریکِ آزادی سے ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ بعد میں قائدِاعظم محمد علی جناح کی قیادت میں تحریکِ پاکستان نے زور پکڑا تو شہزادہ فضل دین نے اس کی بھرپور حمایت کی۔ بہار میں مسلم کش فسادات کا سلسلہ چل نکلا تو انھوں نے محسود رضا کار بہار بھیجے تاکہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے مظالم سے بچایا جا سکے۔ کشمیر کے جہاد کے دوران

بھی محسود رضاکاروں نے بڑی جرأت اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ شہزادہ فضل دین نے قائدِ اعظم اور قائدِ ملت لیاقت علی خاں سے ملاقات کی۔ قائدِ اعظم نے ان کی بڑی قدر افزائی کی، جب ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت میں وزیرستان کا دورہ کیا تو قبائلیوں کے مطالبہ پر ساری فوجیں وہاں سے واپس بُلا لیں، قبائلی لوگوں کو پاکستان میں تجارت، کاروبار اور ملازمتیں کرنے کی اجازت دی۔ ان کے لیے سکول اور کالج قائم کیے اور اس طرح قبائلی مجاہد بھی اپنے دوسرے پاکستانی بھائیوں کے دوش بدوش وطنِ عزیز کی ترقی اور استحکام میں مصروف نظر آنے لگے۔

شہزادہ فضل دین حقیقی معنوں میں محسود کے بے تاج بادشاہ تھے تاہم غرور اور تکبر ان کے نزدیک تک نہ پھٹکتا تھا۔ وہ سادگی اور انکساری کا نمونہ تھے۔ اور ایک مثالی اسلامی زندگی گزارتے تھے۔ انھوں نے ۳ر فروری ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔ جنازہ میں لاکھوں افراد نے شرکت کی اور سبھی لوگوں نے اتفاق رائے سے ان کے منجھلے صاحبزادے وجاہ الدین کو اس مردِ مجاہد کا جانشین منتخب کیا۔

○

غازی عبدالجلیل

غازی عبدالجلیل بھی عجب مردِ قلندر تھے! — فرنگی سپاہی کی گولی نے ان کی ایک ٹانگ بے کار کر دی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو بستر سے لگ جاتا لیکن یہ بندۂ خدا گولیاں کھا کر بھی ملک و ملت کی خدمت میں مرتے دم تک پیش پیش رہا۔ کون ہے جو ایسے سرفروش کو خراجِ تحسین پیش نہ کرے۔

غازی عبدالجلیل ۱۹۱۴ء میں پشاور کے محلہ گدائی خان (موجودہ مسلم مینا بازار) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام فقیر محمد تھا جو ٹوپیاں بیچ کر گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ عبدالجلیل بچپن ہی سے بڑے سرگرم، فعال اور چاق و چوبند تھے۔ دس بارہ برس ہی کی عمر سے قومی تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔ ابتداء میں خلافت کے کارکن رہے، پھر تحریکِ ترکِ موالات میں پیش پیش نظر آئے۔ نو عمری ہی میں چار ماہ کی قید کاٹی — ۲۳/ اپریل ۱۹۳۰ء کے اس جلوس میں شامل تھے جس پر گورا فوج نے قصہ خوانی بازار میں گولی چلائی۔ فائرنگ ختم ہوئی تو دوسرے رضاروں سے مل کر شہیدوں کی لاشیں اٹھا رہے تھے کہ گرفتار کر لیے گئے چونکہ ابھی کم عمر ہی تھے اس لیے مہینے سوا مہینے کے بعد رہا کر دیے گئے۔

۳۱/ مئی ۱۹۳۰ء کو ایک سکھ گنگا بشن سنگھ اور اس کے بیوی بچے تانگہ میں قصہ خوانی بازار سے گزر رہے تھے کہ نشے میں بدمست ایک گورا سپاہی نے

ان پر گولی چلا دی۔ بے گناہ سکھ کے دونوں نو عمر بچے مارے گئے۔ اس سے اہلِ پشاور میں بڑا اضطراب پھیل گیا۔ لوگ جمع ہو گئے اور انھوں نے دونوں بچوں کی لاشوں کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس انتہائی پرامن تھا، اس کے باوجود جب جلوس کے شرکاء بازار کلاں میں محلہ باقر شاہ کے پاس پہنچے تو فرنگی فوجیوں نے پھر ان پر گولی چلا دی۔ غازی عبدالجلیل نعرے لگاتے ہوئے جلوس کے آگے آگے تھے۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی آکر انھیں لگی اور وہ بائیں بازو سے محروم ہو گئے۔ انھوں نے اس پر بھی ہمت نہ ہاری۔ زخمی ہو کر دوبارہ اٹھے ہی تھے کہ دوسری گولی ان کی بائیں ٹانگ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ لڑکھڑا کر گرے تو ایک اور گولی آکر لگی لیکن جان بچ گئی۔ ہسپتال پہنچائے گئے۔ علاج ہوا لیکن ساری عمر کے لیے ایک ٹانگ اور ایک بازو سے محروم ہو گئے۔

خدمتِ خلق ان کا شیوہ تھا۔ خاکسار تحریک کا چرچا ہوا تو خاکسار سپاہی بن گئے۔ ہر وقت خاکی وردی زیب تن رہتی۔ بگل بجانے میں بڑے مشاق تھے۔ ان کا بگل سن کر دل جوش مارنے لگتے۔ پھر تحریک پاکستان کا زور ہوا تو سبز وردی میں ملبوس جواں ہمت غازی عبدالجلیل ہر جلوس کے ساتھ رواں دواں نظر آتے۔ انتہائی مخلص اور ایثار پیشہ انسان تھے۔ ساری عمر کسی سے کوئی سوال کیا نہ مدد چاہی۔ قومی کاموں میں، دینی جلسوں میں، جلوسوں اور جنازوں میں معذور ہونے کے باوجود ہمیشہ پیش پیش رہتے، بازار کلاں کی فائرنگ کو اکثر مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔ بتایا کرتے تھے کہ میں نے جوش میں آکر ایک گورا فوجی سے بندوق اور سنگین چھین لی۔ اس پر چار گورے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ تین گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو گئیں لیکن قومی غیرت کے تحت میں نے اُف تک نہ کی۔

کچھ عرصہ ہوا غازی عبدالجلیل بیمار ہوئے اور چل بسے تاہم جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے انھیں یقین ہے کہ وہ بہادر انسان مر نہیں سکتا۔ وہ زندہ ہے زندہ رہے گا۔

○

محمد اکبر خان قریشی

انھیں غلامی کے لفظ سے چڑ تھی ـــــ وہ چاہتے تھے ایسی جگہ چلے جائیں جہاں آزادی ہو، اخوت ہو، مساوات ہو اور کوئی کسی کے درپے آزار نہ ہو، چنانچہ انھوں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر عزیز غریب الوطنی اور قید خانوں میں گزار دی ـــــ یہ تھے ہزارہ کے محمد اکبر خان قریشی۔

محمد اکبر خان قریشی ہری پور ہزارہ کے تاریخی شہر میں رسالداریاں کے قدیم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان بدخشاں سے نکل کر پہلے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ستھانہ کی بستی میں آباد ہوا اور پھر اس خاندان کے افراد نے نقل مکانی کر کے ہری پور ہزارہ کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا۔

محمد اکبر خان قریشی بچپن ہی سے بڑے ذہین اور حساس طالب علم تھے۔ قرون اولی کے مسلمان غازی ان کے آئیڈیل تھے۔ ان کے عظیم کارنامے پڑھ کر وہ بھی دنیا میں کچھ نمایاں کارنامہ کرنے کے متمنی تھے۔ ان کے دل میں اسلاف کا جذبہ جہاد انگڑائیاں لے رہا تھا اور وہ کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب تھے ـــــ ہری پور سے میٹرک پاس کرنے کے بعد محمد اکبر خان نے اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ لیا جہاں انھیں میاں اکبر شاہ بدرشی، گوہر رحمن خان درویش اور دوسرے ہم خیال حریت پسند نوجوانوں کی رفاقت میسر آئی۔ ابھی بی۔ اے میں پہنچے تھے کہ سیاسیات میں حصہ لیتے

لگے، بالآخر ان سب دوستوں نے تہیہ کر لیا کہ غلام ملک کو چھوڑ کر کسی آزاد ملک کی طرف نکل جائیں۔

میاں اکبر شاہ کا کہنا تھا کہ محمد اکبر قریشی بظاہر بہت خاموش لیکن بباطن بڑے اولوالعزم انسان تھے۔ وہ روزانہ دس دس پندرہ پندرہ میل پیدل چلتے تاکہ آئندہ چل کر سفر کی صعوبتیں برداشت کر سکیں، بالآخر ۱۹۲۰ء میں اپنے پانچ ہمراہیوں کے ساتھ پہلے وہ آزاد علاقہ مہمند میں پیکرِ حریت حاجی فضل واحد صاحب ترنگزئی کے پاس پہنچے۔ کچھ عرصہ ان سے تربیت حاصل کی، پھر سینکڑوں میل کا پیدل سفر کرتے ہوئے افغانستان کے راستے روس جا پہنچے جہاں انھیں اشتراکی نظامِ حیات کا نہایت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔

دس بارہ برس تک وہ روس میں مقیم رہے اور جب وہاں سے دل بھر گیا تو وطن کو لوٹے تو فرنگی سامراج نے انھیں "اشتراکی" ہونے کی پاداش میں گرفتار کر کے دفعہ ۱۲۱الف کے تحت تین تین سال قید کی سزا سنا دی، ابھی وہ یہ سزا کاٹ ہی رہے تھے کہ ایک دوسری "بالشویک" سازش میں شرکت کے الزام میں ان کی قید میں سات سات سال کی مزید توسیع کر دی۔

طویل قید کاٹ کر محمد اکبر خان قریشی جیل سے باہر نکلے تو خاکسار تحریک کی سپاہیانہ زندگی اور عسکریت نے ان کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچا۔ انھوں نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا لیکن جب اپنوں ہی کی سازشوں نے اس جہاد آموز تحریک کا گلا گھونٹ دیا تو محمد اکبر خان قریشی بھی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

قیام پاکستان سے قبل انھوں نے اسمبلی کے لیے الیکشن بھی لڑا لیکن کچھ ووٹوں سے ہار گئے۔

محمد اکبر خان قریشی نہایت طباع اور باعمل انسان تھے۔ انھوں نے ہری پور

ہزارہ میں "ہزارہ نرسری" کے نام سے ایک نہایت کامیاب زرعی فارم بنایا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شالی کاشت کار متصور ہوتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے "مسلم تجارتی کمپنی" کے نام سے ایک کاروباری ادارے کی بنیاد بھی رکھی۔

ایک انتہائی مصروف زندگی گزارنے کے بعد محمد اکبر خان قریشی نے یکم مارچ ۱۹۷۲ئہ کو دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

○

حضرت بادشاہ گل صاحب

اہل سرحد کی ذہنی بیداری کا سہرا حضرت حاجی صاحب ترنگزئی علیہ الرحمۃ کے سر ہے، وہ پہلے زعیم ہیں جنھوں نے جگہ جگہ اسلامی مدرسے قائم کیے، لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا اور معاشرتی رسوم و رواج کی اصلاح پر توجہ دی۔ یہی نہیں بلکہ وطن عزیز میں آزادی کی سبھی تحریکیں بھی انہی کے زیر سایہ پھلی پھولیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا گہرا رابطہ رہا۔ ان کی ساری عمر جہاد فی سبیل اللہ میں کٹ گئی اور انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی فرنگی اقتدار کو قبول نہ کیا۔

بادشاہ گل اسی مجاہد باپ کے مجاہد بیٹے تھے۔ ان کا اصل نام فضل اکبر تھا، شاعر بھی تھے اور "بلنوم" تخلص فرماتے تھے، تاہم چھوٹے بڑے سبھی لوگ انھیں بادشاہ گل ہی کے نام سے جانتے۔ بادشاہ گل صاحب ۱۸۸۲ء میں ترنگ زئی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پہ حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی کو فرنگی حکومت نے گرفتار کرنا چاہا تو وہ ہجرت کر کے علاقہ آزاد مہمند کو ہجرت کر گئے، بادشاہ گل بھی اس ہجرت میں ان کے ہمراہ تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے وہ حضرت حاجی صاحب کے جانشین بھی تھے اور دست راست بھی۔ فرنگی فوجوں نے بونیر کی طرف پیش قدمی تو حضرت بادشاہ گل

کی کمان میں قبائلی مجاہدوں نے اُن کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں سرکاوی اور ملندری کے محاذ پر بھی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو فتح عطا کی اور اتنے بڑے لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے باوجود فرنگی کو ان محاذوں سے پسپا ہوتے ہی بن پڑی۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک فرنگی فوجوں نے مہمند مجاہدوں پر پے بہ پے کئی حملے کیے، قیامت کے معرکے پڑے۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا معرکہ شبقدر کے مقام پر ہوا جس میں فرنگی نے پوری پلٹنیں، توپ خانہ اور ہوائی جہاز تک لڑائی میں جھونک دی تھیں تاہم اللہ تعالیٰ نے بے سروسامان مجاہدین کی لاج رکھ لی اور فرنگی لشکر انھیں زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے۔

حاجی صاحب ترنگ زئیؒ کے جوشِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ ہر محاذ پر پہنچتے اور مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتے، یہاں تک کہ جب چلنے سے معذور ہو گئے تو ارادتمند انھیں چارپائی پر لٹا کر محاذِ جنگ پر لے جاتے۔ ۱۹۳۷ء میں حاجی صاحب کی رحلت کے بعد حضرت بادشاہ گل کو ان کا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا گیا۔ وہ غازی آباد کی مسجد اور لنگر بھی چلاتے اور فرنگی سازشوں اور حملوں کا مقابلہ بھی کرتے، جہاں انھوں نے برصغیر کی دوسری اسلامی تحریکوں کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی وہیں تحریک پاکستان کا بھی پورا ساتھ دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد حضرت بادشاہ گل صاحب وزیرِ اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کی دعوت پر پشاور تشریف لائے تو انھیں صوبائی مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی کا رکن چن لیا گیا۔ بعد میں وہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں جب قائدِ اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے صوبہ سرحد کے دورے پر تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں جناح پارک پشاور میں ایک بہت بڑے جلسۂ عام

کا اہتمام کیا گیا۔ صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے حضرت بادشاہ گُل جی نے اس موقع پر قائداعظم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔

فروری ۱۹۴۹ء میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ نے کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس بلایا تو بھی صوبہ سرحد کے وفد کی قیادت حضرت بادشاہ گل جی نے کی، انہی کی دعوت پر مفتیٔ اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور کئی مقامات پر جلسوں سے خطاب کیا۔ حضرت بادشاہ گُل کی عظمتِ کردار کا یہ عالم تھا کہ دن بھر جہاد بالسیف میں گزرتا اور ساری رات اللہ کی عبادت میں، وہ روحانی پیشوا بھی تھے اور دنیاوی رہنما بھی۔ ادیب اور شاعر بھی اور مبلغِ اسلام بھی۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔

○

حکیم محمد اسلم سنجری

بیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی انگریز نے مسلمان ملکوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں، ان دنوں عالم اسلام پر بڑا کٹھن وقت تھا۔ زیادہ تر مسلمان ملک انتہائی پس ماندہ اور بے سروسامان تھے۔ بعض پہلے ہی فرنگی کے دام تزویر میں آ چکے تھے۔ ایران انگریز کے زیر اثر تھا لے دے کے نگاہیں اٹھتی تھیں تو ترکی کی طرف یا افغانستان کی طرف۔ افغانستان کا بھی یہ عالم تھا کہ امیر حبیب اللہ درپردہ انگریز سے ملا ہوا تھا۔ صرف افغانستان کے عوام میں اسلامی جذبہ موجود تھا ——— ایسے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، حاجی صاحب ترنگ زئی اور دوسرے حریت پسند علماء نے فرنگی کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کیا ——— "حزب اللہ" اور "جنود اللہ" کی جماعتیں منظم کیں۔ مختلف مراکز کے لیے امیر مقرر کیے گئے اور پروگرام بنایا گیا کہ ترکی افغانستان کی راہ اپنی فوجیں اور اسلحہ آزاد قبائلی علاقوں کو بھیجے اور پھر مختلف مراکز سے سرکاری علاقہ کے مختلف شہروں میں انگریز کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا ——— اس سلسلے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے حاجی صاحب ترنگ زئی کو امیر المجاہدین مقرر کیا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ ترنگ زئی سے ہجرت کر کے علاقہ مہمند میں مرکز جہاد قائم کریں۔

پشاور کے جن دو مجاہد بھائیوں نے اس تحریک جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ حکیم اسلم سنجری اور محمود سنجری تھے۔ تحریک حزب اللہ کا وہ خفیہ اجلاس جس میں انقلابی نوعیت کے یہ فیصلے کیے گئے، بھی سنجری صاحب ہی کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت شیخ الہند کے قاصد خاص مولانا سیف الرحمان الکوزئی، مولانا فضل ربی، مولانا عبدالعزیز، طورو ملا صاحب، ملا صاحب سنڈاکیے۔ مولانا تاج محمد بی۔اے، مولانا احمد گل کوہاٹ، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، حکیم محمد اسلم سنجری اور محمود سنجری نے شرکت کی۔ اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ تحریک کا ہر رکن اپنے حلقۂ اثر میں لوگوں کو انگریز کے خلاف جہاد کے لیے تیار کرے۔

تحریک حزب اللہ کے کئی شعبے تھے۔ کوئی شعبہ مجاہدین پر مشتمل تھا کوئی مالی معاونت کرنے والوں پر، کوئی اسلحہ کی فراہمی پر اور کوئی نامہ و پیام پہنچانے پر۔ سارا پروگرام خفیہ اور پُرخطر تھا۔ بڑا اور پہلا کام تو خلیفۃ المسلمین سے جہاد کا فتویٰ حاصل کرنا تھا کیونکہ اس فتویٰ کے بغیر جہاد کو "اسلامی جہاد" قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے شیخ الہند خود عازم حجاز ہوئے۔ کسی طرح جہاد کا فتویٰ حاصل کیا۔ اب اس فتوے کو مختلف مسلمان ملکوں اور علاقوں کے لوگوں تک پہنچانا تھا جس کے لیے تحریک ریشمی رومال شروع کی گئی لیکن جلد ہی اس منصوبے کا پردہ بھی چاک ہو گیا اور انگریز کی سی۔آئی۔ڈی نے اسے ناکام بنا کر رکھ دیا۔

باقی مقامات میں تو جہاد کی اس اسکیم پر عمل درآمد نہ ہو سکا البتہ قبائلی علاقہ کافی عرصہ تک اس کا مرکز بنا رہا۔ مختلف محاذوں پر انگریزی قلعوں اور فوجی چوکیوں پر حملوں کا سلسلہ ہوا جس سے انگریز کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہو گئیں۔

حکیم محمد اسلم سنجری نے اس سلسلے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور اس سلسلے میں اپنی جان تک کو داؤ پر لگا دیا۔

محمد اسلم سنجری ۱۸۹۵ء میں پشاور شہر کے قاضی گل احمد خان سنجری کے ہاں پیدا ہوئے۔ یہ عالم فاضل خاندان احمد شاہ ابدالی کے ساتھ افغانستان سے آکر پشاور میں آباد ہوا تھا۔ قاضی گل احمد انگریز افسروں کو اردو، پشتو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے اور اسی مناسبت سے "آفیسر منشی" کہلاتے تھے۔ یہ خاندان شروع ہی سے اسلامی اور قومی تحریکوں سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ جنگ بلقان شروع ہوئی اور انگریز نے ترکی، طرابلس اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں پر مظالم ڈھانے شروع ہو گئے تو سنجری برادران بھی عملاً میدانِ جہاد میں کود پڑے۔ نوجوان اسلم تحریک حزب اللہ کا سرگرم کارکن بن گیا اور پشاور سے اسلحہ اور روپیہ پیسہ آزاد قبائل لے جایا کرتا تھا۔ یہ انتہائی مشکل کام تھا۔ ساتھ ہی یہ نوجوان انقلابی صوبہ سرحد اور آزاد قبائل کی ایک ایک بستی میں جاتا اور لوگوں کو غیرت دلاتا کہ اُدھر انگریز نے ترکی پر حملہ کر دیا ہے اور تم ابھی چپکے بیٹھے ہو۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگ غازی آباد پہنچتے اور حاجی صاحب ترنگ زئی کے مجاہدوں میں شامل ہو جاتے۔

حزب اللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ بونیر کے علاقے میں انگریز کے خلاف محاذ کھولا جائے۔ لیکن ایک رکن نے، جو در پردہ انگریز کا ایجنٹ تھا، سارا راز فاش کر دیا۔ ابھی مجاہدین پوری طرح جنگی تیاری بھی نہ کرنے پائے تھے کہ فرنگی فوجیں مجاہدین پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کے باوجود ایک ایک غازی ڈٹ کر لڑا۔ بونیر سرکاؤی کے محاذ پر ۲۵ مجاہدوں اور دو توپوں کی کمان محمد اسلم سنجری کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں میں سے مولانا سیف الرحمٰن، حضرت بادشاہ گُل نے کمال بہادری کا مظاہرہ کیا۔ تھوڑی تعداد میں ہونے ہوئے بھی انھوں نے فرنگی لشکر کے چھکے چھڑا دیے۔ جنگ ختم ہوئی تو میدان گورا سپاہیوں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ بعد میں کڑپہ کے مقام پر معرکہ ہوا تو غازی اسلم سنجری کے ہاتھ پر سنگین کا زخم آیا۔

ایک بار غازیوں کے پاس اسلحہ ختم ہو چکا تھا۔ اسلم کو پشاور بھیجا گیا۔ ایسے موقعوں پر وہ بھیس بدل کر "مہاجر کاشغری" کے فرضی نام سے سفر کیا کرتا تھا۔ تاہم انگریز کی خفیہ پولیس اور

مخبر سایہ کی طرح پیچھے لگے رہتے تھے۔ رات کو پولیس نے چھاپہ مار کر اسلم سنجری کے مکان کا گھیراؤ کر لیا، لیکن اللہ کی شان کہ وہ اسلحہ اور گولہ بارود جو ہندوستان سے آیا تھا، محفوظ رہا۔ پولیس کی تلاشی کے وقت وہ اسلحہ تہ خانہ میں تھا لیکن کسی کو ادھر جانے کا خیال تک نہ آیا۔ اسلحہ پہنچانے والا حزب اللہ کا ایک مجاہد ڈاکٹر عبدالکریم تھا جو صدرالدین کے فرضی نام کے تحت اِدھر اُدھر آیا جایا کرتا تھا۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔

اسلم سنجری کے ایک اور ساتھی اکبر مجاہد تھے۔ یہ دونوں حزب اللہ کے شہباز کہلاتے تھے۔ بالآخر انگریزوں نے ان دونوں پر مقدمہ قائم کیا اور مختلف شہادتوں کی بناء پر دونوں کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ یہ حکم ایسا تھا جس کے خلاف نہ کوئی اپیل تھی نہ دلیل۔ صرف رحم کی درخواست گورنر کو بھیجی جا سکتی تھی لیکن دونوں مجاہدوں نے اپنے والدین اور لواحقین کو انگریز سے رحم مانگنے سے منع کر دیا۔ اکبر مجاہد کو پھانسی دے دی گئی لیکن عین پھانسی کے دن اسلم سنجری کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ چیف کمشنر سر روس کیپل اسلم سنجری کے والد کا شاگرد تھا اور ان سے پشتو پڑھتا رہا تھا۔ اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنے استاد کے بیٹے کو پھانسی پر لٹکائے۔ بعد میں اسلم سنجری جیل میں بیمار ہو گئے تو ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم جیتنے کی خوشی میں انھیں رہا کر دیا گیا۔

۱۹۱۹ء میں اسلم سنجری اور محمود سنجری دونوں بھائی رولٹ ایکٹ کے مخالفانہ مظاہروں میں حصہ لینے پر گرفتار ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ انقلابی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ فرنگی نے گرفتار کرنا چاہا تو حلیہ بدل کر افغانستان چلے گئے لیکن فرنگی نے وہاں بھی انھیں چین سے نہ چھوڑا اور کابل حکومت کو کہہ کر قید کرا دیا۔

قیام پاکستان کے بعد دونوں بھائی واپس وطن آئے اور طبابت کرنے لگے۔ محمود سنجری ۱۹۵۲ء میں فوت ہو گئے جبکہ حکیم اسلم سنجری ڈھکی نعل بندی پشاور پر مطب کرتے رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ بھی راہی ملک بقا ہوئے۔

میاں بشیر احمد صدیقی

۶ر مئی ۱۹۲۶ء کا دن تھا۔ پشاور کے عوام صبح ہی سے مضطرب ہو کر بازاروں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اس دن برطانیہ کا وارث تخت و تاج (پرنس آف ویلز) پشاور آ رہا تھا۔ فرنگی حکومت کی پوری کوشش تھی کہ شہزادے کا پورے طمطراق سے استقبال ہو لیکن اہلِ پشاور ہر قیمت پر اس استقبال کو ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ جونہی پولیس کی نظر آنے والے رضاکاروں پر پڑتی وہ انھیں گرفتار کرنے کے لیے لپکتی۔

اتنے میں بارہ تیرہ برس کا ایک جوشیلا لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ رضاکارانِ خلافت اسے سمجھاتے ہی رہے لیکن وہ پروانۂ حریت گرفتاری دینے پر بضد رہا —— اور گرفتاری دیے بغیر نہ ٹلا —— یہ لڑکا بشیر احمد صدیقی تھا جو آگے چل کر خاکسار تحریک کا قائدِ ثانی قرار پایا۔

۱۹۳۰ء کے قیامت خیز دنوں میں جب گورا فوج کے نہتے مظاہرین پر فائرنگ کر کے سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں تڑپا دیا تھا۔ بشیر احمد صدیقی پھر میدان میں نکلا اور انگریزی سامراج کے خلاف جہاد کرنے والوں کی ہر ممکن مدد کی۔ وہ رضاکاروں کے قیام و طعام کا بندوبست کرتا، قید ہونے والوں کے پس ماندگان کو مالی امداد پہنچاتا اور ان کے مقدموں کی پیروی کرتا۔ حکومت اس کا کہاں تک

لحاظ کرتی، بالآخر اسے گرفتار کر کے دو سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

ایک وقت تھا جب بشیر احمد صدیقی کا تجارت خانہ "بشیر سٹورز" قصہ خوانی پشاور کا سب سے بڑا تجارتی ادارہ تھا لیکن اس نے سب کچھ قومی تحریکوں پر لٹا دیا اور خود درویشی اختیار کر لی ـــــ بشیر احمد صدیقی علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کے بڑے مداح تھے، سالہا سال تک قیام پشاور کے دوران علامہ صاحب بھی صدیقی صاحب کی صلاحیتوں کو بھانپ چکے تھے۔ انھوں نے اسے خاکسار تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو صدیقی صاحب نے ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو خاکسار تحریک میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ بشیر صدیقی نے پشاور میں خاکساروں کو بڑی دانشمندی سے منظم کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر روز شام کو ہر بازار میں خاکسار جیش فوجی پریڈ کرتے نظر آنے لگے۔ اس پر فرنگی حکومت کا ماتھا ٹھنکا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر اور گورنر سرحد نے علامہ صاحب کو بلایا اور معاملات ان کے سامنے رکھا۔ انگریز کے خیال میں خاکسار تحریک راتوں رات خطرناک بن سکتی تھی ـــــ بالآخر خاکساران صوبہ سرحد کو حکومت کی عائد کردہ کئی پابندیاں قبول کرنی ہی پڑیں۔

۱۹۳۷ء میں صوبہ سرحد میں کانگرسی حکومت بنی تو اس نے خاکساروں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ایک بار کانگرسیوں نے اکوڑہ خٹک میں نماز مغرب ادا کرتے ہوئے خاکساروں پر حملہ کر کے کئی ایک کو زخمی اور ہلاک کر دیا اور زخمیوں اور لاشوں کو دریائے کابل میں پھینک دیا۔ تاہم صدیقی صاحب کی فراست سے بات زیادہ بڑھنے نہ پائی۔

۱۹۳۷ء میں علامہ مشرقی نے انھیں صوبے کا پہلا ناظم اعلیٰ مقرر کیا تو اس نے حکومت پنجاب سے تین مطالبات منوانے کے لیے شاندار کردار انجام دیا۔ ۱۹۳۹ء میں یو۔پی کی کانگرسی حکومت نے خاکساروں کے خلاف محاذ کھول دیا تو بھی سالار خاص ہند

کی حیثیت میں میاں بشیر احمد نے سرفروشانہ کردار انجام دیا۔
قومی تحریکوں کے سلسلے میں انھوں نے دس بارہ برس تک فرنگی کی قید کاٹی۔ وہ انتہائی ایثار پیشہ انسان تھے۔ نحیف و نزار ہونے کے باوجود وہ انتہائی اولوالعزم تھے اور اصولوں پر کبھی سودا نہ کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں خاکسار تحریک کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو بشیر احمد صدیقی روپوش ہوگئے تاہم ان کی سرگرمیوں میں فرق آنے نہ پایا۔ ۲۵ر اگست ۱۹۶۳ء کو علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کی وفات پر انھیں خاکسار تحریک کا قائد منتخب کیا گیا۔ تاہم بیماری اور ضعیفی کے باوجود انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمت خلق اور فروغ تحریک خاکسار میں صرف کیا، فروری ۱۹۸۳ء میں یہ مرد ایثار پیشہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔

○

خان عبدالغفار خان

۲۰؍ دسمبر ۱۹۸۷ء کو وطن عزیز کا وہ نامور فرزند اس دنیا سے چل بسا جو ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ تک صوبہ سرحد کے میدانِ سیاست پر چھایا رہا۔ کوئی اس بزرگ رہنما کے سیاسی نظریات سے اختلاف تو کر سکتا ہے لیکن اپنے عوام میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں اس نے انجام دیے اس سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی ــــ پاکستان، بھارت اور افغانستان ہر جگہ اس کا سوگ منایا گیا اور ہر آنکھ اس کے لیے پُرنم رہی۔

خان عبدالغفار خان نے بڑی طویل عمر پائی اور اس عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ قومی خدمت میں گزارا۔ وہ جنوری ۱۸۹۰ء کو ہشت نگر (پشاور) ایک سرسبز و شاداب گاؤں اتمان زئی کے ایک آسودہ حال زمیندار بہرام خان کے ہاں پیدا ہوئے ــــ بہرام خان ایک مدبّر اور روشن خیال انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں عبدالجبار خان (ڈاکٹر خان صاحب) اور عبدالغفار خان کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ دی۔ ابتداء میں انھیں میونسپل بورڈ سکول پشاور میں داخل کیا، پھر ایڈورڈز مشن ہائی سکول میں بھیجا جہاں وہ پادری وِگرم کے مشفقانہ رویہ سے بڑے متاثر ہوئے۔ نومبر ۱۹۰۶ء میں بڑے بھائی عبدالجبار خان ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے پہلے بمبئی اور پھر ۱۹۰۹ء میں انگلستان گئے۔ ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر بننے کے بعد انھوں نے انڈین میڈیکل

سروس میں ملازمت کرلی جہاں سے ۱۹۲۲ء میں وہ کیپٹن کے عہدے سے مستعفی ہو کر پشاور چلے آئے اور کلینک کھول لیا۔

عبدالغفار خان فوج میں بھرتی کے خواہاں تھے۔ وہ بھرتی کے لیے فوجی دفتر گئے لیکن وہاں ایک نوجوان انگریز افسر کو اپنے سے سینئر دیسی افسر سے بدسلوکی کرتے دیکھ کر ان کا ارادہ بدل گیا ۔ وہ کچھ عرصہ تک علی گڑھ میں بھی پڑھتے رہے، والد چاہتے تھے کہ انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجیں لیکن ماں کی ممتا آڑے آئی۔ وہ بیک وقت دونوں بیٹوں کو جدا کرنے پر آمادہ نہ ہوسکیں۔ اس طرح عبدالغفار خان گاؤں ہی میں زندگی بسر کرنے لگے۔

خان عبدالغفار خان شروع ہی سے قومی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی نے علاقے میں آزاد قومی مدرسے قائم کیے تو عبدالغفار خان بھی ان کے معاون بن گئے۔ ۱۹۱۵ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی جہاد کی نیت سے ترنگ زئی کو چھوڑ کر علاقہ آزاد مہمند کو چلے گئے تو ان کی مدرسوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری خان عبدالغفار خان کے کندھوں پر آن پڑی۔ وہ مولانا محمود الحسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریک جہاد میں بھی رضاکارانہ کام کرتے رہے۔ فرنگی کہاں برداشت کرسکتا تھا کہ کوئی نوجوان خان اس طرح قومی خدمت کے میدان میں سرگرم عمل آئے۔ اس نے ان کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا۔ چھاپے میں عبدالغفار خان تو نہ پکڑے گئے البتہ پولیس ان کے معمر والد کو پکڑ کر لے گئی۔ جب عبدالغفار خان گاؤں آئے اور انھیں اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔ وہ کچھ عرصہ تک قید رہے لیکن رہا ہوتے ہی پھر میدان عمل میں اتر پڑے۔ ۱۹۱۹ء میں سائمن کمیشن کی آمد پر ہونے والے مخالفانہ مظاہروں میں بھی انھوں نے سرگرم حصہ لیا۔

اسی دوران برصغیر میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان اور دوسرے سرکردہ زعماء کی کوششوں سے یہ جماعت ملک کی پہلی انقلابی اور عوامی جماعت ثابت ہوئی۔ دوسرے سیاسی کارکنوں کے شانہ بشانہ عبدالغفار خان بھی خلافت اور ہجرت کی تحریکوں میں پیش پیش رہے جس پر ۱۹۲۱ء میں انھیں تین سال کے لیے قید کر دیا گیا۔

جیل سے نکلے تو ملک بھر میں تحریکِ عدم تعاون اور خلافت زوروں پر تھی۔ اس وقت کانگرسی کارکن بھی خلافت ہی کے پلیٹ فارم سے عوام کو اپنا پیغام پہنچایا کرتے تھے۔

صوبہ سرحد میں باہمی مناقشوں، فضول رسم و رواج اور تعلیم کے فقدان کی وجہ سے لوگ بڑے پسماندہ تھے۔ نہ انھیں اقتصادی خوش حالی میسر تھی نہ سیاسی آزادی۔ قوانین جرائم سرحد اور غازی ایکٹ جیسے ظالمانہ قوانین نافذ تھے جن کے تحت حکومت جب چاہتی اور جسے چاہتی جیل میں ڈال دیتی۔ ان دفعات کے خلاف نہ کوئی اپیل تھی نہ دلیل۔ تعلیم یافتہ اور حساس پختون نوجوانوں کے لیے یہ صورتِ حال بڑی ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں اتمان زئی میں ایک اجلاس بلایا گیا جس میں میاں جعفر شاہ، میاں احمد شاہ بیرسٹر، میاں عبداللہ شاہ قاضی خیل، خان عبدالغفار خان، حاجی عبدالغفار خان، عباس خان، مولانا محمد اسرائیل محمد اکبر خان خادم، عبدالاکبر خان عمر زئی، میاں عبدالمعروف اور تاج محمد خان (چارسدہ) نے حصہ لیا۔ اس میں معاشرے میں پھیلے ہوئے فضول رسم و رواج کی اصلاح اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے "انجمنِ اصلاحِ افاغنہ" کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی، جس کے صدر حاجی عبدالغفار خاں اور سیکرٹری میاں احمد شاہ بیرسٹر تھے۔ اس انجمن کے تحت جامعہ ملیہ دہلی کی طرز پر آزاد قومی مدرسے قائم کیے گئے۔ انجمن

کے ارکان اصلاحی پروگرام کے سلسلے میں ہر گاؤں میں جاتے اور لوگوں پر زور دیتے کہ وہ اپنے مقدمے پنچایتوں کے ذریعے حل کریں اور اسلامی سادگی اختیار کریں۔

پشاور میں قومی تحریکوں کا دور رہا۔ اس سلسلے میں ۱۹۲۷ء میں جمعیت العلمائے ہند کی سالانہ کانفرنس بھی صوبہ سرحد کے دارالحکومت میں منعقد ہوئی جس سے لوگوں کا قومی جذبہ اور بھی قوی ہو گیا۔

یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو اتمان زئی میں نوجوانوں کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں "خدائی خدمت گار" کے نام سے ایک رضاکار تنظیم کی داغ بیل پڑی۔ عمر زئی کے عبدالاکبر خان کو اس کا صدر اور میاں احمد شاہ بیرسٹر کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔۔۔ نوجوان رضاکاروں کے صدر سرفراز خان اور سالار رب نواز خان قرار پائے۔

اتمان زئی کا آزاد قومی مدرسہ بڑا کامیاب رہا۔ ہر سال اس کا سالانہ جلسہ بڑی شان سے منعقد ہوتا۔ اس موقع پر مشاعرہ بھی ہوتا جس میں شعراء قومی نظمیں پڑھتے اور ایسے ڈرامے بھی دکھائے جاتے جن سے جذبۂ آزادی کو تقویت ملے۔

۱۹/۲۰ اپریل ۱۹۳۰ء کو اتمان زئی کے آزاد مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا۔ ہر طرف خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے علاوہ پہلی بار اس میں نسواری وردیوں میں ملبوس سینکڑوں نوجوان رضاکار بھی شامل ہوئے تھے۔ اجلاس کے اختتام پر خان عبدالغفار خان نے آزادیٔ وطن کے موضوع پر بڑی پُرجوش تقریر کی جس کے بعد ایک ڈرامہ بھی سٹیج کیا گیا۔ اسی سٹیج سے مشہور قومی کارکن مولانا خان میر ہلالی نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ پشاور شہر میں کانگرس کمیٹی کی طرف سے نکلنے والے ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کے جلوس میں شرکت کریں۔

پشاور میں کانگرسی اور خلافتی کارکنوں کی طرف سے سول نافرمانی کی مہم جاری

تھی۔ چند دن پیشتر شاہی باغ پشاور میں خان علی گل خان کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں بیّی سے شورہ منگا کر نمک بنایا گیا۔ اس نمک کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں سَو سَو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے میں فروخت ہوئیں۔

دوسرے دن (۲۲ اپریل ۱۹۳۰ء) کو حکومت نے سرکردہ قومی کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ تاہم سبھی رضاکار اس رات تک گرفتار نہ ہو سکے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کی صبح کو گھنٹہ گھر کے پاس سے پولیس نے کچھ کارکنوں کو گرفتار کیا جب انھیں کابلی تھانہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو چوک یادگار پر کچھ لوگوں نے پولیس کی گاڑی کے ٹائر پھاڑ دیے۔ اس پر اللہ بخش برقی اور غلام ربّانی سیٹھی کی قیادت میں جلوس پیدل ہی تھانہ کابلی کو چل دیا۔ جونہی یہ جلوس قصہ خوانی بازار میں پہنچا، سامنے سے انگریز ڈپٹی کمشنر کابلی دروازہ سے آرمرڈ کاریں لے کر نمودار ہوا۔ آرمرڈ کاریں اس تیز رفتاری سے جا رہی تھیں کہ ایک نوجوان شہری ایک کار کی زد میں آ کر جاں بحق ہو گیا۔ یہ دیکھ کر دوسرے لوگوں نے کسی دکان سے مٹی کے تیل کا ایک کنستر اٹھایا اسے آرمرڈ کار پر انڈھیلا اور دیا سلائی سے آگ لگا دی۔ اس طرح ہنگامہ شروع ہو گیا تو ڈپٹی کمشنر نے فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ رات گیارہ بجے تک گولی چلتی رہی اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ حکومت نے مارشل لاء لگا دیا۔

شہریوں نے اس جلوس کی قیادت، جس پر گولی چلائی گئی، آغا سید لعل بادشاہ بخاری کر رہے تھے۔ فائرنگ کے بعد شہر کے ہر قابل ذکر سیاسی رہنما کو گرفتار کر لیا گیا۔

جب اس واقعہ کی خبر اتمان زئی پہنچی تو خان عبدالغفار خان اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ عازم پشاور ہوئے۔ انھیں راستے ہی میں نحقی کے مقام پر گرفتار کر لیا گیا۔

اور چارسدہ میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے دفعہ ۴۰ سرحدی کے تحت ضمانتیں طلب کی گئیں، وہ تو ترک موالات کے حامی تھے۔ ضمانت کیسے دیتے؟ اس پر انھیں تین تین سال قید کی سزا سنادی گئی۔ دوسرے لوگوں کو تو رسالپور کے فوجی کیمپ میں قید کیا گیا لیکن خان عبدالغفار خان کو گجرات (پنجاب) کی سیاسی جیل میں بھیج دیا گیا جہاں کانگریس کے دوسرے رہنما پنڈت جواہرلال نہرو۔ مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پنڈت پنت وغیرہ پہلے سے موجود تھے۔

خان عبدالغفار خان کے گرفتار ہوتے ہی خدائی خدمتگار میدان میں نکل آئے۔ حکومت نے ان پر بے حد تشدد کیا۔ سرحدی عوام دبنے والے کہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے صوبے کے لوگ بھڑک اٹھے، ہر جگہ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چل نکلا۔ لونڈخوڑ ٹکرہ، ہاتھی خیل (بنوں) اور دوسرے کئی مقامات پر حالات پر قابو پانے کے لیے پولیس کو گولی چلانا پڑی، سارے صوبے کے عوام اور سرحدی قبائل حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے لگے اور یوں قصہ خوانی میں نہتے عوام پر گولی چلانے کا سانحہ بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن گیا۔

کچھ عرصہ بعد گاندھی اروِن سمجھوتہ کے تحت قیدیوں کو رہا کر دیا گیا لیکن خان عبدالغفار خان پر صوبہ سرحد میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جلاوطنی کے دوران خان عبدالغفار خان کو موہن داس کرم چند گاندھی کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع ملا تو وہ اُن کے نظریات سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ ہندو اخباروں نے خان عبدالغفار خان کو "سرحدی گاندھی" لکھنا شروع کر دیا۔

۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت صوبوں میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ جس کے نتیجے میں پہلے تو صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے وزارت بنائی۔ اس پر

مولانا ابوالکلام آزاد اور راجندر پرشاد کو سرحد بھیجا گیا جنھوں نے ہزارہ کے کچھ ارکان کو ساتھ ملا لیا۔ صاحبزادہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور ہونے پر ڈاکٹر خان صاحب صوبے کے وزیر اعلیٰ بنے تو خان عبدالغفار سے بھی تمام پابندیاں ختم کر دی گئیں۔

۱۹۴۲ء میں کانگرس نے برطانوی حکومت کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کی مہم شروع کی تو عبدالغفار خان کو پھر جیل جانا پڑا۔ بہت سے کانگرسی ارکان اسمبلی کی گرفتاری کے بعد سردار اورنگ زیب خان کی قیادت میں صوبے میں پہلی مسلم لیگ گورنمنٹ قائم ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد خان عبدالغفار خان پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے تو انھوں نے چند دوسرے ارکان کے ساتھ مل کر "پیپلز پارٹی" کے نام سے ایک اسمبلی پارٹی قائم کر لی۔

بعد میں "پختونستان" کا شوشہ چھوڑنے پر پھر انھیں نظر بند کر دیا گیا ——
۱۹۴۷ء سے اپنے سالِ وفات ۱۹۸۸ء تک انھوں نے کئی بار بھارت کا دورہ کیا۔ بھارتی حکومت نے انھیں اپنے ہاں کے اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ اس اثنا میں بارہا وہ افغانستان میں بھی مقیم رہے۔ طویل عالت کا زمانہ انھوں نے کچھ بمبئی (بھارت) میں اور کچھ لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں گزارا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۸۷ء کو انھوں نے وفات پائی تو بھارت، افغانستان اور پاکستان میں ہر جگہ ان کا قومی سوگ منایا گیا۔ جناح پارک پشاور میں ان کے جنازہ کا اجتماع تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ انھیں جلال آباد (افغانستان) میں دفن کیا گیا۔

خان عبدالغفار خان کا شمار ملک کے صف اوّل کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔
خان عبدالغفار کے تین صاحبزادے عبدالغنی خان، عبدالولی خان اور عبدالعلی خان

ہیں۔ خان عبدالغنی خان اعلیٰ پایہ کے شاعر، ادیب اور آرٹسٹ ہیں۔ متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں جبکہ عبدالولی خان اپنے نامور والد کے سیاسی جانشین اور نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ ہیں۔ خان عبدالعلی خان مشہور ماہر تعلیم ہیں اور پشاور اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ ان کی اکلوتی صاحبزادی سابق صوبائی وزیر یحییٰ جان خان کی رفیقۂ حیات ہیں۔

جب کبھی اور جہاں کہیں آزادیٔ وطن کی تحریکوں کا ذکر آئے گا۔ فخر افغان خان عبدالغفار کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

غازی آغا محمد

پشاور کے بارونق بازار قصہ خوانی میں دو خوبصورت یادگاریں ہیں جو ہمیں ان شہیدوں کی یاد دلاتی ہیں جنھوں نے آزادی وطن کی راہ میں ۲۳/اپریل ۱۹۳۰ء کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ان یادگاروں کے پاس ہی ایک چھوٹی سی دکان ہے جس کے مالک ہیں غازی آغا محمد۔ شکیل و وجیہہ انسان ہیں۔ چہرے بشرے سے وجاہت اور شرافت ٹپکتی ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی انھوں نے قرنِ اوّل کے مسلمان مجاہدوں کی یاد تازہ کر دی ہے اور شہیدان قصہ خوانی کا حق ہمسائیگی ادا کر دیا ہے۔

غازی آغا محمد اس سیاسی دور میں پیدا ہوئے جب اہلِ سرحد انگریز سے بھرے بیٹھے تھے۔ ہر نوجوان بے قرار تھا کہ جیسے بھی ہو فرنگی شاطروں کو ملک سے نکال باہر کرے۔ آغا محمد بھی روزانہ قصہ خوانی بازار سے گزرنے والے جلوسوں کو دیکھتے تو جہاد کا جذبہ ان کے دل میں انگرائیاں لینے لگتا۔ بڑے ہوئے تو خلافت کے جلوسوں میں شرکت ان کا معمول بن گئی ـــــ آٹھویں جماعت کے بعد تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اور وہ گھر سے نکل کر آزاد علاقہ مہمند میں سیدھے مجاہدِ اعظم حاجی صاحب ترنگزئی کے پاس حاضر ہوئے اور ان کے غازیوں میں شامل ہو گئے ـــــ والد نے کسی بہانے آغا محمد کو بلایا اور اپنے کسی عزیز کے ہاں راولپنڈی بھیج دیا۔ ۱۹۳۴ء میں آغا محمد واپس پشاور آئے اور کاروبار میں لگ گئے۔ مسلم لیگ کا چرچا ہوا تو وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز میں شامل ہو گئے اور خان فدا محمد خان، آغا خان بابا خان، عبدالرؤف سیماب

کی ہمراہی میں قومی خدمات انجام دینے لگے ۔ ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی تو مسلم لیگ کے رضاکاروں اور مسلمان نوجوانوں کو جدوجہد آزادی کی ایک نئی جہت مل گئی ۔ اس پر آغا محمد اور بھی زیادہ سرگرم عمل ہو گئے ۔ ۱۹۴۵ء میں قائدِ اعظم پشاور کے دورے پر آئے تو آغا محمد اور اس کے ساتھیوں نے ان کے استقبال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ مسلم لیگ کے جلسوں اور اجتماعات میں بھی وہ باقاعدگی سے شرکت کرتے ۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد کی کانگرسی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا آغاز ہوا تو آغا محمد کے جوش و خروش میں اور بھی اضافہ ہو گیا ۔ سرحد اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو مسلم لیگی کارکنوں نے اسمبلی ہال پر پکٹنگ کرنے کا پروگرام بنایا ۔ ایک جلوس ترتیب دیا گیا جس نے اسمبلی ہال کے سامنے ریلوے لائن پر مسافر گاڑی کو روکنے کا پروگرام بنایا ۔ رضاکار (جن میں آغا محمد بھی شامل تھے) ریل کی پٹڑی پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے ۔ اتنے میں کانگرسی وزراء ، ڈاکٹر خان صاحب اور مہر چند کھنہ ، اسمبلی سیشن سے فراغت کے بعد گیٹ سے باہر نکلتے دکھائی دیے ۔ سیماب صاحب اور کچھ دوسرے رضاکاروں نے انھیں دیکھ لیا ۔ وہ دوڑتے ہوئے وزراء کی طرف لپکے اور زور زور سے نعرے لگانے لگے ۔ "ہمارے ملک کو ہندو کے حوالے نہ کرو" "ہمارے ملک کو ہندو کے حوالے نہ کرو!" فوج نے رضاکاروں کو وزراء کی طرف لپکتے ہوئے دیکھ کر یہ سوچا کہ شاید رضاکار وزیروں پر حملہ کر رہے ہیں ۔ فوجی سپاہیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور رضاکاروں پر گولی چلا دی ، چھ گولیاں آغا محمد کی ٹانگ میں پیوست ہو گئیں ۔ جن میں سے تین تو نکال لی گئیں جبکہ باقی ماندہ تین کوئی آٹھ ماہ بعد نکالی جا سکیں ۔ اس طرح غازی آغا محمد عمر بھر کے لیے ایک ٹانگ سے محروم ہو گئے ۔ اب وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتے پھرتے ہیں ۔۔۔ اگرچہ ان کی عمر ڈھل چکی ہے لیکن حوصلہ اور عزم اسی طرح جوان ہے !

مولانا عُزیز گل کاکا خیل

برصغیر میں احیاء و تجدید دین کا سہرا تو حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے سر ہے تاہم اسلام کی عزت و وقار اور آزادئ وطن کے لیے خاک و خون میں تڑپنے کا سبق علمائے اسلام ہی نے دیا۔ دینی مدرسے وہ تربیت گاہیں تھیں جن سے نکلنے والے مخلص اور بے لوث جانبازوں نے مسلمانانِ ہند میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بڑا کام کیا۔

صوبۂ سرحد کے قبائلی علاقوں میں فرنگی حکومت کے خلاف اجتماعی جہاد کا سلسلہ بھی اخون صاحب سوات، ہڈہ ملّا صاحب، بابڑے ملا صاحب اور حاجی صاحب ترنگزئی ہی کی بدولت شروع ہوا۔ تحریک خلافت کے دنوں میں مجاہدین نے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔ تاہم کچھ تو انگریز کے پروپیگنڈہ کے زیر اثر اور کچھ قبائلی علاقے کے لوگوں کی سادگی کی وجہ سے اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا کہ انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ خلیفۃ المسلمین یا کسی اسلامی ملک کے حکمران کی طرف سے جاری ہونا چاہیے۔

افغانستان کے امیر حبیب اللہ بھی مجاہدین کی کھل کر حمایت کرنے کی بجائے انگریز کی خوشنودی کو ملحوظ رکھتے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حاجی صاحب ترنگزئی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو پیغام بھیجا کہ جیسے بھی ہو سلطان ترکیہ سے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ حاصل کیا جائے۔ اس پر مولانا محمود الحسن نے ترکی جانے کا ارادہ کیا تاہم مشہور

یہی کیا کہ وہ حجاز مقدس جا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری جائیداد بیچ دی۔ اور زادِ راہ کا سامان کیا۔ مولانا عزیر گل حضرت شیخ الہند کے نہایت وفادار شاگرد تھے۔ وہ ہر وقت سایہ کی طرح اپنے شیخ اور استاد کے ساتھ رہتے تھے۔ اس مہم میں بھی انھوں نے مولانا محمود الحسن کے پا برکاب رہنے کی سعادت حاصل کی۔

مولانا مدنی کتاب "نقش حیات" میں مولانا عزیر گلؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

مولانا عزیر گل قصبہ زیارت کاکا صاحبؒ ضلع پشاور کے باشندے اور دار العلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے خادم خاص ہیں، ابتداء ہی سے وہ سیاسی مشن میں ان کے ساتھ رہے اور نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کام انجام دیتے رہے، صوبہ سرحد اور یاغستان (قبائلی علاقہ) میں انھوں نے سفارت کی خدمات جلیلہ انجام دیں۔ شیخ الہند انھیں دُور دراز کے پہاڑی علاقوں میں اپنا قاصد بنا کر اپنے ہم نوا اور ہم خیال لوگوں کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ وہ دشوار گزار اور خطرناک راستے طے کر کے، فرنگی جاسوسوں سے بچتے بچاتے نہایت راز داری اور ہمت و استقلال سے یہ کام انجام دیتے۔ اکثر راتوں کو جنگلوں اور بیابانوں کا سفر کرتے۔ حاجی صاحب ترنگزئی اور صوبہ سرحد اور یاغستان کے علماء اور خوانین کو شیخ الہند کے جہاد مشن کا حامی اور کارکن بنانے میں انھوں نے بڑی محنت کی ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ بھی ان کا گہرا رابطہ تھا۔ وہ اکثر اوقات بھیس بدل کر سفر کرتے۔ اس راہ میں کسی خطرے کی پرواہ نہ کرتے۔ شیخ الہند کے تو وہ فدائی تھے۔ ہمیشہ عاشقانہ ولولوں کے ساتھ خدمت میں مصروف رہتے بلکہ ہر قسم کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے۔ جزیرہ مالٹا میں قید و بند کے دوران بھی انتہائی دل جمعی سے حق رفاقت نبھایا۔ کئی لوگ انھیں شک کی نظروں سے دیکھتے اور انھیں سی آئی ڈی کا آدمی سمجھتے لیکن وہ سب الزامات سے درگزر کرتے۔ خود شیخ الہند کو بھی ان پر اتنا اعتماد تھا کہ انھیں اپنے گھر کا ایک

فرد سمجھتے۔ انھیں ہر وقت ساتھ رکھنے اور کسی بدگمانی کو اپنے نزدیک نہ آنے دیتے۔ انھوں نے آخر دم تک انھیں ساتھ رکھا۔ وہ شیخ الہند کے خزانچی بھی تھے اور معتمد علیہ ساتھی بھی۔ وہ ہندوستان کے مخیر مسلمانوں سے ملنے والی رقوم اور سامان قبائلی مجاہدوں کو پہنچاتے تاکہ وہ دشمن کے خلاف جہاد جاری رکھ سکیں۔"

"حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد بھی عرصہ دراز تک ان کے مکان میں قیام پذیر رہے۔ مالٹا میں قید کے دوران ان کی اہلیہ محترمہ وفات پا گئی تھیں۔ اس پر حضرت شیخ الہند نے اپنی بھانجی ان کے نکاح میں دے دی جس سے ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں ۔۔۔ تحریک خلافت کے دوران وہ خلافت کمیٹی دیوبند کے صدر بھی رہے۔ بڑے متوکل انسان تھے۔ سوختنی لکڑی کا کاروبار کر کے اکل حلال حاصل کرتے۔ بعد میں مدرسہ رحمانیہ رڑکی کے صدر مدرس بھی رہے۔ اس اثناء میں ان کی دوسری اہلیہ بھی انتقال کر گئیں۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک معزز گھرانے کی انگریز خاتون نے اسلام قبول کیا تھا۔ مولانا اسے دین کی باتیں سمجھایا کرتے تھے، بعد میں مولانا عزیر گل کا نکاح اسی انگریز خاتون سے ہو گیا۔ وہ بھی اتنی ایثار پیشہ تھیں کہ انھوں نے ہر مشکل میں مولانا کا ساتھ دیا اور دل وجان سے ان کی خدمت کی۔"

آخری عمر میں مولانا عزیر گل اپنے بال بچوں اور اس تیسری اہلیہ کو لے کر وطن آ گئے اور سخاکوٹ (مالاکنڈ) میں جہاں ان کی تھوڑی سی زمین تھی، رہنے لگے۔ انگریز بیوی نے اکتوبر ۱۹۶۶ء میں وفات پائی۔ مولانا ابھی حیات ہیں اور لوگ ان سے فیض پا رہے ہیں۔

مولانا عزیر گل کی جاں نثاری اور سرفروشی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ہمراہ حج کی نیت سے مکے پہنچے تو برطانوی حکومت ان کے پیچھے لگ گئی۔ انھوں نے شریف مکہ کو مجبور کیا کہ وہ شیخ الہند اور ان کے ساتھیوں (مولانا عزیر گل اور

حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے ان کے حوالے کر دے۔ شریف مکہ انگریز کے آگے دم نہیں مار سکتا تھا۔ اس نے مکہ پولیس کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ مولانا اور حکیم صاحب مکّہ کے کسی کونے کھدرے کے ایک مکان میں روپوش ہو گئے لیکن نہ بچے۔ آخر پکڑے گئے۔ پولیس ان سے مولانا محمود الحسن کا پوچھتی تھی لیکن وہ ہرگز کچھ بتانے پر تیار نظر نہ آتے تھے۔ اس پر انھیں بڑی دھمکیاں اور اذیتیں دی گئیں۔

جیل پہنچے تو انھیں یقین تھا کہ پھانسی پر چڑھنا ہوگا۔ اس پر مولانا عزیر گلؒ اپنی گردن ناپتے اور دبایا کرتے تاکہ گلے میں رسّہ ڈالنے کی عادت ہو جائے اور پھانسی کے وقت یکبارگی تکلیف پیش نہ آئے۔

مکّہ سے گرفتار کرنے کے بعد مولانا محمود الحسن، مولانا عزیر گل اور حکیم نصرت حسین کو گورا سپاہیوں کی تحویل میں پہلے سویز بھیجا گیا۔ وہاں سے ریل کے ذریعے قاہرہ بھیجا گیا اور آخر کار انھیں خطرناک قیدی قرار دیتے ہوئے جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا گیا جہاں وہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ سے ۲ جمادی الاول ۱۳۳۸ھ تک تین سال دو ماہ اور تین دن قید رہے۔

مولانا عزیر گل کا گھرانا اپنی حریت پسندی اور علم دوستی کی وجہ سے بڑا قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ ان کے والد مولانا شہید گل بھی بلند پایہ عالم دین تھے اور ان کے بھائی مولانا عبدالحق نافع بھی بڑے نامور اور جیّد عالم اور قومی کارکن رہے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سیّد انور شاہ، شبیر احمد عثمانی اور مفتی کفایت اللہ ان کی بہت قدر کرتے تھے اور شیخ الہند تو انھیں اپنے ہی خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ ان کے لاڈلے نواسے مولوی محمد عثمان سے بھی آخر تک ان کا گہرا تعلق رہا۔

نومبر ۱۹۸۹ء میں وفات پائی۔